مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

سوانح — افکار — خدمات

مؤلّف

محمد عارف قاسمی جیسلمیری

Faisal International

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

سوانح - افکار - خدمات

مؤلف:

محمد عارف قاسمی جیسلمیری

ناشر:

ادارہ فیصل دیوبند

8439971786

﴿ کتاب کے جملہ حقوق بہ حق مؤلف محفوظ ہیں ﴾

تفصیلات

کتاب کا نام ---- مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی: سوانح - افکار - خدمات

مؤلف کا نام ---- محمد عارف قاسمی جیسلمیری

ناشر ----------- ادارہ فیصل دیوبند

کمپیوٹر کتابت سیٹنگ: (انیس الرحمٰن قاسمی) 9557252510

سن اشاعت ---- ۲۰۱۹ء

صفحات -------- ۳۸۴

قیمت --------- 350

○✣○

ملنے کے پتے:

محمد امین جیسلمیری، مسجد عمر فاروقؓ، پنجابی باغ ٹبہ روڈ لدھیانہ پنجاب

8557877671

ادارہ فیصل دیوبند

8439971786

انتساب

نانا مرحوم

حضرت مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومٹوی

کی بلند و الا شخصیت اور ان کی عظیم علمی و دینی خدمات

کے نام

فہرستِ مضامین

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
۹	**کتاب پڑھنے والوں کے نام**: حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	۱
۱۲	**حدیثِ دل**: حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	۲
۱۴	**مقدمہ**: حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب	۳
۲۱	**تقریظ**: حضرت مولانا سفیان صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند	۴
۲۳	**دعائیہ کلمات**: حضرت مولانا احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری صاحب	۵
۲۵	**پیش لفظ**: پروفیسر مولانا محسن عثمانی ندوی صاحب	۶
۳۰	**تقریظ**: حضرت مولانا محمد سالم صاحب جامعی (ایڈیٹر ہفت روزہ "الجمعیۃ" دہلی)	۷
۳۳	**ھدیۂ تبریک**: مولانا نصیر الدین قاسمی جودھپوری استاذ مدرسہ خادم الاسلام ہھاکری	۸
۳۷	**دل کی باتیں**: مفتی ارتقاء الحسن کاندھلوی (مفتیٔ اعظم پنجاب)	۹
۴۳	**عرضِ مؤلف**:	۱۰
۴۹	مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی بہ حیثیت مفتیٔ اعظم پنجاب	۱۱
۵۰	**تمہید**	۱۲

۱۳	مالیر کوٹلہ میں وردو	۵۳
۱۴	دارالافتاء مالیر کوٹلہ	۵۷
۱۵	مدرسہ تعمیر سیرت	۶۷
۱۶	مساجد کی آباد کاری میں مفتی اعظم کا کردار	۶۸
۱۷	دارالسلام اسلامی مرکز	۷۰
۱۸	تفسیر نور القرآن: ایک عظیم و مثالی خدمت	۷۳
۱۹	مدارس، مکاتب اور مساجد میں جاری دینی تعلیم سے متعلق آپ کا ایک	۸۰
	معرکۃ الآراء تخیل	//
۲۰	نانا مرحوم اور مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے باہمی روابط پر ایک نظر	۹۶
۲۱	میرے مخلص رفیق مولانا قاری محمد ہاشم خلیلی گومٹویؒ (تحریر مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی)	۱۰۴
۲۲	سید محبوب رضویؒ-و-مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ: کچھ یادیں کچھ باتیں	۱۰۹
۲۳	قادیانیت ورد قادیانیت آپ کی نظر میں	۱۱۴
۲۴	مفتی ہلال عثمانی مشاہیر کی نظر میں	۱۳۳
۲۵	کتابِ زندگی کے چند درخشاں ورق	۱۴۴
۲۶	بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسوم وکفریات کے خلاف کامیاب جہاد	۱۵۶
۲۷	اسلامی معاشرہ آج بھی عام انسانی معاشرے پر اثر انداز ہوسکتا ہے بشرطیکہ......	۱۷۵
۲۸	اسلام واہل اسلام کی جانب منسوب شکوک وشبہات کے ازالے میں	۱۸۳
	عصری جامعات کے مسلم اساتذہ کا کردار	//

۲۹	قومی وبین الاقوامی کانفرنسیں اور سیمینار، جن میں آپ شریک رہے	۱۹۶
۳۰	ماضی کے چند جرائد ورسائل جو آپ کی زیرِ ادارت شائع ہوئے	۲۰۴
۳۱	ہفت روزہ عقائد دیوبند	۲۰۵
۳۲	ماہنامہ مشرب دیوبند	۲۰۶
۳۳	ماہنامہ تعمیرِ سیرت مالیرکوٹلہ	۲۰۷
۳۴	ماہنامہ دارالسلام مالیرکوٹلہ	۲۰۸
۳۵	دارالعلوم دیوبند کے دس بارہ سالہ دورِ تدریس کی تنخواہ کی واپسی ایک	۲۱۰
	یادگاری اقدام	//
۳۶	ادارے اور تنظیمیں، جن کو آپ کی سربراہی یا رکنیت کا شرف حاصل ہوا	۲۱۲
۳۷	آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ	۲۱۳
۳۸	صدورِ بورڈ کے ساتھ آپ کے ذاتی روابط	۲۲۴
۳۹	صدر مفتی ورکن مجلسِ مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند	۲۳۶
۴۰	کل ہند مجلس مشاورت	۲۴۴
۴۱	آل انڈیا ملی کونسل	۲۵۲
۴۲	لوک عدالت سنگرور و مالیرکوٹلہ پنجاب	۲۵۶
۴۳	سرپرست ملی کونسل پنجاب	۲۵۸
۴۴	سرپرست عثمانی تحقیقی و تصنیفی ادارہ دیوبند	۲۵۹

۴۵	ممبر کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۶۰
۴۶	ممبر پنجاب یونیورسٹی	۲۶۱
۴۷	اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا	۲۶۲
۴۸	تصنیفات وتالیفات	۲۶۵
۴۹	معمولات ومشاغل	۳۱۷
۵۰	زمانۂ طالب علمی کے یادگاری واقعات اور عہدِ بچپن وجوانی کے آپ کے چند اہم معمولات	۳۱۸
۵۱	زمانۂ تدریس کے معمولات ومشاغل اور دارالعلوم دیوبند میں آپ کی مدرسی کا یادگاری واقعہ	۳۲۶
۵۲	کتب خانہ محمودیہ دیوبند	۳۳۴
۵۳	طلبا کی فکری تربیت کا انوکھا انداز ولائقِ تقلید طریقِ تدریس	۳۳۶
۵۴	قیامِ جامعہ اسلامیہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات و مشاغل اور اس دور سے منسوب کچھ حسین یادیں	۳۳۹
۵۵	دارالافتاء مالیر کوٹلہ اور آپ کے اوقاتِ کار	۳۴۳
۵۶	تصنیفی معمول اور تصنیفی میدان میں کامیابی کا راز	۳۴۵
۵۷	ارشادات وملفوظات	۳۴۹
۵۸	علم	۳۵۲

۵۹	ادب	۳۵۴
۶۰	لطافتِ طبع	۳۵۵
۶۱	سیاست	۳۵۶
۶۲	صفائیِ معاملات	۳۵۶
۶۳	معیشت	۳۵۷
۶۴	اولاد واحفاداور برادران و متعلقین	۳۵۹
۶۵	اجازت وخلافت	۳۷۷
۶۶	ایک یادگار خواب	۳۸۴

○❖○

کمپیوٹر کتابت سیٹنگ
انیس الرحمٰن قاسمی
9557252510
arqasmi1@gmail.com

کتاب پڑھنے والوں کے نام

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن صاحب ہلال عثمانی مدظلہم

مفتی اعظم دارالعلوم وقف دیوبند و سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

عالی مرتبت قارئین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ سب حضرات کے لیے خیر وعافیت کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے بعد عرض گزار ہوں کہ: اس کتاب کے مصنف عزیزِ محترم مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری فاضل دارالعلوم دیوبند سے چند سال پہلے تعارف ہوا۔ وہ تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ مالیر کوٹلہ شاہی جامع مسجد کے سابق امام وخطیب مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومٹوی ؒ کے نواسے ہیں اور فی الحال مسجد عمر فاروق ؓ پنجابی باغ ٹبہ روڈ نزد سمرالہ چوک لدھیانہ میں امام وخطیب اور اس میں قائم دینی مدرسے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا قاری محمد ہاشم صاحب ؒ سے میرا قریبی تعلق رہا ہے۔ وہ ایک لائق اور سنجیدہ عالمِ دین تھے، اکثر میرے پاس تشریف لاتے تھے اور بڑی محبت سے ملتے تھے۔

ریڈیو سے ان کی فارسی تقریر سن کر کشمیر کے سابق وزیر اعلی مرحوم شیخ محمد عبداللہ صاحب بڑے متاثر ہوئے اور خاموشی کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے جامع مسجد مالیر کوٹلہ میں تشریف لائے، وہ مولانا کو پہچانتے نہیں تھے۔ شیخ صاحب کی خاطر تواضع

کی اور بعد میں معلوم ہوا کہ تواضع کرنے والے صاحب وہی ہیں، جن سے ملاقات کے لیے شیخ صاحب آئے تھے۔اس تواضع اور سادگی سے شیخ صاحب اور زیادہ متاثر ہوئے، اپنے لیٹر پیڈ پر لکھ کر دیا کہ وہ جب بھی کشمیر آئیں، تو سرکاری مہمان کے طور پر ان کا استقبال کیا جائے گا اور اگر ان کو کوئی ضرورت پیش آئے، تو میں ان کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ نے اس تحریر سے کبھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ شیخ صاحبؒ کے آنے کا کسی سے ذکر کیا۔یہ مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ کے کردار کی بلندی اور ان کے ظرف کی وسعت تھی۔وہ بندۂ درویش خاموشی کے ساتھ جامع مسجد میں خدمت انجام دیتا رہا اور ایک دن اپنے مالک سے جاملا۔

مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری صاحب نے مجھے اپنے نانا کی ایک تصنیف کا مسودہ دکھایا، وہ بڑی اہم اور کام کی چیز ہے، کبھی موقع ہوگا تو ان شاء اللہ چھپ جائے گی۔

مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری صاحب نے چند نشستوں میں مجھ سے کچھ سوالات کیے، میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ یہ سوالات کس ارادے سے کر رہے ہیں۔کچھ دنوں کے بعد انہوں نے ان سوالات وجوابات کو ایک مضمون کی شکل میں مجھے سنایا، تو میں ان کے اندازِ نگارش اور اسلوبِ بیان سے بڑا حیرت زدہ ہوا، مجھے امید نہیں تھی کہ مدرسے کا ماضی قریب کا ایک فارغ پختہ انشاء نگار بھی ہوسکتا ہے۔معلوم ہوا کہ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کو مضمون نگاری کا شوق رہا ہے اور وہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فاضل پوتے مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب استاذ دارالعلوم وقف دیوبند سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔

وہ اکثر آتے تھے، سوال کرتے تھے، کبھی موبائل پر کوئی گفتگو ہو جاتی تھی، اس طرح ایک لمبی بات چیت مختلف نشستوں میں ان سے ہوتی رہی، یہ کہیے کہ ایک طویل

انٹرویو وہ مجھ سے لینے میں کامیاب ہو گئے۔

اپنی علالت اور کمزوری کے باوجود آں عزیز کے ساتھ میرا معاملہ نہایت مشفقانہ اور مخلصانہ رہا؛ کیوں کہ وہ ایک ایسے شخص کے نواسے ہیں، جن کو میں بہت پسند کرتا تھا اور ان کے جانے کے بعد یاد کرتا ہوں۔

مفتی صاحب نے جو سوالات کیے، وہ دراصل متعدد ملی، رفاہی و دینی تنظیموں اور عصری و مذہبی جامعات کو کھنگالتے ہوئے ان کا جائزہ ہے، ان کے نشیب و فراز، ان کی تاریخ، ان کے قیام کا پسِ منظر اور وہ بہت سی باتیں جو میرے سینے میں محفوظ تھیں سفینے پر آ گئی ہیں۔ مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری صاحب ایک ذہین اور لائق عالمِ دین ہیں۔ یہ کہیے کہ انہوں نے ملت کی ساٹھ ستر سال کی تاریخ ان سوالات کے ذریعے مرتب کر دی ہے اور اس طرح یہ کتاب ایک شخص کی سوانحِ حیات نہ ہو کر ایسی کتاب ہو گئی ہے جس میں تاریخ بھی ہے، ملت کے افکار کا آئینہ بھی ہے اور آنے والے دور کے لیے عبرت کا سامان بھی ہے۔

میرے بیٹے طارق عمیر نے بھی اس کتاب میں مفتی صاحب کے ساتھ مل کر خدمت کی ہے۔

اللہ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے اور میرا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

(مفتیٔ اعظم دارالعلوم وقف دیوبند)

۳؍صفر المظفر ۱۴۴۰ ہجری = ۱۳؍۱۰ اکتوبر ۲۰۱۸ عیسوی

بروز ہفتہ، بعد نماز مغرب

(Mufti) Abul Qasim Nomani
Mohtamim (VC) Darul Uloom Deoband
(مفتی) ابوالقاسم نعمانی
مہتمم دار العلوم دیوبند، الہند
PIN- 247554 (U.P.) INDIA Tel 01336-222768 E-mail info@darululoom-deoband.com

Ref. .... Date. ....

حدیثِ دل

نمونۂ اسلاف حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم

استاذِ حدیث و مہتمم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

جناب مولانا مفتی فضیل الرحمٰن صاحب ہلال عثمانی زیدمجدہم سے راقم کا تعارف زمانۂ طالب علمی ہی سے ہے، جب موصوف دارالعلوم میں مدرس تھے، جانبین سے محبت واحترام کا سلسلہ چلتا رہا، کبھی کبھار کسی نحوی یا صرفی مسئلہ پر گفت وشنید کی نوبت بھی آئی۔

بندہ فارغ ہوکر وطن چلا گیا اور مفتی صاحب نے اپنی علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے وسیع میدان تلاش کرلیا، تصنیف وتالیف اور انشاء وتحریر کی جولانگاہ میں مسلسل مصروف تگ وتاز رہے، مالیرکوٹلہ کے باوقار عہدۂ افتاء پر بھی فائز رہے، اس درمیان جب بھی ملاقات ہوئی قدیم شناسائی کی چمک آنکھوں میں جاگ اٹھی اور مولانا کی طرف سے محبت اور اعزاز کا معاملہ ہوتا رہا۔

اب جب کہ ہم دونوں عمر کے آخری پڑاؤ پر ہیں مفتی صاحب اپنے پیچھے افکار وخدمات کا ایک وسیع سلسلہ لےکر اب بھی مصروف سفر ہیں۔

مفتی صاحب کو خاندانی عظمت ووقار حاصل ہے وہ ان کی کلاہ افتخار کا روشن ستارہ ضرور ہے، لیکن ان شخصیت کی تکمیل ان کے علمی کارناموں اور جہد مسلسل کی رہین منت ہے۔

جناب مولانا محمد عارف قاسمی جیسلمیری بعد نماز عشا جناب مولانا مفتی فضیل الرحمٰن صاحب ہلال عثمانی کی سوانح عمری کا مکمل مسودہ لے کر بندہ کی نشست گاہ میں تشریف لائے اور اس پر کچھ تحریر کرنے کی فرمائش کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ مسودہ فائنل ہو چکا ہے اور کل صبح ہی واپسی بھی طے ہے، ظاہر ہے کہ اتنے قلیل وقفہ میں پورے مسودہ پر سرسری نگاہ ڈالنا بھی ناممکن تھا، پھر بھی تعمیلِ حکم کے طور پر یہ چند سطریں حاضر ہیں۔

امید ہے کہ پیشِ نظر سوانح عمری مفتی صاحب کی ہمہ جہت خدمات اور حصول یابیوں کے تعارف کے لیے بہترین رہ نما ثابت ہوگی۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ
مہتم دارالعلوم دیوبند
۱۲/۷/۱۴۴۰ھ = ۲۰/۳/۲۰۱۹ء

○❖○

مقدمہ

حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

دارالعلوم دیوبند اپنی شہرتوں اور عظمتوں کے اعتبار سے نہ یہاں غیر متعارف ہے اور نہ وہاں۔ یعنی ہندوستان کے لوگ بھی اُس سے آگاہ ہیں اور دنیا بھر میں بسنے والے انسان بھی اُس سے واقف ہیں۔ دارالعلوم کہ جس کا آغاز ایک استاذ اور ایک شاگرد کے ذریعہ ہوا اس کے بارے میں کون یہ گمان کرسکتا تھا کہ وہ ایک عظیم علمی ادارے کی صورت میں اپنی روشنی سے علم کے پیاسوں کے قلوب کو روشن ومنور کرے گا۔ یہ ہوا اور خوب ہوا۔ ایک سو پچاس سال کی اُس کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اکابرِ دارالعلوم نے صفحۂ عالم پر اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ماہ وسال کی گردشوں اور صبح وشام کی آمد ورفت نے اس کی چمک ماند نہیں کی ہے اور نہ اس کی تاریخ کو دھندلا کیا ہے۔ وہ اول دن سے روشن اور پہلے دن سے اُجلی اور نکھری ہوئی ہے۔ علم وفضل کے وہ کوہ وستون اس درسگاہِ علمی کی دین ہیں جن پر صدیوں کی علمی تاریخ کی عمارت قائم ہے، یہ عمارت نہ صرف ڈیڑھ سو سال کی بلکہ پچھلی کئی صدیوں کی علمی تاریخ کی یاد دلاتی ہے۔ سرزمین دیوبند اس اعتبار سے خوش نصیب ہے کہ اللہ نے اس کے سینے پر علوم نبوی کا ایک ایسا چشمہ جاری فرمایا جس نے لاکھوں علمی پیاسوں کی پیاس بجھائی، ہزاروں گھروں میں دین پہنچایا اور بے شمار

انسانوں کو رسوم و بدعات سے نکال کر صحیح فکر اور صحیح عقائد سے روشناس کیا۔ یہاں کا جو بھی فرزند جس بستی اور جس جگہ پہنچا اُس نے دارالعلوم کی امتیازی شان کو باقی رکھا، خدمات انجام دیں اور اُس سلسلۂ زریں کو ٹوٹنے نہ دیا، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ذریعے منجانب اللہ وجود میں آیا تھا۔ بانی کی عمر تو صرف ۴۹ سال ہوئی مگر ان کے اخلاصِ نیت اور اخلاصِ فکر کے سوتے خشک نہیں ہوئے، اُسی اخلاص کو اللہ نے ہر آنے والے کے دل میں اس طرح پیوست فرمایا کہ دنیا ان کی نظروں میں حقیر ہی رہی، کبھی قریب نہ پھٹکی اور نہ انہوں نے دنیا کو سینے سے لگایا۔ وہ خانوادے جنہیں اللہ نے دارالعلوم سے وابستگی اور تعلق کے بعد سربلندیوں سے نوازا اور جن افراد کے سر پر مقبولیت اور شہرت کا زریں تاج رکھا ان میں ایک خاندان بلکہ ممتاز خاندان عثمانی خاندان بھی ہے، جس میں اللہ نے وہ لعل و گوہر اور آفتاب و ماہتاب پیدا کیے جن کا نام آسمان پر درج ہے اور انشاء اللہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی علیہ الرحمہ ان افراد میں شامل ہیں جو دارالعلوم کی خشتِ اول کے موقع پر موجود تھے، ان ہی کے فرزند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی علیہ الرحمہ ہیں جنھوں نے نصف صدی کے لگ بھگ دارالعلوم کے مسند افتاء کو رونق بخشی۔ فتاویٰ دارالعلوم کی جلدیں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ کے علم و تفقہ، درک و مہارت، دینی فہم اور وسعتِ علمی کی گواہ ہیں۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے اول مفتی اور خانوادۂ عثمانی کے بلند پایہ لوگوں میں سے تھے۔ یہ خاندان اپنی علمی جلوہ نمائیوں اور رہنمائیوں کی بنیاد پر کبھی بھی دور نہیں ہوا۔ اللہ نے اس گھرانے میں ہر دور میں وہ انسان پیدا فرمائے جو سرمایۂ افتخار اور سرمایۂ تاریخ ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اسی گھرانے کے وہ فردِ فرید ہیں جن پر علمی دنیا فخر کرتی ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے جن تلامذہ

نے علم کے پھریرے اڑائے اور جن کی علمی رفعتوں کا زمانہ معترف ہوا ان میں اُن کے تلمیذ رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ کا نام نمایاں ہے۔ تحریر، تقریر، تدریس، علم، فضل، کمال تمام شعبوں میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے نقوشِ زندگی سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی ذات میں اللہ نے کمالاتِ فضل الرحمٰن اور امتیازاتِ عزیز الرحمٰن کو سمو دیا تھا۔ حدیث پر حضرت شیخ الاسلام کا کام انتہائی وقیع اور امتیازی ہے۔

اسی خاندان کے ایک فرد مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ہیں جو دار العلوم کے دورِ آخر کے برگزیدہ لوگوں میں شامل ہیں، اُن کو اللہ نے اپنے آبا و اجداد کی امتیازی خصوصیات اور کمالات سے نوازا تھا۔ علم کی ایک ایسی جوئے رواں کہ جو زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہی، تدبر، تفکر، سوجھ بوجھ اور سیاسی نشیب و فراز کا ایسا درک اور ایسا علم کہ جو کم سننے اور دیکھنے میں آیا ہے، مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حلم اور تدبر کی جس دولتِ عظمیٰ سے نوازا تھا وہ کم لوگوں کا حصہ بنتی ہے۔ وہ اپنے معاصرین میں جس بلند حیثیت کے مالک تھے اس کی تمنا اُن کے ہر معاصر نے کی۔ دارالمصنفین کا قیام حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی نظیر جماعت دیوبند میں کوئی دوسری نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے اس ادارے سے کتنی معرکۃ الآراء علمی، دینی، تحقیقی، تاریخی کتابیں شائع کیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ انہوں نے اتنے اصحابِ قلم اور اصحابِ علم و فکر اپنے گرد جمع فرما لیے تھے کہ اس وقت کا کوئی نامور صاحب قلم ان کی نگاہوں سے چھپ نہ سکا سب کو انہوں نے دارالمصنفین کا حصہ بنا لیا، یہ بڑی کامیاب کوشش تھی اور بڑا اقدام تھا۔ ان کا ادارہ پچاس سال تک اکابر دیوبند کی علمی رفعتوں اور تحقیقی عظمتوں کا گواہ بنا رہا۔

اسی خانوادے کے ایک موجودہ فرد حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

ہیں جن کا وجود نہ صرف اس خاندان کے لیے بلکہ موجودہ علماء دیوبند کے لیے ایک نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے پڑدادا مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ، دادا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ وغیرہ کی علمی فتوحات کو زندہ اور باقی رکھنے میں مولانا مدظلہٗ کی ذات کا بڑا دخل ہے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل، سابق میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ فارسی کے مدرّس اور قریبی زمانے میں مفتیٔ اعظم پنجاب کے منصب پر فائز رہے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانیں اُن کے لیے مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ دیوبند میں ان کے نامور اساتذہ میں حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ، حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اللہ نے استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کو تدریس کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بیان کی صلاحیتوں اور دنیائے قلم کی حکمرانی سے نوازا ہے۔ اُن کی تحریر اتنی خوبصورت، اتنی دل کش، اتنی شیریں، اتنی مکمل، اتنی دل پذیر کہ ہر جملہ ان کی وسعتِ علمی، وسعتِ ذہنی، مطالعہ اور مشاہدہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایسا اسلوب جو کم ہی لوگوں کا ہے، بیان کی ایسی تاثیر اور زبان کی ایسی دل کشی کہ پڑھنے والا کھو کر رہ جائے، معلومات بھی حاصل ہوں، علم کے مختلف گوشے بھی ابھر کر سامنے آئیں اور زبان و بیان کے سلیقے سے بھی شناسائی ہو۔ تقریر و خطابت میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کا مکمل احساس دلایا ہے۔ جہاں کہیں بھی اور جس جگہ بھی وہ محوِ خطابت ہوتے ہیں تو سننے والے یہ احساس لے کر اٹھتے ہیں کہ جو کچھ آج انہوں نے پایا اسے بھلایا نہیں جاسکتا، یہ بڑی بات ہے کہ خطیب سامعین پر ایک ایسا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہو کہ جس کے سحر سے وہ نکل نہ سکیں اور جو معلومات انہیں حاصل ہوں وہ زندہ اور باقی رہیں۔

۱۹۷۳ء میں وہ دارالعلوم دیو بند کے شعبۂ فارسی میں مدرس تھے اور میں نے اُسی سال حضرت مولانا سے فارسی کی اہم کتاب ''انوار سہیلی'' پڑھی تھی، اسی سال کے درمیان یا آخر میں وہ پنجاب تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے اُن کے علمی اور فقہی سفر کے ایک اور دور کا آغاز ہوا۔ یہ دور بھی پہلے دور کی طرح انتہائی کامیاب اور قابلِ ذکر رہا۔ تیس سال سے زائد انہوں نے منصبِ افتاء کو رونق بخشی، اس درمیان میں اُن کے قلم سے ہزاروں فتاویٰ نکلے اور ساٹھ سے زائد کتابیں مختلف عنوانات اور موضوعات پر لکھ کر انہوں نے اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ وہ جماعتِ دیو بند کے ایک ایسے فرزند ہیں جس کی ذات میں رب کائنات نے اکابر کی کچھ اداؤں کو اس طرح سمو دیا ہے کہ اُن کے ذکر کے بغیر دارالعلوم دیو بند کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ جس خاندان میں حضرت مفتی صاحب نے آنکھیں کھولیں اس کے بڑوں کا تو ہم تذکرہ کر چکے لیکن چند چھوٹے ہیں کہ جن کے بارے میں لکھے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

حضرت مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ جو ۲۰۰۶ء میں اس دنیا سے تشریف لے گئے، انہیں بھی اللہ نے بے پناہ علمی صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ ان کے قلم سے عربی، فارسی کی کافی کتابوں کی شروحات نکلیں، کئی کتابیں انہوں نے تحریر فرمائیں، مقالات ومضامین لکھے اور شاعری میں بھی ان کا چراغ تادیر جلا۔ بہت اچھا شعر کہتے تھے، شاعری کے نشیب وفراز پر ان کی گہری نظر تھی، تصور وخیال کی دولت سے بھی محروم نہیں تھے، ان کا مجموعۂ کلام ''شناسا'' کے نام سے منظر عام پر آیا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مفتی صاحب بڑے خلیق اور نیک طبیعت تھے۔ یکسو اور عزلت پسند، خدا نے شاعری کا ایسا ملکہ دیا تھا کہ نہ رخصتی میں عاجز تھے، نہ سہرے میں، نہ نعت اور نظم میں، غزل اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی انہوں نے خوب نام کمایا۔ یہ شریف الطبع انسان اچانک ہی اس دنیا سے ناطہ توڑ کر اپنے حقیقی خالق کی بارگاہ میں حاضر ہوگیا۔

مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کے ایک اور بھائی مولانا دلیل الرحمٰن انجم عثمانی اردو کے اُن بلند پایہ قلم کاروں میں ہیں جنھوں نے افسانوں کی دنیا سے تعلق قائم کیا، آج ان کا شمار سرکردہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعے ''شب آشنا''، ''ٹھہرے ہوئے لوگ'' وغیرہ اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ آج اردو کے جو افسانہ نگار موجود ہیں ان میں انجم عثمانی کا مقام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ۱۹۳۹ء میں اس دنیا میں تشریف لائے اور اسّی سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کا واقعی اور حقیقی تقاضا یہ تھا کہ ان پر کام ہو، پھر جس محنت اور جد وجہد کی انہوں نے زندگی گزاری اس کو سامنے لانے کے لیے کسی ایسے صاحبِ قلم کی ضرورت تھی جو کماحقہٗ اس کا حق ادا کر سکے۔ مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کی شخصیت پر لکھنے کے لیے اور ان کے سوانحی نقوش کو صفحۂ قرطاس پر خوبصورتی کے ساتھ پھیلانے اور درج کرنے کے لیے جس نوجوان کو اللہ رب العزت نے منتخب فرمایا وہ خود بھی نیک طبع ہیں اور قلم پر ان کی گرفت اچھی خاصی ہے۔ وہ لکھتے ہیں تو اطراف وجوانب پر اُن کی نظر رہتی ہے۔ مولانا مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری صاحب اس کتاب کو ترتیب دینے والے ہیں، انہوں نے یہ سب کچھ لکھا اور جو معلومات مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی سے انہیں حاصل ہوتی رہیں ان کو بڑے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ سپردِ قرطاس کیا ہے۔ یہ بات بھی وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اللہ نے فکر وشعور دیا ہو اور قلمی صلاحیتیں جس کے ہم عناں ہوں۔ آپ کتاب پڑھیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ کتاب کسی نوجوان قلم کار کے قلم کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی پختہ کار صاحب قلم کی کوشش کا نمونہ ہے۔ انہوں نے خوبصورت اور دل آویز انداز میں یہ کام انجام دیا ہے۔ ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ اس

میں روانی ہے، چابک دستی ہے، جماؤ ہے، دل کشی اور حسن ہے۔ سوانحی باب میں اس کتاب کو میں ایک قابلِ قدر اضافے کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

اللہ رب العزت عزیز مکرم جناب مولانا مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری کی اس محنت کو قبولیت کی اُس منزل سے گزارے جس کی تمنا ہر کوئی کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے کہ ان کے وجود سے دیوبندیت کے آنگن میں اجالا اور اُس کی دہلیز پر ایک چراغ روشن ہے۔ دعا ہے کہ یہ چراغ روشن رہے اس لیے کہ دیوبند کو اس کی ضرورت ہے۔

نسیم اختر شاہ قیصر
۲۷ر جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ

○❖○

DARUL - ULOOM WAQF DEOBAND -247554 (U.P.) INDIA

……﴿تقریظ﴾……

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی

استاذِ حدیث و مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند

دیوبند عملی اور فکری دائروں میں جس منظم اوراحسن طریقے پر اپنی موجودگی درج کراتا رہاہے اس کے بنیادی اسباب پر غور کرنے کے بعد جو بات سامنے آتی ہے، وہ ہمارے بزرگوں کے اخلاص وللّٰہیت کی روشن تاریخ سے تعلق رکھتی ہے؛ چناں چہ اسلاف کی زندگی کا ہر رُخ دیوبند کی عظمتوں اوراس کے تاریخی عروج کا عنوان ہے، دیوبند کے شہرۂ آفاق علماء، نامور فضلاء اور عالمگیر شہرتوں کے مالک اصحابِ کمال کے کارہائے نمایاں نے پچھلی کئی صدیوں کی علمی تاریخ کو جلا بخشی ہے، یہ صورت حال ڈیڑھ صدی زائد سے بنی ہوئی ہے اوراس ڈیڑھ صدی کا کوئی بھی سال ممتاز افراد واشخاص سے خالی نہیں رہا، ابتداء سے لے کر ہمارے زمانے تک آتے آتے اللہ نے ان علماء ربانیین کا اس سرزمین کو مرکز بنایا جن کے نام لکھنے پر ہی اکتفاء کیا جائے تو یہ کام بھی آسانی کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔

اس دور کے ممتاز عالمِ دین، صاحبِ اسلوب قلم کار، صاحبِ فکر ونظر مقرر اور دیدہ ور انسان محترم جناب حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب ہیں

جنھوں نے عثمانی خاندان کی پچھلی علمی تاریخ کو نہ صرف زندہ کیا؛ بلکہ اس قافلے کے سر برآوردہ افراد کے اختصاصات و امتیازات کو بھی نئے اور روشن معانی و مفاہیم سے روشناس کرایا، دیوبند میں عثمانی خاندان کی علمی، دینی، اصلاحی وغیرہ خدمات کا جائزہ اگر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کتنے جبالِ علم تھے جن کی سربراہی سے عالم فیض یاب ہوا اور کتنے ماہ و پروین تھے جن کی چمک اس خاندان کی پہچان اور شناخت تھی، اسی خانوادے میں محترم مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب بھی ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنے خاندان کا نام آگے بڑھایا؛ بلکہ دیوبند کے اعتبار کو بھی باقی رکھا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کا نمونہ بھی پیش کیا۔

ازحد مسرت ہے کہ مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری راجستھانی نے مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کے سوانحی نقوش کو اس کتاب میں اُبھارا اور خوبی کے ساتھ اس کام سے عہدہ برآ ہوئے، انھوں نے محنت کی ہے اور ان کی محنت کا ثبوت یہ کتاب ہے جو آپ کو مطالعہ کی دعوت دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبولیت کی منزلوں سے گزارے۔

والسلام

محمد سفیان قاسمی

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

۲؍رجب المرجب ۱۴۴۰ھ

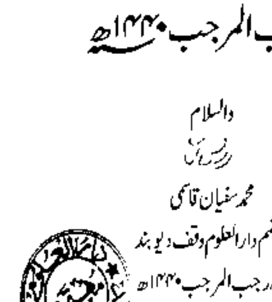

دعائیہ کلمات

حضرت مولانا احمد خضر شاہ صاحب مسعودی کشمیری

شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند و مہتمم جامعۃ الامام محمد انور دیوبند

دیوبند ایک قدیم بستی ہے؛ مگر اس بستی کو شہرت، مقبولیت اور مرجعیت دار العلوم کے قیام کے بعد حاصل ہوئی، دیوبند کے لیے دار العلوم خوش بختی اور سعادت کا ایسا جامع، مکمل اور خوبصورت عنوان بنا کہ پچھلے ایک سو پچاس سال اس بستی کی تاریخ کے روشن اور تابناک سال ہیں۔

کچھ خانوادے اس بستی میں ایسے رہے کہ جن کو اللہ نے علم، کمال، تہذیب، شرافت اور زندہ روایتوں سے سرفراز کیا اور جب دار العلوم کا قیام عمل میں آ گیا تو ان خانوادوں کے سروں پر عظمت کا تاج بھی رکھا؛ چناں چہ یہاں کے آفاقی شہرتوں کے مالک افراد و اشخاص اور نامور ہستیوں کی فہرست اگر ترتیب دی جائے تو کافی صفحات درکار ہوں، خانوادۂ عثمانی بھی ان خانوادوں میں سے ہے جن کی خدمات جلیلہ اور زریں کارناموں کا زمانہ معترف ہے، کتنے بلند و بالا لوگ اس خانوادے میں پیدا ہوئے اور کتنی نامور شخصیتیں وجود میں آئیں ان سب کا تذکرہ تو اس وقت مقصود نہیں؛ مگر اس خانوادے کی ایک ممتاز ہستی جو دورِ حاضر کی مشہور ہستیوں میں سے ایک ہے یعنی حضرت مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کے تذکرہ اور سوانحی نقوش کا مرقع یہ کتاب ہے، مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری (راجستھانی) نے حضرت محترم کی زندگی کے

مختلف گوشوں اور سوانحی آثار کو کمال خوبی کے ساتھ ضبط کیا ہے، مفتی صاحب کی حیات کے تقریباً تمام ہی گوشے خوبصورت لب ولہجہ میں سامنے آگئے ہیں، مفتی صاحب بلاشبہ اپنے کاموں اور کارناموں کی بنا پر حلقۂ دیوبند کے نامی گرامی افراد میں سے ہیں، یہ ان کا حق تھا کہ ان کا مبسوط تذکرہ مرتب ہوکر اہل تعلق تک پہنچے، یہ کام اللہ نے مولانا محمد عارف قاسمی جیسلمیری صاحب کی قسمت میں لکھا تھا، اللہ ان کو جزائے خیر دے اور مفتی صاحب مدظلہٗ کو صحت وعافیت سے رکھے۔

احمد خضر کشمیری

۱۸؍مارچ ۲۰۱۹ء بہ مطابق ۹؍رجب المرجب ۱۴۴۰ھ

○❖○

پیش لفظ

پروفیسر مولانا محسن عثمانی ندوی

رکنِ شوریٰ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ہندوستان کے ممتاز علماء میں ہیں، دیوبند آپ کا وطن مالوف ہے، ان کے دادا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی فتاوی دار العلوم کے مرتب ہیں، ان کے نام اور کام سے تمام اہل علم واقف ہیں وہ ۱۹۷۳ کو مفتیٔ اعظم کی حیثیت سے مالیر کوٹلہ پنجاب منتقل ہوئے اور وہاں انہوں نے علمی اور تصنیفی کاموں کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومٹویؒ جو وہاں جامع مسجد کے امام تھے، وہ ان کے رفیق تھے۔ مولانا مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھے اور ان ہی کے ذریعہ روحانی تربیت کے مراحل انہوں نے طے کئے تھے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ان کے اساتذہ میں تھے۔ مولانا ازہر شاہ قیصر اور سید محبوب رضوی ان کے بزرگ حلقۂ احباب میں شامل تھے اور ان ہی لوگوں کے ساتھ قلم وقرطاس کا محاذ سنبھالنے کی عادت پڑی۔ تصنیف وتالیف کے میخانہ میں قدم رکھنے کا کام بھی کار ریختہ کاراں ہے، پیمانہ اور صراحی اٹھاتے اٹھاتے اور ساقی کی دل داری کرتے کرتے یہ کام آتا ہے۔ اب تصنیف وتالیف تو بڑی چیز ہے اب جامعات کے اساتذہ پڑھتے بھی نہیں ہیں وہ خط کتاب کے نیچے اس طرح زندگی گزارتے ہیں جس طرح ہمارے ملک کی اکثریت خط غربت سے نیچے زندگی گزارتی ہے۔

مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے مالیر کوٹلہ پنجاب میں قائدانہ اور رہبرانہ

زندگی گزاری، اسی کے ساتھ ایک بہترین صاحب قلم عالم دین کا کردار ادا کیا،ان دونوں صفتوں کے لیے خام مواد علم اور شعور ہے،جس طرح سائنس کی لیبارٹری میں سائنس کے طلبہ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں محلول اور فلاں پاوڈر کے باہمی تفاعل سے آگ لگ سکتی ہے یا کوئی دھماکہ ہوسکتا ہے،اسی طرح سے علم کی لیبارٹری میں یہ بات بتائی جاسکتی ہے کہ ایک قائد یا ایک صاحبِ قلم کیسے پیدا ہوسکتا ہے یا ہوتا ہے۔یہ بات جان لینے کی ہے کہ اصل چیز علم اور شعور ہے۔ اس علم اور شعور کا تفاعل (انٹر ایکشن)جب ایکشن (حرکت عمل) سے ہوتا ہے،تو قیادت وجود میں آتی ہے اور انسان رہبرانہ و مصلحانہ کردار ادا کرتا ہے اور جب اس علم اور شعور کا تفاعل ایموشن (جذبہ) سے ہوتا ہے،تو ادب وجود میں آتا ہے اور انسان صاحب قلم ادیب،شاعر، افسانہ نگار،ناول نویس،فنکار،آرٹسٹ بنتا ہے۔قیادت اور آرٹ یا ادب کی کیمسٹری یہی ہے۔بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو لیڈر بھی ہوتے ہیں اور ادیب بھی ہوتے ہیں،اللہ تعالی نے مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی کو دونوں صفتیں عطا کی تھیں۔مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری نے اس کتاب میں ان کے دونوں کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا فضیل الرحمٰن دیوبند کے عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی،مولانا شبیر احمد عثمانی،مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی،شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانی،مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی،مولانا عامر عثمانی اور بے شمار اہل علم و فضل کی کہکشاں ہے جو دیوبند میں موجود تھی۔مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی کا تعلق اسی دودمان عالی سے ہے،جو چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھا۔میں نے درخواست کی تھی کہ کتاب میں نسب نامہ بھی شامل کردیا جائے۔نام و نسب پر فخر کرنا کوئی اچھی بات نہیں اور یہ منع ہے؛لیکن اسی کے ساتھ یہ شرف بھی ہے اور شرف کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ہندوستان میں عثمانی خاندان کے بزرگ محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ آئے

تھے، فتوحات کے سیل رواں کے موقع پر علماء کو بھی فوج میں شامل رکھا جاتا تھا اور فتوحات کے بعد ان کو مفتوحہ علاقوں کا دینی منصب بردار اور قاضی بنایا جاتا تھا۔عربی النسل خاندان کے لوگ جہاں گئے، انہوں نے آپس میں شادیاں کیں اور اپنے نسب کی حفاظت کی۔ پانی پت جب فتح ہوا، تو عثمانی خاندان کے جد اعلی کو قاضی بنایا گیا چنانچہ پانی پت کے عثمانی خاندان کے بہت سے لوگ اپنے نام کے ساتھ ''قاضی'' کا لاحقہ استعمال کرتے رہے، ماضی میں پانی پت کے عثمانی خاندان کی اہم شخصیت جلال الدین کبیر الاولیاء عثمانی کی تھی جو صابری چشتی سلسلہ کے بہت بڑے بزرگ تھے، اسی خاندان میں دوپشت کے بعد حضرت شرف الدین یحیٰ منیری سے ملاقات واکتساب کے لیے بہار گئے تھے لیکن جب بہار پہنچے، تو حضرت منیری کا انتقال ہو چکا تھا لیکن تعلیم واستفادہ کے لیے پانی پت سے آنے والے عثمانی خاندان کے لوگون نے وہیں خانقاہ میں قیام کیا، اس طرح سے عثمانی خاندان کی ایک شاخ بہار پہنچی۔ پانی پت میں مولانا لقاء اللہ عثمانی کی خانقاہ میں وہ طومار موجود تھا جس میں عثمانیوں کا پورا شجرۂ نسب موجود ہے تقسیم کے بعد یہ طومار مولانا لقاء اللہ عثمانی کے انتقال کے بعد پاکستان سرگودھا اور کراچی پہنچ گیا اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے ذمہ دار حضرات جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی عثمانی کے خاندان سے ہیں اور پانی پت سے ان کا خاندانی تعلق ہے، اس طومار کی نقل پاکستان سے مکہ مکرمہ لے آئے، برصغیر کے عثمانی خاندان کی یہ سب سے مستند دستاویز ہے اور اس دستاویز کو عثمانی خاندان سے وابستہ لوگوں نے والد ماجد حضرت شاہ محمد عثمانی کے حالات پر کتاب میں آخر میں ضمیمہ کے طور شائع کر دیا ہے، شاہ محمد عثمانی صاحب چالیس سال مکہ مکرمہ رہے اور جن کا انتقال مکہ میں بروز جمعہ ۲۲ اپریل ۲۰۱۱ کو ہوا اور حرم شریف میں بعد نماز جمعہ کئی لاکھ لوگوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ان کی زندگی پر یہ کتاب جناب احمد عثمانی (۱۴ اعلیگ اپارٹمنٹ، شمشاد مارکٹ

علی گڑھ) نے شائع کی تھی۔ یہ کتاب مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کی لائبریری میں بھی مل سکتی ہے اور خدا بخش لائبریری اور اردو لائبریری پٹنہ میں بھی موجود ہے۔ والد صاحب شاہ محمد عثمانی نے بتایا تھا کہ پانی پت کے مولانا لقاء اللہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں بہت اہتمام کے ساتھ خاندان عثمانی کے لوگوں سے جا جا کر ملتے تھے اور ان کی نئی نسل کے لوگوں کا نام نوٹ کرتے تھے؛ تاکہ نسب نامہ میں ان ناموں کا اضافہ کیا جائے۔ آج بھی اس کی ضرورت ہے کہ کسی ایک عثمانی خاندان کو مرکزی حیثیت دی جائے اور ہندوستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے عثمانی خاندان کے لوگ اضافہ شدہ ناموں کو وہاں بھیجتے رہیں اور وہاں سے اضافہ شدہ ناموں کے ساتھ نسب نامہ کی نقلیں تیار ہوتی رہیں۔ نسب نامہ کی حفاظت کے عربی ذوق کو باقی رہنا چاہیے۔ نسب کی حفاظت اچھی بات ہے، نسب پر فخر کرنا جائز نہیں، لیکن بطور شرف اور قرابت رحم کے حق کی ادائیگی کی نیت سے اس کی حفاظت پسندیدہ بات ہے۔

مولانا مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی ہندوستان کے علماء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ قرآن و حدیث اور فقہ و فتاوی اور ہر اہم موضوع پر ان کی کتابیں ان کی علمیت اور فضل و کمال کی گواہ ہیں۔ راقم حروف کے نزدیک حلقۂ دیوبند میں ان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے ملک کی اسلامی تحریک جماعت اسلامی سے متعلق کبھی جادۂ اعتدال سے ہٹنا پسند نہیں کیا اور زبان و قلم کی احتیاط کو اور امت کے اتحاد کے پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، حلقۂ دیوبند میں یہ خصوصیت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کے خاندان میں بھی رہی ہے۔ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی جماعت اسلامی کے حلقہ کی دعوت پر کانفرنس اور سیمینار میں بھی شریک ہوتے تھے، کسی عالمِ دین میں کوئی اور خصوصیت نہ ہو، تنہا یہی خصوصیت ہو تو بھی وہ قابل تعریف ہے؛ کیونکہ امت کا اتحاد قرآن و سنت کا منصوص حکم ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں

سے رابطہ کی انہوں نے جو راہ تجویز کی، یہ وہی نسخۂ کیمیاء ہے جو مولانا آزاد نے مسلمانوں کے لیے پیش کیا تھا یعنی متحدہ قومیت کی راہ اور غیر مسلموں سے بہتر تعلقات کی راہ، آج اس نسخہ کو آزمانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو شرفِ قبول عطا فرمائے، مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کی عمر میں صحت کے ساتھ برکت عطا فرمائے اور ان کے تمام دینی کاموں کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین

محسن عثمانی ندوی
۲۵ر فروری ۲۰۱۹ء

○❖○

﴿تقریظ﴾

حضرت مولانا محمد سالم صاحب جامعی

(ایڈیٹر ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی)

عالم اسلام بالخصوص برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں نے دینی، علمی اور سماجی زندگی کی بقا اور اپنی اسلامی شناخت کے تحفظ کے لیے جو دینی وفکری راہ اپنائی، اس کے نتیجے میں قدرت نے ملت اسلامیہ کو ایک بڑی تعداد میں ایسے ممتاز علما، صلحا اور اربابِ فضل وکمال سے سرفراز فرمایا، جنھوں نے اپنی دینی وعلمی جدوجہد کے ذریعہ نہ صرف برصغیر؛ بلکہ پورے عالم اسلام کو فیض پہنچایا اور علمی ودینی میدان میں وہ امتیاز بھی حاصل کیا، جس کے ذریعہ اس خطۂ ارضی میں علم دین کے اثرات صاف نظر آرہے ہیں۔ یہ ہی وہ ممتاز حضرات ہوتے ہیں، جو اکثر وبیشتر تذکرہ نگاروں کے قلم کی جولانگاہ بنتے ہیں۔

تذکرہ نگاری ایک مشکل کام ہے، اس میں تذکرہ نگار کو اپنی پسند ناپسند سے اوپر اُٹھ کر انتہائی احتیاط کے ساتھ قلم اُٹھانا پڑتا ہے، اس میں افراط وتفریط فن کے تقدس کو پامال کر دیتی ہے، جبکہ تذکرہ نگار کا کام فن کی تقدیس کے تحفظ کے ساتھ اصل حقائق و واقعات کو خوبصورت پیرایہ میں صفحۂ قرطاس کے حوالہ کرنا ہے، جس کے لیے وسعتِ فکر ونظر، حسنِ انتخاب، حسنِ ترتیب اور صاحبِ تذکرہ کے ساتھ محبت وعقیدت جیسے بنیادی عناصر درکار ہوتے ہیں۔

ہمارے محترم نوجوان عالم وفاضل مفتی محمد عارف جیسلمیری سلّمہٗ کو اللہ تعالیٰ نے

مذکورہ بالا صفات وکمالات کا امین بنایا ہے۔ پروردگارِ عالم نے انھیں علمی تحقیق وتدقیق کے ساتھ تذکرہ نگاری کے فن کا بھی خاص صالح ذوق عطا فرمایا ہے۔ اربابِ فضل و کمال کے تذکروں پر مشتمل ان کے درجنوں مضامین اخبارات کی زینت بن چکے ہیں، جو ان کی تذکرہ نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی: سوانح۔ افکار۔ خدمات'' برصغیر کے ایک ممتاز عالم مفتی وخطیب حضرت مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دیوبندی مدظلہٗ کی سوانح حیات ہے، جسے نوجوان عالم دین اور تذکرہ نگار مفتی محمد عارف جیسلمیری (راجستھان) نے ہی ترتیب دیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی کا تعلق مرکزِ علم وعرفان دیوبند کے اس عظیم علمی گھرانے سے ہے، جو ایک صدی سے زائد عرصے سے پورے عالم اسلام کو اپنی فقہی بصیرت اور نورِ معرفت سے روشنی بخش رہا ہے۔ آپ کے جدامجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ دار العلوم دیوبند کے اوّلین صدر مفتی تھے، جن کے فتاویٰ نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ پوری اسلامی دُنیا کے لیے ایک معتبر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے والدِ محترم حضرت مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ بھی بہ حیثیت صدر القراء تقریباً نصف صدی تک مرکزِ علم ومعرفت دار العلوم دیوبند سے وابستہ رہے۔ خود صاحبِ تذکرہ مفتی صاحب مدظلہٗ ایک طویل عرصہ سے خطۂ پنجاب کو بہ حیثیت مفتیٔ اعظم پنجاب اپنی علمی، دینی اور فقہی سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔

دیوبند کا نام آتا ہے، تو بزرگوں کی وہ پوری نسل چشمِ تصور میں صاف نمایاں ہو جاتی ہے، جو گذشتہ پوری ایک صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ سے لے کر حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے باکمال وممتاز تلامذہ تک ایک سے ایک قد آور ہستیوں کا ایک عظیم سلسلۃ الذہب ہے، بے شمار حضرات ہیں، جنہیں کردار کی عظمت

کے ساتھ فکر وفن کی عظمت بھی حاصل رہی ہے۔ انھیں شخصیتوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ بھی تھے، جو نہ صرف اپنے استاذِ محترمؒ کی علمی جلالت کا مظہر تھے؛ بلکہ ان میں اپنے بزرگ اساتذہ کے کردار کا جمال، ان کے علم کی گہرائی وگیرائی اور روحانیت کا عکس جمیل بھی صاف نظر آتا تھا۔ مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی بھی انھیں کے خانوادے کے ایک روشن چراغ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے، آمین۔

بہر حال تذکرہ نویسی وسوانح حیات وخدمات، علم وادب اور قلم وقرطاس کے حوالہ سے ایک بے حد پسندیدہ، کارآمد اور دلچسپ موضوع ہے، جس کے ذوق کا کافی حصہ مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری سلّمہٗ کو ان کے پروردگار نے خوب خوب عطا فرمایا ہے۔ زیر نظر کتاب جس کا ایک اعلیٰ اور خوبصورت نمونہ ہے۔

صحیح بات تو یہ ہے کہ مؤلف کتاب نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کی ذات والا صفات کو نقشِ دوام بخش دیا ہے۔ اس تالیف لطیف کے ذریعہ جہاں قارئین کرام کو ایک عظیم اور مثالی شخصیت سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا، وہیں ان کے فیوض وبرکات سے بھی انھیں مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔

اللہ تعالیٰ اس تالیف کو قبولیت عامہ سے نوازے اور اسے ہر خاص وعام کے لیے مفید بنائے۔ آمین

محمد سالم جامعی

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ/ ۶ جنوری ۲۰۱۹ء

هدیۂ تبریک

مولانا نصیرالدین صاحب قاسمی جودھپوری

استاذ ادبِ عربی مدرسہ خادم الاسلام بھاکری

دار العلوم دیوبند ایک عظیم علمی درس گاہ ہی نہیں؛ بل کہ اسلامیانِ ہند کی وہ عظیم تحریک ہے، جس کی فیض رسانیاں دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکی ہیں۔ اس کاخ فقیری سے ایسے ایسے خورشیدِ جہاں تاب طلوع ہوئے کہ جن کی ضیا پاشیاں عرب وعجم کو منور کر چکی ہیں اور جن کی ضوفشانیاں مشرق ومغرب کے علمی حلقوں کو روشن کر رہی ہیں۔

کسی ادارے کی قدر وقیمت کا اندازہ اس کے فرزندوں کے کارناموں سے ہوتا ہے اور دار العلوم دیوبند کی کوکھ نے ماضی قریب میں اتنے عظیم فرزند پیدا کیے ہیں کہ مسلم دنیا کا شاید ہی کوئی ادارہ اس کی ہم سری کا دعوی کر سکے۔

تفسیر وحدیث اور فقہ وفتاوی کے تو یہاں سے کوہ ہمالہ پیدا ہوئے ہیں۔ دعوت و اصلاح، زہد وتقوی اور شانِ استغنا کے ایسے ایسے نمونے دار العلوم دیوبند کی تاریخ میں جگمگاتے نظر آتے ہیں کہ قرنِ اول کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہ اللہ کی شخصیت (جو دار العلوم کے پہلے فرزند شمار کیے جاتے ہیں) اتنی متنوع اور اتنی عظیم تھی کہ اپنے وقت کی سب سے عظیم سلطنتِ برطانیہ کی چولیں تنہا اس فقیرِ بے نوا کی ایک نوائے اسد اللّٰہی سے ہل ہل گئیں۔ دہلی اور کابل سے لے کر قسطنطنیہ تک اپنی بے مثال عزیمت کے ذریعے اس حکومت کو ایسا چیلنج کیا کہ لندن کا تخت ہلنے لگا۔

شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگردوں نے دارالعلوم کو ایک عالمی تحریک بنادیا۔ جہاں کسی دور میں بیک وقت انڈونیشیا اور ملیشیا سے لے کر بخارا و سمرقند تک کے طلبہ اپنی علمی تشنگی بجھایا کرتے تھے، ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کے سوانحِ حیات مرتب ہوکر آج بھی فرزندانِ دارالعلوم کے لیے منارۂ نور بنے ہوئے ہیں۔

اب تک سیکڑوں فرزندانِ دارالعلوم کی سوانح عمریاں مرتب ہوگئی ہیں، جونئی پود کے قلوب میں ہمت و عزیمت کی مشعلیں روشن کرتی ہیں۔ سوانح نگاری ایک انتہائی وقیع اور باوقار فن ہے۔ زندہ قومیں ہمیشہ سے اپنے عظیم سپوتوں کی زندگیاں آنے والی نسلوں کے لیے مرتب کرتی رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں انھیں فرزندانِ دارالعلوم اور خوشہ چینانِ خوانِ نانوتوی میں سے ایک عظیم انسان مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دیوبندی کے سوانح مرتب کیے گئے ہیں۔ مفتی عثمانی صاحب کا تعلق خود دیوبند کے مردم خیز عثمانی خانوادے سے ہے، جس نے عظیم فقیہ الامت حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ سے لے کر شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی اور صاحبِ سوانح تک درجنوں ایسے رجالِ کار پیدا کیے ہیں کہ ان میں سے ایک بھی کسی خاندان کے لیے باعثِ فخر بن سکتا ہے۔

بہر حال مفتی ہلال عثمانی صاحب نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الأدب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی علیہما الرحمہ جیسے عظیم استاذوں سے کسبِ فیض کیا اور لٹے ہوئے اور اجڑے ہوئے اور تقسیم کے ہزاروں زخم کھائے ہوئے پنجاب کو اپنا مستقر بنایا اور پنجاب کی عظمتِ پارینہ یا کھوئی ہوئی دینی پہچان کو بحال کرنے میں اپنی والی کوششیں صرف کیں، حتی کہ آج پھر اسی خاکستر سے دین وایمان کی چنگاریاں دوبارہ سلگنے لگی ہیں، مساجد آباد اور مدارس کے کمھلائے ہوئے پودے نہال ہونے لگے ہیں۔

قابلِ تہنیت وتبریک ہیں برادر مؤقر جناب مولانا محمد عارف قاسمی جیسلمیری

صاحب پوکرنوی زید مجدہ، جنھوں نے حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی صحبت وحیات کو مبارک جان کر اور اپنے نانا مرحوم: حضرت مولانا قاری ہاشم صاحب گومٹوی مرحوم سے مفتی صاحب مدظلہ کے قدیم محبانہ تعلق کا حق ادا کرتے ہوئے آپ کے سوانح مرتب کردیے ہیں۔

راقِم سطور نے مکمل کتاب کا مطالعہ تو اب تک نہیں کیا؛ کیوں کہ میرے پاس کتاب کا برقی مسودہ پہنچا ہے اور برقی مسودہ صرف فون میں پڑھا جاسکتا ہے، جو اپنی بوقلمونیوں کی وجہ سے اس کا موقع ہی نہیں دیتا کہ کسی کتاب کو حرف بہ حرف پڑھا جاسکے۔

مگر میں شہادت دیتا ہوں کہ مولانا مفتی محمد عارف قاسمی جیسلمیری صاحب زید مجدہ کی زبان و بیان معیاری اور اسلوبِ نگارش کسی بھی صاحبِ زبان سے ہلکا ہرگز نہیں ہے۔آپ نے بھی دار العلوم دیوبند کے شعبۂ تصنیف وتألیف کے مؤقر شعبے سے فیض اٹھایا ہے۔علماء راجستھان کے لیے جو علمی کام کی ہمت اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوصف نہیں جٹا پاتے مولانا کا یہ کام حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔ان شاء اللہ

مولانا مفتی محمد عارف قاسمی پوکرنوی صاحب زید مجدہ علم و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔موصوف کے کئی علمی مضامین اردو کے باوقار جرائد واخبارات میں چھپ چکے ہیں۔سوشل سائٹس پر موصوف کی نشریات کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔مغربی راجستھان کے باصلاحیت اور جواں سال اہلِ قلم میں مفتی نیک محمد صاحب استاذ مدرسہ خادم الاسلام بھاکری (جن کے قلم میں ادب کی چاشنی، زبان کا مٹھاس اور تحقیق کی سنجیدگی سبھی کچھ ہے) اور مولانا محمد عارف قاسمی صاحب بڑلوی (جن کا بیش بہا علمی اور ادبی کارنامہ آپ کے ہاتھوں میں ہے) آنے والی نسلوں کے لیے منارۂ نور ثابت ہوں گے۔ان شاء اللہ

میں خدائے عزوجل سے دعا کرتا ہوں کہ حضرت مفتی ہلال صاحب مدظلہ کے سوانح کو موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لیے مفید اور نفع بخش بنائے اور جواں سال مرتبِ سوانح کے علم وقلم میں مزید برکت وقوت بخشے۔

نصیر الدین قاسمی
مدرسہ خادم الاسلام بھاکری
۲۸؍ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ

○❖○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دل کی باتیں

مفتی ارتقاء الحسن کاندھلوی (مفتیٔ اعظم پنجاب)

بچپن کی بات ہے، نیا نیا پڑھنا سیکھا تھا، ہر لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کا شوق تھا، انہیں دنوں نظام الدین دہلی کی ایک دیوار پر کسی جلسے کے اشتہار میں مہمان خصوصی یا زیرِ صدارت کے کالم میں پہلے پہل حضرت مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دامت برکاتہم کا نام پڑھا تھا، ساتھ میں ''مفتیٔ اعظم پنجاب'' کا بارعب لاحقہ بھی تھا، اول وہلہ میں ہی اس نام کے تئیں عظمت و اعتراف کا ایک نقش دل پر مرتسم ہو گیا تھا، جو بعد میں مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میں درجہ حفظ سے درجہ فارسی پھر عربی درجات میں منتقل ہوتا رہا، تعلیمی سفر میں ہر گام پر یہ نام سامعہ نواز ہوتا رہا، کبھی کسی رسالے یا کتاب کے سرورق پر، کبھی کسی سیمینار یا کانفرنس کی روداد میں، کبھی لفظ و قلم کے شہسواروں کے تذکرے میں، کبھی زبان و تعبیر کے علم برداروں کی فہرست میں، اس طرح مدرسے کی چہار دیواری میں اس نام سے ایک مناسبت پیدا ہو گئی، کیا خبر تھی کہ عملی زندگی میں اسی میدان میں قدم رکھنا ہوگا، جہاں مفتی فضیل الرحمٰن صاحب جیسی عبقری شخصیت نے اپنے فکر و فن کے گل اگائے اور کمالات کے جوہر دکھائے۔

غالباً اکتوبر ۲۰۰۶ء کی بات ہے، مالیر کوٹلہ کا ایک وفد کاندھلے حاضر ہوا اور حضرت مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم کی خدمت میں درخواست

کی کہ راقم کو ''مفتیٔ اعظم پنجاب'' کے منصب پر کام کرنے کے لیے مالیر کوٹلہ بھیج دیں، یہ پیش کش جب میرے کانوں سے ٹکرائی تو ہزار خدشات اور اندیشوں کے درمیان آمادگی کی فقط ایک وجہ تھی کہ مفتی فضیل الرحمٰن صاحب کے نقشِ قدم کے اتباع اور پس روی کا شرف حاصل ہوگا۔

پہلی زیارت و ملاقات مالیر کوٹلہ میں ہی ہوئی، نہایت عمدہ نفیس شیروانی، عثمانی خاندان کی روایت کے مطابق شیروانی ہی کے کپڑے کی دو پلی ٹوپی، قدرے تنگ پائچے کا سفید بے داغ پائجامہ، ہاتھ میں عصا، عالمانہ وقار و رعب، سنجیدگی و متانت سے بھرپور شخصیت، برسرِ محفل شمع انجمن بنے ہوئے تھے، ٹھہرے ٹھہرے لب و لہجے اور نپے تلے لفظوں میں گفتگو فرما رہے تھے، سلام ودعا کے بعد میرا تعارف ہوا تو نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور خاندان کاندھلہ کے حوالے سے تعریفی کلمات کے ذریعے میری حوصلہ افزائی کی۔

مفتی صاحب کی خطابت کا بڑا شہرہ تھا، اس لیے سننے کا اشتیاق بھی تھا، غالباً سرہند میں مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے روضے سے متصل مسجد میں شیخ ذیشان صاحب کے خطبۂ نکاح سے قبل پہلی مرتبہ تسکین شوق کا سامان ہوا، زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ کی تقریر تھی، لیکن ''دریا بہ کوزہ'' کا مصداق، نپے تلے الفاظ، مختصر جملے؛ بایں ہمہ ہر لفظ ایک عنوان اور ہر جملہ ایک مضمون، کم سے کم حروف رابطہ کے باوجود تمام جملے باہم مربوط و مرتب، تقریر کیا تھی؟ لفظوں کے موتی اس شان سے پروئے ہوئے تھے کہ نوکِ زبان سے ادا ہوں تو فنِ خطابت کا شہ پارہ اور نوکِ قلم پر آئیں تو انشا پردازی کا عمدہ شاہکار، آواز میں ایک تسلسل اور روانی، لہجے میں گاہے سکون، گاہے دبا دبا سا جوش، مضامین کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، ہر نگاہ پر شوق اور ہر گوش برآواز۔

مجھے خوب یاد ہے، اس دن تقریر کا مرکزی عنوان ''مرد وزن کا باہمی تعلق'' تھا، جس

کے تحت ازدواجی زندگی کے فلسفے کو دل نشیں اسلوب میں پیش کیا گیا تھا،ایک طرف قرآنی ارشاد:''الرجال قوامون علی النساء'' کے ذیل میں مرد کی عورت پر یک گونہ برتری اور اس کی حکمت و تعقلیت کو بیان کیا گیا،تو دوسری طرف قرآنی قانون:''لھن مثل الذی علیھن'' کے تحت وضاحت کی گئی کہ حقوق کے تعلق سے عورت مرد کی صف میں برابر کھڑی ہے،آخر میں قرآنی تعبیر:''ھن لباس لکم و انتم لباس لھن'' کی تہ در تہ معنویت کو اس طرح اجاگر کیا گیا کہ عقل وفہم کے بند دریچے کھلتے چلے گئے،جب تقریر ختم ہوئی تو بے اختیار دل سے یہ کلمات ادا ہوئے:''ان من البیان لسحرا''۔

بعد کے دنوں میں مفتی صاحب کی بہت سی تقاریر سننے کا موقع ملا اور مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ مندرجہ بالا امتیازات ان کی ہر تقریر میں عیاں ہوتے ہیں،جن کو تنقیدی نظر رکھنے والا ہر شخص بہ آسانی محسوس کر لیتا ہے،مفتی صاحب کا اسلوبِ خطابت بالکل منفرد ہے،آپ موجودہ دور کے پیشہ ور مقرروں کی طرح آواز کی گھن گرج پر یقین نہیں رکھتے،بلکہ لفظ و معنی کی صداقت،دلیل کی قوت اور مضمون کی فلسفیت اور معقولیت کے بل پر مخاطب کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے قائل ہیں، آپ کی تقریر میں بھرتی کے الفاظ نہیں ہوتے،نہ ہی بے وجہ تکرار،پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون اور مشکل سے مشکل فلسفیانہ فکر و خیال ایسے سہل انداز سے بیان کر دیتے ہیں کہ معمولی فہم و ادراک رکھنے والے شخص کی بھی گرفت میں آجائے،آپ تقریر میں زیادہ شعر وشاعری سے اجتناب کرتے ہیں،اگر کبھی شعر زبان پر آتا ہے تو وہ سیاق وسباق کے تناظر میں ایسا موزوں و مناسب ہوتا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ،طویل قصہ گوئی سے بھی گریز کرتے ہیں،البتہ کبھی کبھار روزمرہ کے واقعات ومشاہدات ان کی تقریر کا حصہ بنتے ہیں،لیکن وہ عام سے واقعے یا مشاہدے سے درس وعبرت کے وہ مضامین کشید کر لیتے ہیں،جن تک ان ہی کا ذہن رسا پہنچ سکتا ہے۔

انسان کے پاس اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے دو ہی وسیلے ہیں: زبان اور قلم ، بہت کم لوگوں کو بہ یک وقت دونوں وسیلوں پر بھرپور قدرت حاصل ہوتی ہے، مفتی صاحب بھی ان ہی میں سے ایک ہیں، زبان کے ساتھ ساتھ آپ کا قلم نستعلیق رقم بھی نہایت شستہ ورواں ہے، تقریر کی اکثر خوبیاں تحریر وانشاء میں بھی نمایاں ہیں، جس پر ان کی گراں قدر تصنیفات وتالیفات شاہدِ عدل ہیں۔ دو کتابیں مجھے خاص طور پر پسند ہیں: ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ''معمارِ انسانیت'' جس میں ایک نئے اور اچھوتے انداز میں سیرت پاک کو بیان کیا گیا ہے، دوسرے ''اسلامی قانون'' جس میں قوانینِ اسلامی کی دفعہ وار تدوین کی گئی ہے، مؤخر الذکر کا حوالہ ان فتاوی میں بہت سودمند ہوتا ہے، جو عدالتوں میں پیش کئے جاتے ہیں، نیز ججوں کے سامنے گواہی کے دوران بھی کتاب میں درج دفعات کے حوالے سے بات کرنا سہل اور مفید ہوتا ہے، دراصل اس تحقیقی کام کے ذریعے مفتی صاحب نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے راستے کی مشکلات دور کردیں اور وہ یہ کہنے کے بجا طور پر حق دار ہیں:

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو

بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

(ثاقب لکھنوی)

مفتی صاحب کے مزاج وطبیعت میں حد درجہ سلیقہ ہے اور یہ سلیقہ آپ کی تحریر وتقریر، وضع قطع، لباس وپوشاک، نشست و برخاست، رفتار وگفتار، اخلاق وعادات ہر شئے میں جھلکتا ہے۔

فطری طور پر مفتی صاحب نہایت نرم خو اور متحمل طبیعت رکھتے ہیں، بہت سے

خلافِ مزاج اور ناگوارِ طبع مظاہر کو تحمل و بردباری کے پردے میں چھپا لیتے ہیں، لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تو اس وقت آپ پر جلال ورعب کی ایک چادر تن جاتی ہے، پھر کس میں ہمت ہے کہ آپ کے سامنے دم بھر سکے، اس طرح کے کئی مواقع میرے سامنے پیش آئے، ایک مرتبہ ماہِ رمضان کی آخری شب میں دو ڈھائی بجے محلے کی مسجد کے مائک سے ''الوداع ماہِ رمضان'' نظم پڑھی جانے لگی، جس سے آپ کی آنکھ کھل گئی، اسی وقت غصے کے عالم میں مسجد تشریف لائے اور فرمایا کہ: ''آپ لوگوں کو احساس نہیں کہ لوگ سو رہے ہیں، جن میں بوڑھے بھی ہیں اور بیمار بھی اور بہت سے غیر مسلم بھی ہیں''۔ مفتی صاحب کو دیکھتے ہی لوگ کافور ہو گئے، اس کے بعد کبھی کسی کو مذکورہ نظم پڑھنے یا بے وقت مسجد کا مائک استعمال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، حالانکہ اس سے قبل اکثر و بیشتر یہ بے سلیقہ کام کیا جاتا تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ شخصی زندگی کے حالات اسی وقت محفوظ ہو پاتے ہیں، جب گرد و پیش دلِ حساس، فکرِ رسا، نگاہِ دور بیں اور طاقت ورقلم ہو، وگرنہ بڑی بڑی نامور ہستیاں بے نام و نشان ہو کر رہ جاتی ہیں، مفتی صاحب کی عملی زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزرا، وہاں کے غیر علمی و تحقیقی منظر نامے میں کوئی ایسا صاحبِ قلم نہیں تھا، جو مفتی صاحب کے حالاتِ زندگی کو سپردِ قرطاس کر سکتا اور قرینِ قیاس تھا کہ یہ رہنما نشانات زمانے کی سلوٹوں میں گم گشتہ ہو کر رہ جاتے، تاہم قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، فاضل دوست جناب مولانا محمد عارف قاسمی جیسلمیری صاحب کی صورت میں غیب سے ایک فرشتہ نمودار ہوا، جس نے بڑی جانفشانی کے ساتھ مفتی صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز اور حالات و واقعات کو دلوں کے سفینے سے کاغذ کے سینے پر منتقل کر دیا، فاضل تذکرہ نگار کی یہ محنت و کاوش مفتی صاحب کے لیے خراجِ عقیدت اور آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوگی۔

فاضل تذکرہ نگار کے نانا مولانا قاری محمد ہاشم صاحب گومٹویؒ ایک خدارسیدہ بزرگ انسان تھے، جوتاعمر جامع مسجد اور عیدگاہ شہر مالیرکوٹلہ کے امام وخطیب رہے، راقم ان کی زیارت سے محروم رہا،لیکن اہالیان شہر کوان کی تعریف میں رطب اللسان پایا،مولانا مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے،نماز جمعہ سے قبل علمی رنگ میں اصلاحی بیان کرتے تھے،لوگ ان کی تقریر ذوق وشوق سے سنتے تھے،مالیرکوٹلہ میں موجود دینی فضا کے قیام میں ان کی کوششوں کا بڑا کردار رہا ہے،راقم سے تبلیغی جماعت کے صوبائی امیر جناب جمیل صاحب مرحوم نے بارہا ذکر کیا کہ مولانا محمد ہاشم صاحب مندرجہ ذیل اشعار اکثر وبیشتر بڑے وجد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے:

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو ہمہ خنداں بوند تو گریاں
ہم چناں زی کہ وقتِ مردنِ تو ہمہ گریاں بوند تو خنداں

اللہ تعالیٰ تذکرہ نگار کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی اس علمی کاوش کو قبول فرمائے،امید ہے کہ یہ تذکرہ اہل علم کے حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گا۔

ارتقاء الحسن کاندھلوی
۱ر رجب المرجب ۱۴۴۰ھ

○❖○

﴿عرضِ مؤلف﴾

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کی بعض تصانیف زمانۂ طالب علمی میں نظر سے گزری تھیں اور جبھی سے غائبانہ تعارف و واقفیت کا شرف حاصل تھا۔ یہ غائبانہ واقفیت پہلے پہل کس سن و سال میں ہوئی، اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ پانا مشکل ہے، ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ نام کی حد تک تعارف و شناسائی کا یہ واقعہ نانا مرحوم مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلیؒ گومٹوی سابق شاہی امام و خطیب جامع مسجد و عیدگاہ مالیرکوٹلہ پنجاب کے سانحۂ رحلت کے بعد کا ہے۔ اس سے پہلے احقر کے بچپن کے تین چار سال بالے وال مالیرکوٹلہ میں گزرے تھے، جہاں والدِ ماجد وقف بورڈ کی مسجد میں امام رہے تھے۔ والد ماجد کی اس جگہ سے علاحدگی کے بعد بھی وقتاً فوقتاً نانا مرحوم کے یہاں آنا ہوا؛ مگر کم سنی اور عقل و شعور کی ناپختگی کی بنا پر مفتی صاحب مدظلہم سے بہ راہِ راست ملاقات و مخاطبت کا ظاہر ہے کوئی امکان تھا اور نہ ہی کوئی موقع۔

۲۰۱۱ عیسوی میں مجھے پہلی بار حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور نانا مرحوم کی نسبت سے آپ مجھ پر شروع ہی سے مشفق و مہربان رہے۔ زمانۂ طالب علمی سے فراغت کے بعد میرا دو سال تک دہلی میں قیام رہا۔ حضرت اس پورے عرصے میں میری حقیر مصروفیات سے باخبر رہے۔ ۲۰۱۸ عیسوی میں "تفسیر اظہار القرآن" شائع ہوئی، جس کی پروف ریڈنگ کا کام مفسرِ قرآن حضرت مولانا انیس احمد آزاد قاسمی بلگرامی نقشبندی مجددی ناظم و شیخ الحدیث جامعہ عربیہ سید المدارس دہلی و خلیفہ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم کے حکم و ایما پر میں نے کیا تھا۔ تفسیری کام سے دل چسپی کے باعث میرے اس کام سے مفتی صاحب مدظلہم بے حد خوش ہوئے اور اپنی بزرگانہ دعاؤں سے نوازا۔

دو سال کا عرصہ دہلی میں گزارنے کے بعد آج سے کوئی ساڑھے تین سال پہلے دہلی

سے لدھیانہ اس لیے منتقل ہونا پڑا کہ یہاں چنڈی گڈھ کے مشہور (PGI) ''پنڈت جواہر لال نہرو انسٹی ٹیوٹ'' اسپتال میں عزیزم محمد امین سلمہ کا پیدائش کے بعد سے ہی علاج چل رہا ہے۔ مرض کچھ اس نوعیت کا ہے کہ عام ڈاکٹر حضرات اس کا علاج تو بعد کی بات رہی، اس کی کماحقہ تشخیص تک سے عاجز پائے گئے؛ اس لیے جب بھی مرض عود کر آتا تو لازماً چنڈی گڈھ آنا پڑتا تھا۔ خود ڈاکٹروں کی ہدایت بھی ہے کہ کسی بھی طرح کی شکایت پیدا ہونے پر اسی اسپتال سے رجوع ہونا ہے۔ دہلی میں کچھ وقت تک اس صورتِ حال کو نباہنے کی اپنی سی کوشش جاری رہی؛ مگر آخرش چنڈی گڈھ یا اس سے قریب کسی مقام کی جانب منتقل ہونے میں ہی عافیت نظر آئی اور پھر بہ نامِ خدا اس پر عمل بھی کیا گیا۔

بہ ظاہر لدھیانہ پنجاب آمد کی وجہ وہی تھی؛ مگر درحقیقت ایسا لگتا ہے کہ اللہ کے ایک مخلص بندے کی مثالی زندگی کو منظرِ عام پر لانے کا اس حقیر کو ذریعہ بننا تھا اور اسی لیے اس شخصیت کے بالکل قریب ہی لدھیانہ شہر میں احقر کے قیام کا من جانب اللہ انتظام ہوا۔

لدھیانہ آمد و قیام کے بعد مفتی صاحب مدظلہم سے بار بار ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے۔ ساڑھے تین سالہ قیام میں شاید ہی کوئی مہینہ حضرت کی خدمت میں حاضری سے خالی گزرا ہوگا۔

حضرت کی مجالس میں (جو علمی، ملی اور تاریخی تذکروں سے آباد رہتی ہیں) کئی دفعہ یہ خیال سطحِ ذہن پر ابھرا کہ آپ کی علمی، دینی، ملی اور رفاہی خدمات کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے اور یہ خیال صرف خیال ہی کی حد تک رہا۔ ابھی چند مہینے پہلے مفتی صاحب مدظلہم کی شخصیت پر احقر نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا، جسے علمی حلقوں میں مؤلف کی توقع سے کہیں زیادہ سراہا و پسند کیا گیا؛ بالخصوص مولانا احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری مدظلہم شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند و مہتمم جامعۃ الامام محمد انور دیوبند نے اس سلسلے کو بہت بلند الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا اور احقر کے نام اپنی برقی

تحریر میں یہاں تک لکھا کہ ''آپ نے مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب کی حیات و خدمات پر جو کچھ لکھا ہے، وہ بساغنیمت ہے اور یہ کہ آپ اس پر ہم سب منتسبینِ دیوبند کی جانب سے بجاطور پر شکریے کے مستحق ہیں''۔ احقر کا خیال تاثراتی تحریر یا زیادہ سے زیادہ ایک مفصل مقالے کا تھا؛ مگر ایک تو مولانا کشمیری مدظلہم نے بہ راہِ راست مذکورالصدر کلمات کے ذریعے مجھ حقیر کی حوصلہ افزائی فرمائی اور دوسری طرف انہوں نے اس سلسلۂ مضمون کو کتابی شکل میں منظرِ عام پر لانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ حضرت الاستاذ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر استاذ دارالعلوم وقف دیوبند اور بعض دیگر احباب بھی یہی خواہش ظاہر فرما چکے تھے، اس سب سے یہ ہوا کہ احقر کو مزید معلومات یکجا کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی اور بہ وقتِ ملاقات خود صاحبِ تذکرہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے مختلف عنوانات پر حسبِ ضرورت مختصر یا مفصل گفتگو کی اور بعض اہم باتیں فون پر بھی معلوم کرتا رہا، اس طرح وہ تحریر کتابی شکل اختیار کر گئی۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء**

مفتی صاحب مدظلہم کے بارے میں پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ ان کی ہمہ جہت دینی، علمی اور سماجی و رفاہی خدمات کا دائرہ نصف صدی سے بھی زائد ساٹھ پینسٹھ سالہ طول طویل عرصے پر مشتمل ہے، صفحہ ہائے قرطاس پر جس کا تفصیلی بیان اچھے خاصے وقت کا طالب و متقاضی ہے اور بعض اہم معلومات کی فراہمی کی خاطر چند ایک اسفار بھی ناگزیر ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ مرحلے بھی اپنے اپنے وقت پر طے ہو گئے اور تقریباً سات آٹھ ماہ پہلے جو کام شروع ہوا تھا، والدین، اساتذہ اور محبین و مخلصین کی دعاؤں کی بہ دولت وہ کام ایک حد تک مکمل ہو گیا ہے۔

حضرت کے عہدِ بچپن و جوانی سے ضعیفی کے موجودہ دور تک کے حالات و واقعات کا ذکر ''معمولات و مشاغل'' کے عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔

عثمانی خاندان کے اختصاصات و امتیازات اور اس کی جلیل القدر شخصیات کا ذکر

شرح وبسط کے ساتھ مفتی صاحب مدظلہم کی کتاب ''حیاتِ عزیز'' میں شامل ہے؛ اس لیے اس کتاب میں اس سلسلے کی تفصیلات سے بالقصد گریز کیا گیا ہے، البتہ چند ایک مواقع پر کسی نہ کسی مناسبت سے، اس خانوادے کی بعض قابلِ احترام شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس میں صرف اسی خاندان کی تخصیص نہیں؛ بلکہ تحریکات وتنظیمات اور مکاتب ومدارس وغیرہ متعدد عنوانات سے متعلق آپ کی خدمات کے ضمن میں ملک وبیرونِ ملک کی متعدد علمی، دینی اور محسنِ ملت سیاسی وسماجی شخصیات، ان کے آرا وافکار اور کچھ حد تک ان کی سیرت وکردار کا ذکر بھی آگیا ہے، جو ہمارے حق میں ہر طرح خیر وفلاح کا ذریعہ ثابت ہوگا اور دین ودنیا کے مختلف شعبوں اور میدانوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے والے افراد واشخاص کو بہت سی باتیں اور قیمتی مشورے نظر نواز ہوں گے، جو ملت کے فکر وعمل کا صحیح وواضح رخ اور نہج متعین کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے اور بہت سی ان غلطیوں اور نقائص وعیوب سے بچا سکے گا، جو ماضی میں اس قوم کی زبوں حالی وپس ماندگی کا ذریعہ ثابت ہوئے۔

اس کتاب کے قارئین کو یہ بات ذہن میں مستحضر رکھنی چاہیے کہ اس میں حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی بافیض زندگی کے صرف ان پہلوؤں پر خامہ فرسائی گئی ہے، جو دورانِ تحریر سوانح نگار کے ذہن میں آتے رہے اور جن کی بابت خود صاحبِ تذکرہ سے اختصار یا تفصیل کے ساتھ تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہا۔ جہاں تک حضرت مفتی صاحب مدظلہم ایسی جامعِ فضائل وکمالات شخصیت کے تمام پہلوؤں کے احاطے کا تعلق ہے، تو مجھے اس کا دعوی ہے اور نہ ہی مجھ بے بضاعت وکم ہمت سے ایسا کر پانا ممکن ہی ہے۔ بس پیشِ نظر فقط یہ ہے کہ حضرت کی حیات کے چند نقوش ایک ترتیب کے ساتھ پیش کر دیے جائیں، جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے حق میں چراغِ راہ ثابت ہوں۔ خدا کرے یہ مقصد حاصل ہو۔

بعض جگہ ملکی سطح کے فوائد کے پیشِ نظر اور ایک آدھ جگہ خاص پنجاب کے علما و

باذوق قارئین کو ذہن رکھ کر کتاب میں اطناب وتفصیل سے کام لیا گیا ہے، جو بڑی تعداد میں اس کتاب کو پڑھیں گے اور حضرت کے تجربات ونصائح کو عملی جامہ پہنا کر دینی وملی خدمات انجام دیں گے، ان شاء اللہ۔ اختصار سے کام لینے کی صورت میں اس عظیم مقصد کے فوت ہونے کا خدشہ تھا؛ اس لیے ان مقامات پر ایسا ہی کرنا ناگزیر بھی تھا۔

نمونۂ اسلاف حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہم، جانشینِ خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی اور جانشینِ فخر المحدثین حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری مدظلہم: ان حضراتِ اکابر نے اپنی تدریسی، انتظامی اور دیگر گوناگوں مصروفیات کے باوصف کتاب پر جستہ جستہ نظر ڈال کر کلمہ ہائے تحسین و توصیف کی شکل میں اپنے گراں قدر قلبی تاثرات کا اظہار فرمایا، اس احسانِ عظیم کے عوض راقم ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا۔

حضرت مولانا نسیم اختر شاہ صاحب قیصر مدظلہم جو اس ناکارہ کے بڑے مشفق ومحسن اور حد درجہ مخلص ومتواضع استاذ ہیں، علمی وتحریری دنیا میں ان کی شخصیت چنداں محتاجِ تعارف نہیں، یہ ناکارہ دارالعلوم کے زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا سے بعد عصر شاہ منزل خانقاہ میں برابر تحریری اصلاح لیتا رہا ہے اور میری بے ربط تحریریں آپ ہی کی شبانہ روز پرخلوص کوششوں اور مستجاب دعاؤں کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کی تالیف کے دوران بھی وہ میرا حوصلہ بڑھاتے رہے اور کتاب جب تکمیل کو پہنچی تو کتاب کے لیے ایک وقیع اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا، جسے اس کتاب کا حاصل اور روح قرار دینا بالکل بجا ہوگا۔

دارالعلوم، وقف دارالعلوم، جامعۃ الامام محمد انور، جامعۃ الشیخ، دارالعلوم زکریا اور دیوبند کے دیگر جملہ مدارس کے طلبہ عزیز کو آپ کی ذات سے بے پناہ تحریری فوائد حاصل ہوئے ہیں اور الحمدُ للہ یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ خدائے کریم حضرت الاستاذ کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے۔

اسی طرح یہ راقم انتہائی سپاس گذار ہے نامور صاحبِ قلم پروفیسر مولانا محسن عثمانی ندوی صاحب، مولانا محمد سالم صاحب جامعی مدیر تحریر ہفت روزہ الجمعیۃ، مولانا مفتی ارتقاء الحسن صاحب کاندھلوی حال مفتیِ اعظم پنجاب اور ادیب شہیر مولانا نصیر الدین صاحب قاسمی جودھپوری کا، جنہوں نے کتاب کو دیکھنے کے بعد اپنی بیش قیمت تحریرات سے نوازا، مولانا محسن عثمانی صاحب نے پیشِ لفظ میں عثمانی خاندان سے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس کا علم رکھنے والے کم ہی لوگ ہوں گے۔ کتاب میں یہ ایک خلا تھا، جو ان کی اس تحریر سے کافی حد تک پر ہو گیا ہے، مولانا ارتقاء الحسن صاحب نے کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا اور ہر طرح معاونت کا حق ادا کیا، جس کے لیے وہ بہ طورِ خاص شکریے کے مستحق ہیں۔

مفتی عبدالملک قاسمی، صاحبزادہ طارق عمیر عثمانی، حاجی شمشاد علی، صہیب صدیقی صاحب اور مفتی انیس الرحمٰن قاسمی: مفتی ہلال صاحب کے ان خدام و متعلقین کا بھی احقر احسان مند ہے، کتاب کو منظرِ عام پر لانے میں ان حضرات کی پر خلوص مساعی کا بڑا دخل رہا ہے۔

اللہ رب العزت صاحبِ تذکرہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی مد ظلہم کے علم و عمر میں برکت عطا فرمائے، ان کے سوانح و خدمات پر مشتمل اس ادنی سی تالیفی کوشش کو اپنی بارگاہ میں بے حد قبول فرمائے اور جن حضرات کا بھی اس کتاب میں تعاون شامل رہا ہے، انہیں اس کی بہتر سے بہتر جزا دنیا و آخرت میں عطا فرمائے۔

وکتبہ

محمد عارف جیسلمیری

مقیم لدھیانہ پنجاب

۲۸ جمادی الاخری ۱۴۴۰ھ مطابق ۶ مارچ ۲۰۱۹ء عیسوی بہ روز بدھ

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

بہ حیثیت مفتیِ اعظم پنجاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمھید

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان کے ایک مثالی فرد ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب چوالیسویں پشت میں دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

پورا شجرۂ نسب اس طرح سے ہے:

(۱)مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی (۲)مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانی
(۳)فقیہ اعظم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (۴)مولانا فضل الرحمٰن عثمانی
(۵)مراد بخش (۶)غلام محمد
(۷)غلام نبی (۸)لطف اللہ
(۹)محمد عاشق (۱۰)شیخ فرید عثمانی
(۱۱)ابو محمد (۱۲)محمد حافظ
(۱۳)شیخ محمد (۱۴)خواجہ عبد المالک
(۱۵)عبد العزیز (۱۶)عبد الحکیم
(۱۷)سعید (۱۸)شیخ محمد
(۱۹)خواجہ فضل اللہ (۲۰)خواجہ ابو الوفاء
(۲۱)عبید اللہ (۲۲)حسین
(۲۳)عبد الرزاق (۲۴)عبد الحکیم
(۲۵)حسن (۲۶)عبد اللہ عرف ضیاء الدین
(۲۷)یعقوب عرف معز الدین (۲۸)عیسیٰ

(۲۹)اسماعیل (۳۰)محمد
(۳۱)ابوبکر (۳۲)علی
(۳۳)عثمان (۳۴)عبداللہ حرمانی
(۳۴)عبداللہ گارزونی (۳۶)عبدالعزیز ثالث
(۳۷)خالد (۳۸)ولید
(۳۹)عبدالعزیز ثانی (۴۰)شہاب الدین المعروف بہ عبدالرحمٰن اکبر
(۴۱)عبداللہ ثانی (۴۲)عبدالعزیز
(۴۳)عبداللہ الکبیر (۴۴)عمرو
(۴۵)امیر المؤمنین عثمان ابن عفان بن ابوالعاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب۔

آپ کے والد ماجد مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند میں کم وبیش ساٹھ سال استاذِ تجوید وقرأت رہے۔آپ کے دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی تھے۔آپ کے پردادا مرحوم مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے اساطین وبانیان میں شامل ہیں۔مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ آپ کے دادا مرحوم کے بالترتیب حقیقی وعلاتی بھائی ہیں۔مختصر یہ کہ آپ کا خاندان ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا واقعی مصداق ہے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ۱۹۳۹ء میں متولد ہوئے،علمی وروحانی ماحول میں پرورش پائی،سن شعور میں داخلہ کے بعد دارالعلوم دیوبند آپ کا تعلیمی مسکن قرار پایا۔شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ،شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی امروہویؒ، امام المعقولات والمنقولات علامہ ابراہیم بلیاوی،فقیہ النفس مولانا مفتی مہدی حسن

شاہ جہاں پوریؒ اور خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمیؒ ایسے یگانۂ روزگار افراد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ ۱۹۵۶ء میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی اور دوسال کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے حکم پر دارالعلوم دیوبند ہی میں تدریسی سفر شروع ہوا، جو تقریباً بارہ سال تک جاری رہا۔ دارالعلوم دیوبند کے تدریسی دور کے دوران دوسال تک آپ مدینہ یونیورسٹی میں بھی مقیم رہے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند اور مدینہ یونیورسٹی کے اپنے جملہ اساتذہ اور اس دور کی کچھ دیگر شخصیات کا تعارف اور ان کے ظاہری و باطنی کمالات اپنی کتاب ''میرے قابل احترام اساتذۂ کرام'' میں قلم بند فرمائے ہیں۔

○❖○

مالیرکوٹلہ میں ورود

۱۹۷۳ء میں بہ حیثیت مفتیٔ اعظم پنجاب آپ یہاں کی مسندِ افتاء پر فائز ہوئے۔ بہ وقتِ روانگی دفترِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند سے آپ سے متعلق جو تحریر جاری ہوئی، وہ آپ کے اخلاقِ فاضلہ اور اعلیٰ علمی قابلیت کا بین ثبوت ہے۔

تحریر درج ذیل ہے:

دفترِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند (یوپی)

تصدیق کی جاتی ہے کہ مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۸۰ھ سے بہ حیثیت مدرس دارالعلوم دیوبند خدمت انجام دی اور مالیرکوٹلہ (پنجاب) میں مفتی دارالافتاء کے منصب پر فائز ہونے کے بعد ۱۳۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سبکدوش ہوئے۔ دارالعلوم میں ملازمت کے دوران ان کا کردار وعمل لائقِ تحسین رہا اور ذمہ داران دارالعلوم کو ان سے کسی طرح کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ دارالعلوم ان کی ممتاز علمی لیاقت وصلاحیت کا اعتراف کرتا ہے اور یہ امید رکھتا ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں گے، دارالعلوم کے لیے باعث فخر ہوں گے۔

سید اختر حسین
ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند
۸-۱-۱۳۹۶ھ

مفتی ہلال عثمانی دارالعلوم کی امید پر سوفی صد کھرے اترے۔ یہاں آمد کے بعد آپ نے دینی وعلمی اعتبار سے اجڑ چکے پنجاب کو اپنے سابقہ رنگ میں رنگنے کی اپنی حد تک مکمل کوشش کی۔ شروعاتی دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب آپ نے دارالعلوم دیوبند واپس جانے کا فیصلہ کرلیا اور دفترِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند میں پھر

سے تدریسی خدمات انجام دینے کی درخواست داخل کردی؛ مگر مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا، چناں چہ کچھ ایسے واقعات پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، جو آپ کے لیے تسکینِ قلبی کا ذریعہ ثابت ہوئے اور پھر آپ نے دارالعلوم واپسی کا خیال دل سے نکال کر پنجاب ہی کو اپنی مرکزِ فیض رسانی قرار دینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ شروعاتی دور اور اب ۱۴۳۹ھ مسلسل چھیالیس سال سے آپ کی ذات ستودہ صفات پنجاب میں بالخصوص اور ملک بھر میں بالعموم مرجع عوام وخواص بنی ہوئی ہے۔

اس دور میں جن واقعات نے آپ کو سنبھالا دیا، وہ واقعات مختلف المزاج لوگوں کے مابین دینی خدمات انجام دینے والے اربابِ علم وفضل کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افادیت کے پیش نظر ان واقعات کو بالترتیب لکھا جاتا ہے۔

☆ مفتی صاحب نے اس زمانہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے نام ایک خط لکھا، جس میں اس شہر کے حالات اور پھر دارالعلوم کی یادوں کا ذکر تھا۔ خط کی تحریر جذباتی رہی ہوگی۔ حکیم الاسلامؒ کا جو جوابی خط آیا، اس میں مرقوم تھا کہ ''آپ کا بہ حالاتِ موجودہ مالیرکوٹلہ میں قیام کرنا نہایت ضروری ہے، اس میں یہاں تک تحریر تھا کہ ''تمہارا وہاں ہونا خود میرا اور دارالعلوم دیوبند کا وہاں ہونا ہے۔'' اس خط سے دل بستگی کا بڑا سامان ہوا۔

☆ جب مفتی صاحب نے دفترِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند میں پھر سے تدریسی سلسلہ شروع کرنے کی درخواست داخل کردی اور اس کا علم کسی طرح مولانا ارشاد صاحبؒ سابق مبلغ دارالعلوم دیوبند کو ہوگیا، تو انہوں نے جامع مسجد مالیرکوٹلہ کے سالانہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجلاس میں شرکت کے موقع پر یہ بات نواب افتخار علی خاں صاحب مرحوم، نواب آف مالیرکوٹلہ کے کانوں میں ڈال دی۔ اب نواب صاحب نے جلسہ سے فراغت کے بعد جاتے وقت مفتی صاحب کو خود اپنی

گاڑی میں بٹھایا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی یہ بات رکھی کہ آپ یہاں سے جا رہے ہیں، ہم تو بڑی مشکل سے آپ کو یہاں لانے میں کامیاب ہوسکے ہیں، مختلف فرقے اس شہر کی علمی و دینی بساط پر قبضہ جمانے کے لیے پہلے سے کوشاں ہیں، آپ کی علیحدگی کے بعد خود آپ کی جگہ کا اور شہر کی دینی فضا کا کیا کچھ ہوگا، اسے آپ بخوبی جانتے ہیں۔ غرض اس طرح کی باتیں کہہ کر نواب صاحب نے مفتی صاحب کو مالیر کوٹلہ نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا اور مفتی صاحب کو بھی ان کے مخلصانہ مشورے کی بڑی قدر ہوئی۔

☆ مفتی صاحب نے اپنے ارادے سے والد ماجد مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ کو آگاہ کیا تو والد ماجد انہیں اپنے ہمراہ لے کر ایک صاحبِ کشف وکرامت بزرگ مولانا آلِ حسن صاحب کے پاس میرٹھ پہنچے (مولانا آلِ حسن صاحب اصلاً دیوبند کے باشندے تھے، نواب رشید احمد خاں مرحوم ان کو اپنے یہاں میرٹھ لے گئے اور پھر مولانا کا نواب صاحب ہی کے گھر میں مستقل قیام ہوگیا تھا، کیوں کہ نواب صاحب انہیں اپنے اصل وطن بھیجنے پر کسی صورت تیار نہ تھے) مولانا مرحوم مادرزاد ولی تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مشکل مسائل کے حل کے لیے ان سے مشورے و دعائیں لیا کرتے تھے۔

بہر کیف: مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحب نے ان کی خدمت میں حاضری کے بعد آمد کا مقصد بیان کیا اور یہ بھی کہ مفتی فضیل الرحمٰن مالیر کوٹلہ سے علیٰحدگی کے خواہش مند ہیں۔ مولانا آلِ حسن والد ماجد کی زبانی اس بات کا ذکر سن کر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ کچھ دیر بعد باہر تشریف لائے، اس وقت ان کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی، ورنہ چوں کہ بہت زیادہ ضعیف ہوچکے تھے، اس لیے ان کا چہرہ مرجھا سا گیا تھا، لیکن اس وقت خلافِ واقعہ ان کا چہرہ چمک رہا تھا اور

اس موقع پران بزرگ نے بھی آپ کو پنجاب ہی میں رہ کر دینی خدمات انجام دینے کی نصیحت فرمائی۔

☆ مولانا فیض الحسن کشمیری مفتی صاحب کے دارالعلوم دیوبند کے رفیقِ درس تھے، پڑھنے کا بڑا ہی شوق تھا، اس وقت کے دارالعلوم کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا، جسے انہوں نے پڑھے بغیر چھوڑا ہو، اس کے ساتھ بڑے عابد وزاہد بھی تھے۔ مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحبؒ کو ان سے بڑی محبت تھی، اہم امور میں ان سے استخارہ کرایا کرتے تھے؛ چناں چہ قاری جلیل الرحمٰن صاحب نے خاص مفتی صاحب سے متعلق ان سے استخارہ کرایا کہ آیا ان کے لیے مالیرکوٹلہ رہنے میں خیر ہے یا وہاں سے علاحدگی میں خیر ہے۔ انہوں نے تین مرتبہ استخارہ کیا اور تینوں ہی مرتبہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواب میں زیارت ہوئی۔ حضرت مجددؒ نے مالیرکوٹلہ نہ چھوڑنے کا امر فرمایا اور تیسری مرتبہ تو قدرے سخت لہجے میں یہاں تک فرمادیا کہ ''بار بار نہیں پوچھا کرتے، ہم نے ان کو خود بلایا ہے، ہم انہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔''

ان واقعات اور اکابر کے مشوروں کے بعد مفتی ہلال عثمانی مدظلہم نے بہ نامِ خدا مالیرکوٹلہ ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا، اس طرح مسلمانانِ پنجاب کو آپ کی ذات سے بیش بہا دینی فوائد حاصل ہوئے اور آپ کی ذات سے یہاں کے قیام میں بڑے بڑے دینی واصلاحی کام وجود پذیر ہوئے۔

○❖○

دارالافتاء مالیرکوٹلہ

مالیرکوٹلہ کا نظم ونسق ایک طویل مدت تک نوابوں کے ہاتھ میں رہا، جس کی تفصیل شہر کی بزرگ شخصیت صوفی محمد اسمٰعیل صاحب نے اپنے کتابچے ''تاریخِ مالیرکوٹلہ'' میں قلم بند فرمائی ہے۔ اس شہر کو نوابوں کی شکل میں بعض ایسے حکمراں بھی نصیب ہوئے، جو علم دوستی میں اپنی مثال آپ تھے اور جن کی خصوصی توجہات اور مخلصانہ کوششوں کی یہ دولت بڑے بڑے اصحابِ علم و فضل نے یہاں کے ساڑھے چارسو سالہ قدیم دارالافتاء کو اپنا مرکزِ فیض رسانی قرار دیا۔ جن شخصیات کا ذکر احقر نے مفتی صاحب سے سنا، اس کی مختصر تفصیل ''باتین ان کی ہیں، قلم میرا ہے'' کے اصول کے تحت قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

مفتی عبدالعزیز صاحب رائے کوٹیؒ

مفتی عبدالعزیز صاحب رائے کوٹیؒ دارالافتاء مالیرکوٹلہ پنجاب کی خشتِ اول ہیں۔ آج سے تقریباً ساڑھے چارسو سال قبل جب نوابی عہد حکومت میں اس دارالافتاء کو قائم کیا گیا، تو موصوف کی فقہی مہارت اوران کے اخلاص وللّٰہیت کو دیکھتے ہوئے انہیں مفتیٔ اعظم پنجاب کا عظیم منصب تفویض کیا گیا اور یہ اہالیانِ پنجاب کے لیے خوش نصیبی کی بات تھی کہ مفتیٔ اول کی سعادت ایک ایسے خدارسیدہ شخص کو بخشی گئی، جن کا اخلاص اور جن کی خداترسی عوام وخواص میں مسلّم تھی۔ کیا عجب کہ اسی ستودہ صفات بندۂ خدا کے طفیل اللہ تعالیٰ نے یہاں کے دارالافتاء کو اتنے طویل زمانہ تک

دینی مرکزیت کا شرف عطا فرمایا ہو۔ رائے کوٹ مالیر کوٹلہ سے تیس پینتیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، موصوف کا وطنی تعلق اسی شہر سے تھا۔

مفتی عبدالعزیز صاحبؒ کے بعد پنجاب، دیوبند اور ملک کے دیگر مقامات سے مفتیانِ کرام تشریف لاتے رہے اور اپنی اپنی مدتِ کار میں باشندگانِ پنجاب کی فقہی و دینی رہنمائی فرماتے رہے۔ افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر کی خدمات کو محفوظ نہیں رکھا جاسکا۔

مفتی خلیل صاحبؒ

مفتی صاحب بڑے صاحب صلاحیت اور ذی علم انسان تھے، ان کا مجموعۂ فتاویٰ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کے پاس الحمدللہ محفوظ ہے۔ مفتی صاحبؒ نے ''المفتی'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری فرمایا تھا، جس کا ایک شمارہ کسی زمانہ میں حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے ہاتھ لگا تھا اور بعد میں ضائع ہوگیا۔ مفتی خلیل صاحبؒ امام العصر فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے ہم عصر تھے۔

مولانا سید صدیق صاحب

مولانا ایک جلیل القدر عالمِ دین تھے اور اس کے ساتھ بہت بڑے صاحبِ باطن بزرگ بھی تھے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے انتقال کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنا اصلاحی تعلق انہیں سے قائم کیا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں وہ دارالافتاء مالیر کوٹلہ تشریف لائے، یہیں راہیِ آخرت ہوئے، شہر کے قدیمی قبرستان میں دفن ہیں، آپ کی وقیع خدمات کا ذکر تاریخِ دارالعلوم دیوبند میں شامل ہے۔

مولانا کو غالباً مفتی صاحب کے دادا مرحوم سے خلافت بھی حاصل تھی۔ دادا مرحوم

سے ان کے تعلقات کا مفتی صاحب کو جس طرح علم ہوا، اس کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں آپ کی حامد الانصاری غازی سے ملاقات ہوئی۔ مفتی صاحب نے ان کو بتایا کہ میں اس وقت پنجاب کے شہر مالیرکوٹلہ میں مقیم ہوں، تو انہوں نے یہ بات بیان کی کہ وہاں کے دارالافتاء میں میرے نانا مولانا صدیق حسن صاحب ایک زمانہ تک رہے ہیں، میری ولادت سے کچھ عرصہ قبل میری والدہ اپنے والد کے ہاں آئیں، چناں چہ میری پیدائش اسی شہر میں ہوئی، جی بہت چاہتا ہے کہ مالیرکوٹلہ آکر اس مکان کو دیکھوں، جس میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ غازی صاحب بارہا اپنی اس خواہش کا مفتی صاحب سے اظہار کیا کرتے تھے؛ لیکن اپنی حیات میں انہیں یہاں آنے کا اتفاق حاصل نہ ہوسکا۔

مفتی محمد شفیق صاحب

حضرت مولانا صدیق صاحبؒ کے صاحب زادے تھے، والد ماجد کے انتقال کے بعد دارالافتاء کی ذمہ داری سنبھالی، مدت العمر آپ پر تصوف کا رنگ غالب رہا۔

مولانا فاروق صاحب

مولانا فاروق صاحبؒ نے ایک زمانے تک یہاں کے دارالافتاء کو اپنے علمی فیوض سے مہکائے رکھا۔ فقہی اعتبار سے انہیں بڑا اچھا رسوخ حاصل تھا، جس کا اندازہ ان کے فتاویٰ کے مجموعے سے بہ خوبی ہوتا ہے۔

مفتی اصلح صاحب دیوبندی

مفتی اصلح صاحب دارالافتاء مالیرکوٹلہ تشریف لائے تھے؛ مگر ان کا قیام

چار پانچ ماہ سے آگے نہ بڑھ سکا، کیونکہ یہاں کی آب وہوا انہیں راس نا آسکی اور وہ واپس دیوبند منتقل ہو گئے تھے، ایک زمانے تک دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہنے کے بعد آخرِ عمر میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور انتقال کے بعد وہیں مدفون ہوئے، مفتی ہلال صاحب کے شعبۂ فارسی کے اساتذہ میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔

مفتی حمید حسن صاحب عثمانیؒ

مفتی صاحبؒ مفتی ھلال صاحب مدظلہم کے حقیقی چچا سسر تھے۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے ان کا بیعت وارادت کا تعلق تھا۔ مالیر کوٹلہ پنجاب روانہ کرتے وقت ان کے شیخ ومرشدؒ نے انہیں یہ نصیحت فرمائی تھی کہ ''پنجاب جارہے ہو، وہاں پر اپنے علمی ودینی کاموں کی طرف ہی متوجہ رھنا'' اور پھر پنجاب کے باشندگان کے بارے میں اپنا جو تأثر ظاہر فرمایا، وہ ان کی بصیرت، فکرِ رسا اور زمانہ آگہی کا روشن ثبوت تھا۔

مفتی صاحب تقسیم ہندوپاک سے کئی سال پہلے ۱۹۳۶عیسوی میں ہی دارالافتاء مالیر کوٹلہ تشریف لے آئے تھے اور کامل چالیس تک دارالافتاء مالیر کوٹلہ میں مفتی رہے۔مفتی صاحبؒ ایک علمی انسان تھے،غالباً فضائلِ درود شریف پر انہوں نے ایک رسالہ تالیف فرمایا تھا، جو آج بھی دستیاب ہے۔مفتی ھلال صاحب مدظلہم نے آپؒ کے افرادِ خاندان کو ان کے فتاوی کی جمع وترتیب اور ان کی طباعت واشاعت کا مشورہ دیا تھا،جس پر تادمِ تحریر عمل نہیں ہوسکا ہے۔۱۹۷۵ عیسوی میں ان کا انتقال ہوا۔شہر مالیر کوٹلہ کے ہی قدیمی قبرستان میں آپؒ کی آرام گاہ ہے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم

مولانا مفتی حمید حسن صاحبؒ کے ریٹائرڈ ہو جانے کے بعد اس خالی جگہ کو پر کرنے کے لیے قرعۂ فال حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے نام پر نکلا؛ بلکہ مولانا مفتی حمید حسن صاحبؒ ہی کی خواہش و اصرار پر مفتی صاحب نے مفتیٔ اعظم پنجاب کا یہ سرکاری منصب سنبھالا تھا، مفتی صاحب کی مدتِ کار بتیس سالہ طول طویل عرصے پر مشتمل ہے، اس مدت میں آپ کے قلم سے جو فتاوی صادر ہوئے، ان کی تعداد اچھی خاصی رہی ہوگی، افسوس ہے کہ تمام فتاوی کی نقول محفوظ نہ رہ سکی، تاہم محفوظ فتاوی ابھی حال ہی میں ''منتخب فتاوی'' کے نام سے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آگئے ہیں، جن کی ترتیب وتحشیے کا کام مفتی صاحب کے معاونِ خصوصی اس حقیر کے محبّ واثق برادرم مفتی عبدالملک صاحب قاسمی مظفرنگری نے بڑی محنت کے ساتھ کیا ہے۔

آپ کے فتاوی اور آپ کے دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے فتاوی میں ہر اعتبار سے بڑی مماثلت وہم آہنگی ہے، جس کا اعتراف متعدد مشاہیر اہلِ فتاوی نے کیا ہے۔ آپ کی فقہی خدمات کو مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مفتی سید احمد علی سعید سابق مفتی دارالعلوم دیوبند، مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ سابق نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومٹوی سابق شاہی امام وخطیب جامع مسجد وعیدگاہ مالیرکوٹلہ، امیرِ شریعت مولانا ولی رحمانی مدظلہم اور فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی وغیرہ متعدد اہلِ علم نے سراہا ہے۔

ان فقہی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ نے پنجاب میں بالخصوص اور ملک بھر میں بالعموم وعظ وخطابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا۔ آپ کے اکثر مواعظ ٹیپ ریکارڈ پر

محفوظ ہیں۔ابھی حال ہی میں آپ کے مواعظ پر مشتمل ایک جلد ''بیاناتِ عثمانی'' کے نام سے چھپی ہے، باقی کا کام بڑی تیز گامی کے ساتھ جاری ہے۔ادھر چند ماہ قبل اوائلِ مارچ ۲۰۱۸ء میں حضرت مفتی صاحب مدظلہم لدھیانہ تشریف لائے اور احقر کی خواہش پر باوجود ضعف و علالت کے مسجد عمر فاروقؓ پنجابی باغ ٹبہ روڈ لدھیانہ میں ''اسلام میں تزکیۂ نفس کا مقام'' کے موضوع پر بڑا تفصیلی، جامع اور پر مغز خطاب فرمایا، یہ بیان جو تقریباً بیالیس منٹ تک جاری رہا، احقر نے بلفظہٖ قلم بند کرلیا ہے۔یہ بیان حضرت کے خطبات کی دوسری جلد کا حصّہ بنے گا۔ان شاءاللہ

خدا کرے حضرت مفتی صاحب کی حیات ہی میں علوم و معارف اور حقائق و دقائق کا یہ انمول خزینہ طباعت کے مراحل سے گزر کر عوام و خواص کے استفادے کا ذریعہ بن جائے۔

مفتی ارتقاءالحسن رقی کاندھلوی مدظلہم حال مفتیٔ اعظم پنجاب

خاندانِ کاندھلہ وہ عظیم خاندان ہے جس کے ذی علم و فضل افراد سے اللہ تعالیٰ نے عالمی سطح پر اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام لیا۔مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ، مولانا محمد اسماعیل کاندھلویؒ، بانیٔ تبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، مولانا یوسف صاحب کاندھلویؒ، مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اس خاندان کے وہ یگانۂ روزگانہ افراد ہیں جن کے نام و کام سے ایک جہاں واقف ہے اور جن کے روشن کارنامے آج بھی مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مفتی ارتقاءالحسن رقی مدظلہم اسی عبقری و تاریخی خاندان کے ایک نامور فرد ہیں۔چونتیسویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔یہ بات مبنی بر حقیقت و صداقت ہے کہ خاندانی اثرات و خصائص نسل در نسل

جاری رہتے ہیں۔تاریخ کا ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناتے یہ بات پورے شرحِ صدر کے ساتھ لکھی جاتی ہے کہ اس خاندان کے جلیل القدر علما وبزرگانِ دین کے سوانح وخدمات اس بات پر شاہدِ عدل ہیں کہ وہ صدیقی رنگ میں مکمل طور پر رنگے ہوئے تھے اوران کی حیاتِ طیبہ کا وہ واحد مقصد ہرطرح وہر وقت دین کی خدمت ونصرت تھا۔

مری زندگی کا مقصد ترے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی
(علامہ اقبال)

سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زبان حق ترجمان سے نکلے ہوئے تاریخی جملے "اینقص الدین و انا حی" پراس خانوادے نےجس طرح عمل درآمد کیا،وہ تاریخ کاایک روشن باب ہے۔

مفتی ارتقاء الحسن صاحب ۱۹۷۹عیسوی کو پیدا ہوئے۔خاندانی روایت کے مطابق آپ کواوائل عمرمیں دینی علوم کی تحصیل پرلگادیا گیا،ابتداءسےعربی اول تک کی تعلیم مدرسہ کاشف العلوم بنگلے والی مسجد مرکز نظام الدین دھلی میں حاصل کی اوراس وقت کےجلیل القدرعلماءمولاناشبیرصاحب میواتیؒ،مولاناعبدالرشیدصاحب،مولانا عبدالرحیم صاحب مدظلہم،مولاناالیاس صاحب بارہ بنکوی،مولاناریاض صاحب بارہ بنکوی اورمولانایعقوب صاحب سہارنپوریؒ وغیرہ کےسامنے زانوئےتلمذ تہ کیے۔ عربی دوم سےعربی پنجم تک کی تعلیم علی گڈھ میں،مدرسہ لطفیہ اوپرکوٹ علی گڈھ اورعلی گڈھ مسلم یونیورسٹی کےجیداساتذہ سےحاصل کی،جہاں شعبۂ دینیات میں آپ کے والدمرحوم بہ حیثیت پیش امام زمانۂ درازتک خدمات انجام دیتے رہے۔اس کے بعد

ایشاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند آپ کی تعلیمی منزل قرار پائی؛ چنانچہ بعد ازاں تکمیلِ افتاء تک کے تعلیمی مراحل یہیں طے ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی کی خصوصی توجہات حاصل رہیں۔ حضرت مولانا آپ کی تعلیمی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں ودعا گو رہے، زمانۂ طالب علمی میں حضرت مولانا کے آپ کی بابت چند تأثرات سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مفتی صاحب کے مستقبل کے حوالے سے بہت سی نیک توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ مفتی ارتقاء الحسن صاحب نے بھی اپنے اکابر اساتذہ کی زیرنگرانی بڑی کامیابی کے ساتھ تعلیمی سفر طے فرمایا اور تقریباً ہر سال پوزیشن کے ساتھ پاس ہوئے اور اس طرح اکابر اساتذہ کی توجہات وعنایات (جو ایک عظیم المرتبت خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے آپ کو ابتداء ہی سے حاصل تھیں) میں اور اضافہ ہوتا رہا اور بزرگانہ دعائیں آپ کا خوب خوب نصیبہ بنیں۔

فراغت کے بعد پانچ سال کے قریب آپ مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلویؒ مدظلہم کے قائم فرمودہ مدرسہ اسلامیہ سلیمانیہ عیدگاہ کاندھلہ میں مدرس رہے۔ آپ کے اس دور کے کئی شاگرد دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور جامعہ امینیہ دہلی وغیرہ مرکزی اداروں سے فارغ التحصیل ہیں اور ان میں سے بعض کے ساتھ راقم الحروف کے دوستانہ وعزیزانہ تعلقات قائم ہیں۔ بلا استثناء وہ سب حضرات اپنے استاذ محترم مفتی ارتقاء الحسن صاحب رقی کاندھلوی کی تدریسی صلاحیتوں کے قائل ومعترف ہیں اور اپنے استاذ گرامی قدر سے بے پناہ محبت وعقیدت بھی رکھتے ہیں، جو ان کے جذبۂ خیر خواہی اور طلبہ کی استعداد کو مستحکم بنانے کی خاطر اپنی جملہ توانائیاں صرف کردینے کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔

آج سے کوئی تیرہ چودہ سال پہلے آپ اپنے موجودہ بزرگِ خاندان مولانا

افتخار الحسن کاندھلوی مدظلہم اور والد ماجد مولانا اجتباء الحسن کاندھلوی صاحبؒ کے حکم و ایماء پر بہ حیثیت مفتیٔ اعظم پنجاب مالیر کوٹلہ تشریف لے آئے، جب سے اب تک پنجاب ہی میں رہ کر ملکی وقومی سطح پر دینی خدمات کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۲۲/دسمبر ۲۰۰۶ عیسوی کو مفتیٔ اعظم کے منصب پر آپ کا تقرر عمل میں آیا؛ لیکن باضابطہ دارالافتاء کے پلیٹ فارم سے آپ کی خدمات کا آغاز ۱۲/فروری ۲۰۰۷ عیسوی کو ہوا۔ تقرر کے اگلے روز ۲۳/دسمبر ۲۰۰۶ عیسوی کو آپ سفرِ حج پر تشریف لے گئے، جس کا پروگرام پہلے سے طے شدہ تھا۔ ۱۰/فروری کو سفرِ حج سے واپسی ہوئی اور ۱۱/فروری کو بھی دارالافتاء بند رہا؛ کیونکہ اس تاریخ کو پنجاب بھر میں الیکشن تھے اور دارالافتاء کے حکومتی انسلاک کے باعث عام حکومتی اداروں اور محکموں کی طرح دارالافتاء کے بند رکھے جانے کی روایت بھی قدیم سے چلی آرہی ہے۔ ۱۲/دسمبر کو آپ نے دارالافتاء سے متعلقہ امور کو انجام دینا شروع کیا۔ ۱۲/سال کے اس عرصے میں آپ کے ذریعے جو خدمات انجام پائیں، ان کے لیے کئی صفحات وساعات درکار ہیں۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد مفتی ارتقاء الحسن صاحب منصبِ افتاء پر فائز ہوئے، مفتی ہلال عثمانی صاحب کے بعد دارالافتاء کے سابقہ وقار کو برقرار رکھنے کے لیے جس اعلیٰ وبلند معیار کی شخصیت درکار تھی، لاریب مفتی ارتقاء الحسن صاحب اس معیار پر کھرے اور پورے اترے ہیں اور ہر طرح اس منصب کا اہل اور لائق ثابت ہوئے ہیں۔ مفتی ارتقاء الحسن کاندھلوی مدظلہم کو من جانب اللہ عوامی مقبولیت بھی خوب حاصل ہوئی، پچھلے بارہ تیرہ سال سے باشندگان پنجاب کی دینی رہنمائی کا فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ عوام میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ لگانے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ بعض جگہوں پر ان کی چند ایک مرتبہ کی

حاضری اور وعظ ونصیحت کے طفیل وہاں کے عوام برسوں سے رائج بدعات وخرافات سے تائب ہوئے۔

خدائے کریم نے تحریر وتقریر کی لائق رشک صلاحیت سے نوازا ہے۔آپ کی تحریر کی طرح تقریر بھی حد درجہ مقبول ہے، وہ جہاں کہیں عوام یا خواص کے مجمع میں گویا ہوتے ہیں تو سامعین ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔موضوع دینی ہو یا دنیوی ان کی تقریر وتحریر کی روانی ہر جگہ برقرار رہتی ہے۔

مفتی ارتقاء الحسن صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو پر ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے۔ملک کے متعدد رسائل وجرائد میں شائع شدہ سینکڑوں مضامین جہاں ان کی تحریری صلاحیتوں کا گواہ ہیں، وہیں دوسری طرف متعدد فقہی سیمیناروں میں ان کی شرکت اور فقہی مسائل کے حل کے حوالے سے فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم جیسے فقہاء کا ان پر اعتماد واطمینان ان کے فقہی رسوخ کا پتہ دیتا ہے۔

عظیم صلاحیتوں کے باوصف، تواضع وانکسار آپ کا اصل جوہر اور بڑی پہچان ہے، جس کا اندازہ قریب آنے کے بعد زیادہ ہوتا ہے۔

اللہ رب العزت مزید اخلاص کے ساتھ یہ سفر جاری رکھنے کی ہمت وطاقت عطاء فرمائے۔

○❖○

مدرسہ تعمیرِ سیرت

مالیر کوٹلہ آمد کے بعد مفتی ہلال عثمانی مدظلہم نے مدرسہ تعمیر سیرت کے نام سے ایک مدرسہ کا آغاز کیا۔ مقصد یہ تھا کہ پنجاب جو تقسیم کے بعد دینی اعتبار سے بالکل اجڑ چکا تھا، اس میں از سرِ نو اسلام اور اسلامی تعلیمات کی آبیاری کے لیے نسلِ نو کو تیار کیا جائے، بحمد للہ شروع ہی میں اس کے خاطر خواہ ثمرات و نتائج برآمد ہوئے، بالکل ابتدا میں تین سو طلبہ مدرسہ میں داخل ہوئے، مقامی و بیرونی ہر طرح کے طلبہ زیرِ تعلیم تھے۔ مدرسہ کا حد درجہ افادی پہلو یہ بھی سامنے آیا کہ اس کے ذریعے جہالت زدہ پنجاب کے مختلف اطراف و اکناف کے حالات بھی معلوم ہوئے؛ چناں چہ مدرسے میں داخل طلبہ کے سرپرستان کی یہاں گاہ بہ گاہ حاضری ہوتی اور ان کی زبانی پنجاب کی دینی پس ماندگی کے حیرت انگیز واقعات سے آگہی حاصل ہوتی رہتی۔ مدرسہ میں تین چار طالب علم بھٹنڈہ کے رہنے والے تھے، ان کے سرپرستوں نے اپنے علاقے کے ابتر حالات کی خبر دینے کے ساتھ مفتی صاحب کو بہ ذاتِ خود وہاں کا سفر کرنے اور اس طرح حالات کا قریب سے جائزہ لینے کی فرمائش کی۔ مفتی صاحب نے اس فرمائش کی تعمیل میں وہاں جا کر جو حالات کا اپنے طور پر جائزہ لیا، تو واقعی مسلمانوں کی دینی بے خبری کے بڑے بھیانک نمونے دیکھنے کو ملے۔ بغیر نکاح کیے مرد و زن شوہر بیوی کے سے تعلقات رکھتے تھے، اس رسم کو ادا کرنے کے لیے صرف گلے میں پھولوں کا ہار وغیرہ ڈال دیا جاتا تھا، گویا یہی ان کے یہاں نکاح کا کافی طریقہ تھا۔

مفتی صاحب نے وہاں کے لوگوں کو سمجھایا اور صحیح نکاح پڑھانے کا طریقہ بتلا کر پھر سے وہاں اس کا اجراء کیا، پھر آپ صرف اسی پر مکتفی نہیں ہوئے؛ بلکہ وہاں رائج بدعات وخرافات کے کامل سدِّ باب کے لیے اور صحیح دینی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ بھیجا، جنھوں نے وہاں مکتبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو دین متین کی اہم اور موٹی موٹی باتوں سے بہ طورِ خاص روشناس کرایا، پھر مدرسہ تعمیر سیرت میں زیرِ تعلیم وہاں کے طلبہ اپنے علاقے میں دینی تعلیم کی نشر واشاعت کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔

طلبہ کی اچھی خاصی تعداد دینیات کی تعلیم حاصل کر کے رخصت پذیر ہوئی، بہتوں نے قرآن کریم ناظرہ مکمل کیا اور حفاظ قرآن بھی اس ادارہ سے پیدا ہوئے۔ اس دور کے لحاظ سے اس ادارے کا وجود بسا غنیمت تھا۔اس ادارے کا انتظام و انصرام کل پندرہ سال حضرت مفتی صاحب سے متعلق رہا۔

مساجد کی آبادکاری میں مفتیٔ اعظم کا کردار

مفتی صاحب مدظلہم جس وقت اس شہر میں تشریف لائے تھے، اس زمانہ میں شہر کی مساجد کی تعداد سو کے قریب تھی، جن میں سے زیادہ تر مساجد خستہ حال تھیں، مسجدوں میں آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ امام وہ لوگ تھے جن کا کام مُردوں کو نہلانا تھا، برائے نام امام تھے، جو تھوڑی سی سورتیں یاد کر لیتے تھے اور انہیں کے سہارے ان کی امامت قائم تھی۔ جمعہ کا خطبہ بجائے عربی زبان کے پنجابی اور سندھی زبانوں میں اپنی طرف سے کچھ مل ملا کر ایک طرح سے کام نکالا جاتا تھا۔ تقریروں میں اصل دینی موضوعات پر گفتگو کے بجائے یوسف زلیخا اور طوطا مینا وغیرہ قصے مبالغہ آرائی کے ساتھ سنائے جاتے تھے۔ مفتی صاحب مدظلہم نے لوگوں کو مساجد کا نظام بہتر بنانے کی

جانب راغب کیا اور آپ کی کوششوں سے مساجد کو صحیح العقیدہ دینی تعلیمات سے واقف ائمہ نصیب ہوئے۔اس سلسلے میں آپ کے ادارے مدرسہ تعمیر سیرت نے بڑا اہم رول ادا کیا۔

اس دور کی مساجد کی خستہ حالی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ محمدی مسجد بس اسٹینڈ جو بالکل قلبِ شہر میں واقع ہے، یہ بھی اس دور میں بالکل ویران پڑی ہوئی تھی۔مسجد کی اچھی خاصی جگہ کو غیر مسلموں نے ناجائز طور پر قبضہ رکھا تھا۔افسوس ناک پہلو یہ بھی رہا کہ یہاں کے مسلمان تقسیم کے بعد اس درجہ خوف زدہ تھے کہ اس طرح کے ناجائز قبضے ہٹانے کے حوالے سے کوئی مضبوط ایکشن لینے کی سکت ان میں بالکل بھی باقی نہ رہی تھی؛ اس لیے بڑی جرأت وہمت کے ساتھ یہاں بڑے بڑے کام نمٹانے کی ضرورت تھی اور یہاں کے مسلمانوں کو اس نازک ترین صورتِ حال سے نکالنے اور صحیح دینی تعلیمات سے روشناس کرانے کی ضرورت تو پہلے سے تھی ہی۔محمدی مسجد کی جگہ پر ناجائز قبضے کے خلاف مفتی صاحب نے آواز بلند کی اور اس وقت کے ایس ڈی ایم کے سامنے یہ مطالبہ بڑی مضبوطی کے ساتھ رکھا۔اس نے شروع میں ایسا کرنے سے بہ وجوہ معذرت ظاہر کی تو آپ نے اس سے صاف صاف کہا کہ ”دیکھیے اس شہر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور معاملہ بہ راہِ راست ان کی عبادت گاہ سے جڑا ہوا ہے،اس لیے حالات خراب ہونے کا قوی امکان ہے۔“ دوسری طرف سنجیدگی کے ساتھ آپ نے اس سے یہ بھی کہا کہ آپ ابھی لدھیانہ سے مالیرکوٹلہ میں نئے نئے آئے ہیں،ابھی آپ کو اور ترقی کرنا ہے اور اوپر کی پوسٹ حاصل کرنی ہے،عوامی اعتماد کے سہارے یہ سب کچھ ہوگا،اس کے لیے عوام کے درمیان امن وامان اور بھائی چارے کی فضا بنائے رکھنا آپ کی بہت بڑی اور اہم ذمہ داری ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی؛اس نے مسئلہ کے حل کی یقین دہانی کرائی اور پھر اللہ کا شکر ہے کہ وہ جگہ

مسجد ہی کے حصے میں آئی اور مسلمانوں نے اس کی تعمیرِ جدید میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آج یہ مسجد حسن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

آج کا مالیر کوٹلہ اُس دور کے مالیر کوٹلہ سے بالکل مختلف ہے،اب مساجد خوب آباد ہیں، مدارس بھی بہ کثرت ہیں، حالات بھی نسبتاً سازگار ہیں، پہلے یہاں غربت تھی،۱۹۸۰عیسوی کے بعد یہاں کے مسلمانوں میں معاشی استحکام آنا شروع ہوااور اب تو یہاں کی مسلم اکثریت الحمدللہ بہت خوش حال ہے۔

دارالسلام اسلامی مرکز

۱۹۸۶ءمیں حضرت مفتی صاحب نے دارالسلام اسلامی مرکز کی بنیاد رکھی،جس کا دائرہ کار ملکی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔اس ادارے نے تعلیم،اسلامی تحقیق اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف تعلیم کے شعبے میں اب تک ہزاروں طلبہ وطالبات دارالسلام سے سند فراغت حاصل کر چکے ہیں۔اس میں تعلیم کا طریقہ روایتی مدرسوں سے مختلف اور بالکل جداگانہ ہے۔ دارالسلام کے تحت دینی تعلیم کے لیے فاصلاتی نظام تعلیم (Distance Education) متعارف کرایا گیا،جس میں فضیلت تک کی تعلیم کا نظم ہے۔اس مقصد کے لیے ملک بھر میں دارالسلام کے مراکز قائم کیے گئے،جن کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے۔ان کورسز کو مختلف یونی ورسٹیوں سے منظور کرایا گیا،تاکہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ دارالسلام کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس کی سند پر یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ کا یہ ایک ایسا انقلابی کارنامہ ہے،جس کی وجہ سے مدارس کے طلبہ کو یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم ہوئے۔اس ذریعے سے

اب تک کم و بیش دس ہزار طلبہ وطالبات دارالسلام سے سندِ فراغت حاصل کر چکے ہیں۔دارالسلام کے فاضل بے شمار طلبہ مختلف یونی ورسٹیوں سے ایم فل اور ڈاکٹریٹ تک کی ڈگریاں حاصل کر کے اچھے عہدوں پر فائز ہوئے ہیں۔سینکڑوں طلبہ وطالبات دارالسلام کی سند کی بنیاد پر بی یو ایم ایس کر کے ڈاکٹر بن چکے ہیں اور ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

تحقیق کے شعبے میں بھی دارالسلام نے کئی مثالی کام کیے ہیں۔سب سے پہلا اور بڑا کام حضرت مفتی صاحب نے جو کیا، وہ تھا اسلامی قانون کی موجودہ قانونی کتابوں کی طرز پر دفعہ وار تدوین۔یہ ایسا کام تھا، جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔اس کام کا خیال مفتی صاحب کو مشہورِ زمانہ شاہ بانو کیس میں اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے ملاقات کے وقت آیا، جب راجیو گاندھی نے ایسی کتاب کی فرمائش کی، جس کے ذریعے قانونِ شریعت کو آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکے۔حضرت مفتی صاحب نے فوراً اس پر کام شروع کر دیا اور پھر بہت کم وقت میں ''اسلامی قانون: نکاح، طلاق ،وراثت'' کے نام سے دارالسلام نے کتاب شائع کر دی، جس میں اسلامی قانون کی دفعہ وار تدوین عدالتوں میں رائج قانونی کتابوں کی طرز پر کی گئی تھی۔ مفتی صاحب کا یہ ایسا علمی کارنامہ اور ایسی عظیم دینی خدمت ہے جس کے لیے انہیں فیصل ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا،لیکن مفتی صاحب مد ظلہم کے کردار کا خاص وصف یہ رہا ہے کہ آپ کبھی عہدوں اور انعامات کے پیچھے نہیں بھاگے۔

اس کے علاوہ شعبۂ تحقیق میں حضرت مفتی صاحب نے سیرت طیبہ پر تحقیقی کام کیا اور ''معمار انسانیت'' کے نام سے رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر ایک ضخیم کتاب شائع کی،اس کے علاوہ تقریباً تیس مزید کتابیں مختلف عنوان پر دارالسلام سے شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔

دعوت وتبلیغ کے شعبے میں دارالسلام نے ۱۹۸۸ء میں ایک رسالہ ''ماہنامہ دارالسلام'' جاری کیا جو بائیس سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا، علمی حلقوں میں اس رسالے نے اپنی الگ پہچان بنائی اور ہر جگہ مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ دعوتی اسفار اورخطابات ولیکچرز کا سلسلہ ۲۰۱۶ء تک متواتر چلتا رہا۔ علالت اور شدید ضعف کے باوجود الحمدللہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق مفتی صاحب مدظلہم کے کم وبیش ایک لاکھ لیکچرز ہیں، جو ملک وبیرون ملک مختلف موقعوں پر دیے گئے، یہ اپنے آپ میں ایک مثالی کارنامہ ہے۔

تفسیر نور القرآن

ایک عظیم ومثالی خدمت

ہند میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ یوں تو قدیم سے جاری ہے؛ مگر قرآن کریم کی اردو و فارسی تفسیر کا جو زریں سلسلہ امام الہند شاہ ولی اللہ کے خاندان سے شروع ہوا، وہ الحمدللہ مابعد کے ادوار میں خوب پھیلا اور پھولا؛ چناں چہ ولی اللٰہی فکر کے امین وترجمان یہاں کے علما نے فارسی واردو ہر دو زبان میں متعدد تفاسیر لکھیں، جن کا کماحقہ احصا بھی مجھ جیسے نابکار کے لیے ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے،اس حوالے سے علمائے دیوبند کی خدمات سب سے فائق وممتاز ہیں،جس کی تفصیلات مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلویؒ کی کتاب ''علماء دیوبند کی تفسیری خدمات''میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

تقسیم ہندوپاک کے بعد بھی یہ مبارک ومسعود سلسلہ جاری ہے، البتہ یہاں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ تقسیم سے قبل کی جو تفسیر بھی تادمِ تحریر موجود ہے یا کتبِ تاریخ میں جس کا ذکر ملتا ہے، وہ زیادہ تر کسی نہ کسی فردِ واحد ہی کے ذریعہ لکھی گئی ،جبکہ تقسیم کے بعد کے ہندوستان میں جتنی تفاسیر منظرِ عام پر آئیں، وہ کئی افراد کی مشترکہ محنتوں کا نتیجہ ہیں۔تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض ہے کہ ایسی تفاسیر میں ایک تفسیر ''اظہار القرآن'' بھی ہے،جس کی از اول تا آخر مکمل تصحیح کا کام اللہ رب العزت نے مجھ ایسے ظلوم وجہول سے لیا۔خدا کرے یہ حقیر سی خدمت اس سیاہ کار کے لیے اُخروی نجات کا ذریعہ بن جائے۔اس تفسیر میں حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف

علی صاحب تھانویؒ کا بامحاورہ ترجمہ اور اس کے ساتھ مفسرِ قرآن حضرت مولانا انیس احمد آزاد قاسمی بلگرامی نقشبندی مدظلہم کا لفظ بہ لفظ ترجمہ، دونوں ہی ترجمے شامل ہیں اور تفسیر حد درجہ آسان اور قریب الفہم ہے، یہ تفسیر دس جلدوں میں چھپ کر منظرِ عام پر آ گئی ہے۔ **فالحمد للّٰہ علی ذلك۔**

بہ ہر کیف: تقسیم کے بعد ایسی متعدد تفاسیر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں، جن کے تراجم میں یا ان کے تفسیری افادات میں شرکت پائی جاتی ہے، دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے کسی ہندی عالم کی کوئی ایسی کامل تفسیر نظر سے نہیں گزری، جس کا ترجمہ و تفسیری افادات دونوں اسی کے تحریر فرمودہ ہوں۔ جزوی طور پر تفسیری کام ضرور ہوا اور ہو رہا ہے اور انشاء اللہ ہوتا رہے گا، مگر مذکور الصدر بات کا تعلق کسی فردِ واحد کی کامل و مکمل تفسیر سے ہے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم گذشتہ بیس سالوں سے ہمہ تن اس تفسیری کام کی طرف متوجہ تھے اور اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ آپ کے قلم سے لکھی جانے والی یہ تفسیر مکمل ہو کر ابھی حال ہی میں شائع ہوئی اور اس طرح تقسیمِ ہند کے بعد تفسیری کام کے حوالے سے جو تعطل چلا آ رہا تھا، وہ آخر ش ٹوٹا۔

بلاشبہ یہ ایک مثالی خدمت ہے، جس کے لیے من جانب اللہ مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کا انتخاب عمل میں آیا۔ تفسیر نور القرآن نے علمی دنیا سے خوب خوب خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

آپ کے شیخ و مرشد، دار العلوم وقف دیوبند کے سابق صدر مہتمم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا کے بورڈ کے سابق نائب صدر خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ اس تفسیر کی بابت رقم طراز ہیں:

”دورِ حاضر کی برق رفتار مادی ترقیات نے نوجوان نسل کے اندازِ فکر و نظر پر

ایجابی وسلبی بہر دوطریقوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ایجابی پہلو یہ ہے کہ مخالفانہ و معاندہ پروپیگنڈے کے نتیجہ میں عالمی سطح پر قرآن کریم اوراس کی تعلیمات کی تفہیم و تحقیق کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔سنجیدہ مطالعے کے نتیجہ میں عالمی سطح پر بالعموم اور مغربی دنیامیں بالخصوص قبولیت اسلام کا نوجوانوں میں رجحان کا اضافہ معاندین ومخالفینِ اسلام کے لیےتشویش اورفکری انتشار کا باعث بنا ہوا ہے۔مختلف رسائل واخبارات میں اس تعلق سے شائع ہونے والی مختلف رپورٹوں سے حیرت انگیز نتائج گذشتہ دو دہائیوں سے مسلسل سامنے آرہے ہیں اور اس کا سلبی پہلو یہ ہے کہ اسلام اوراس کی تعلیمات کے برخلاف سوشل میڈیا سمیت دیگر ذرائعِ ابلاغ کے منفی تبصروں اور پروپیگنڈہ کے نتیجے میں شکوک وشبہات، ابہام واحتمالات کوفروغ ملا جس کے بہ راہ راست منفی اثرات سے نوجوانوں کا ایک طبقہ متاثر نظر آتا ہے۔آخرالذکر طبقے میں اسلام کی تعلیمات کے تعلق سے نوجوانوں میں عہدِ حاضر کی فکری پرواز کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاحِ احوال کی ذمہ دارانہ کوشش وکاوش اور خاص طور پر رجوع الی القرآن اورقرآن کریم کی سلیس و سادہ انداز میں تفہیم موجودہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

گذشتہ چندسالوں سے مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب صدر مفتی دارالعلوم وقف دیوبند اس ناچیے سے تفسیر پرکام کررہے تھے اور مجھے اس کے منصۂ شہود پر آنے کا دیر سے انتظار تھا،جس کے بارے میں مفتی صاحب سے اکثر بہ وقتِ ملاقات استفسار بھی کیا کرتا تھا۔حق تعالی کا شکر وفضل ہے کہ موصوف محترم کی یہ عرق ریز کاوش ”تفسیر نورالقرآن“ سے معنون ہوکر منصۂ شہود پر آ گئی ہے۔

دعا گو ہوں حق تعالی موصوف کی اس گراں قدر علمی خدمت کو قبولیتِ عامہ سے سرفراز فرماتے ہوئے اس وقیع تر کام کو حضرت مفتی صاحب کے ساتھ تمام شرکاءکار کے لیے ذخیرۂ آخرت اور وسیلۂ نجات بنائیں''۔

ادارہ دار السلام نے تفسیر نور القرآن کا تعارف بایں الفاظ کرایا ہے:

☆ ''تفسیر نور القرآن دورِ جدید کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے والی ایک ایسی تفسیر ہے، جس میں تفسیری اور فقہی بحثوں میں پڑے بغیر صرف قرآن کے اصل پیغام کو سامنے رکھا گیا ہے۔اس کا رنگ دعوتی ہے اور یہ بات بھی پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ ہر طبقے، ہر مکتبِ فکر، ہر مسلک کے لوگ بلاتکلف اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ غیر مسلم بھائیوں کے دلوں پر بھی کلامِ الٰہی کی دستک پہنچ سکے اور یہ جداگانہ ومنفرد طرزِ تفسیر اس لیے بھی اہم ہے کہ قرآن مجید بہ شمول اہلِ ایمان تمام انسانوں کے لیے کتابِ ہدایت ہے،اس کا خطاب تمام بندوں سے ہے، وہ ہر ایک کے دل پر دستک دیتا ہے،اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے،اس کی فطرت کو جھنجھوڑتا ہے،اس کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے،وہ عقل کو بھی خطاب کرتا ہے، جذبات سے بھی بات کرتا ہے اور دلوں کو بھی پکارتا ہے۔

☆ قرآن مجید کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہوکر اپنی بات روح کی گہرائی تک پہنچادیتا ہے،یہ تفسیر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

☆ اس تفسیر کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ کہیں بھی حقائق سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کی گئی ہے،صداقت کو صداقت کی طرح پیش کردیا گیا ہے۔

☆ اس تفسیر کا ایک بہت اہم پہلو جو قابلِ غور ہے، وہ ربطِ آیات اور تسلسل مسلسل ہے، اگر آپ بغیر قرآن مجید کے متن کے اس تفسیر کو پڑھتے چلے جائیں،تو

آپ کو ایسا لگے گا کہ آپ ایک مربوط کتاب پڑھ رہے ہیں، بیچ میں آپ کو کوئی خلا محسوس نہیں ہوگا۔

☆ اگر کسی قصّے یا آیت کے بارے میں مختلف تشریحات اور اقوال پائے جاتے ہوں، تو اس تفسیر میں صرف ایک منتخب اور معتبر قول کو ہی لیا گیا ہے؛ تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں مختلف اقوال نقل کرنے سے انتشار پیدا نہ ہو۔

☆ قرآن مجید کا ترجمہ ہر لفظ کا الگ الگ بھی دیا گیا ہے، تاکہ عربی زبان کے نہ جاننے والے کو معلوم ہو جائے کہ کس لفظ کے کیا معنی ہیں، اس کے بعد پوری آیت کا بامحاورہ ترجمہ لکھا گیا ہے۔

☆ اندازِ بیان میں سادگی، ندرت اور ادبی چاشنی جگہ جگہ محسوس ہوگی، کہیں کہیں مناسب شعر لاکر اپنی بات کو مؤثر بنا دیا گیا ہے۔

☆ اس تفسیر کی کمپیوٹر کتابت کی تصحیح وسیٹنگ کا کام برادرِ عزیز مفتی انیس الرحمٰن قاسمی دہلوی نے بڑی ہی عرق ریزی اور دل جمعی وجانفشانی کے ساتھ بہ حُسن وخوبی انجام دیا ہے، اس کے علاوہ آپ کو مفتی صاحب کی اور بھی کئی کتابوں کی کمپیوٹر کتابت، تصحیح وسیٹنگ کے کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

☆ عالم اسلام کے معروف عالمِ دین حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دامت برکاتہم کی سات جلدوں اور چار ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل یہ تفسیر بیس سال کی محنت کا ماحصل ہے۔ یہ تفسیر موجودہ حالات میں اپنے مختلف گوشوں کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ رب کے پیغام کو غیر اردو داں طبقے تک پہنچانے کے لیے اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

☆ اس کے علاوہ تفسیر نور القرآن کو آڈیو پر لانے کا کام الحمدللہ شروع ہو چکا ہے، ٹورنٹو کنیڈا میں مقیم جناب احمد عمار صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، احمد صاحب انشاء اللہ مکمل تفسیر اپنی آواز میں پیش کریں گے، احمد عمار عرصے سے سعودی عرب میں مقیم تھے اور اب کنیڈا کی ایک بڑی فرم میں ڈائریکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں، ماشاللہ بہت باصلاحیت، دیندار اور صالح نوجوان ہیں''۔

نبیرۂ حکیم الاسلام و جانشینِ خطیب الاسلام حضرت مولانا سفیان صاحب قاسمی مدظلہم مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند نے اپنی طویل تقریظ میں قرآن مقدس کی آفاقیت و جامعیت پر سیر حاصل گفتگو کے بعد آخر میں تفسیر اور صاحبِ تفسیر کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

''زیرِ نظر تفسیر ''نور القرآن'' کا مدارِ انفرادیت قرآن کریم کے ہر لفظ کے الگ الگ معانی، بامحاورہ ترجمہ، جامع تشریح و وضاحت، آیت نمبر کے مطابق تفسیر و تشریح، مضامین کے جامع عناوین اور مضامین کا تعارف و خلاصہ ہے۔ مذکورہ نقطہ ہائے نظر سے زیرِ مطالعہ تفسیر عوام الناس کے لیے بالعموم اور طلبۂ مدارس کے لیے بالخصوص وقیع تر اور مفید ہے۔

☆ اس تفسیر کے مفسر جناب حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دامت برکاتہم صدر مفتی و رکنِ تاسیسی مجلسِ مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند جو کہ اپنے استحضارِ علم و آگہی اور فکری تعمق و تدبر کے ساتھ سلیس اور سادہ انداز میں کلمو الناس علی قدر عقولہم کے ضابطے کے مطابق علمی موضوعات پر موصوف محترم کی دل نشیں اندازِ تفہیم ہی علمی دوائر و اجتماعیات میں ان کی انفرادیت تصور کی جاتی ہے۔ بنا بریں یقین ہے کہ ذاتِ حق جل مجدہ

حضرت مفتی صاحب مدظلہ کو خاندانی طور پر حاصل شدہ متوارث اخلاق و
اخلاص اور للّٰہیت کے طفیل تفسیر نور القرآن کو قبولیت عامہ سے انشاء اللہ
سرفراز فرمائیں گے۔"وما تو فیقی الا باللّٰہ"

○❖○

مدارس، مکاتب اور مساجد میں جاری دینی تعلیم سے متعلق
آپ کا ایک معرکۃ الآراء تخیل

ابتدائی دینی تعلیم کی پختگی کی ضرورت واہمیت سے کسی کو انکار نہیں،یہیں سے طالبِ علم کے مضبوط یا قابلِ رحم مستقبل کی بنیاد پڑتی ہے،طالب علم کی جانب سے یا اس کے معلم ومربی کی جانب سے اس نازک واولین مرحلہ پر اگر کوئی قابلِ ذکر کمی رہ جائے،تو پھر یہ بچے کے حق میں وہ عظیم نقصان ہے،جس کی تلافی کی مثالیں عمر کی اگلی منزلوں میں نادرالوقوع نا سہی پر قلیل الوقوع ضرور ہیں۔

یہود ونصاری اور دیگر اقوامِ عالم نے اس راز کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے، چناں چہ ان کے یہاں بالکل ابتدائی درجات میں زیرِ تعلیم طلبہ کے لیے نفسیات کے بڑے ماہر اساتذہ رکھے جاتے ہیں، جو طلبہ کی تعلیم وتربیت پر اپنا سارا زور صرف کر ڈالتے ہیں،جس کے نتیجے میں طالب علم کے دل ودماغ کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، اندر کا جوہر کھل کر سامنے آجاتا ہے اور ان میں کے ہر طالب علم میں ہر طرح کے حالات سے مقابلے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہی نسلِ نو اپنے ملک کی ہر لحاظ سے تعمیر وترقی میں مثالی کردار ادا کرتی ہے۔جاپان اس کی ایک بڑی مثال ہے، جاپان پر ایک وقت آیا، جب امریکہ کے ایٹمی حملے نے اس کی کمر توڑ دی تھی اور اس کا معاشی استحکام کچھ وقت کے لیے ہی سہی، قصۂ پارینہ بن گیا تھا،بعدہ جب نشاۃِ ثانیہ کا دور آیا،تو وہاں کے ذمہ داران نے ملک بھر کے اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کو جمع کیا،جن میں پرائمری کے ٹیچر بھی شامل تھے اور ان سے اپنے دل کی یہ بات صاف صاف کہی کہ آپ کو وہ جملہ سہولیات فراہم کی جائیں گی، جو کسی بھی ملک کے منسٹر حضرات کو حاصل ہوتی ہیں اور ان سب کے عوض آپ سے ہمیں فقط اتنا چاہیے کہ آپ ملک کی نسلِ نو پر ان کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی محنت کیجیے

کہ وہ ہر شعبۂ حیات میں مثالی انسان ثابت ہوں اور اپنے ملک سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے ہوں؛ چناں چہ اس نہج پر تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سقوط کے بعد کے تیس چالیس سالوں میں جاپان نے ہر میدان میں وہ ترقیات حاصل کیں کہ دنیا حیران ہے اور صنعت کے میدان میں تو خود امریکہ کو بھی مات دے دی۔

غیر اقوام نے جس طریقِ کار کے سہارے بے پناہ دنیاوی فتوحات حاصل کیں اور کر رہی ہیں، یہ طریقِ کار دراصل کسی زمانہ میں ہمارا خود اپنا مابہ الامتیاز تھا۔

آج کے امامتِ اقوام کے مدعی امریکہ کا تو معلوم دنیا میں وجود بھی نہ تھا اور موجودہ یورپ کے باشندے پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتے تھے۔ اس وقت مسلمان جن کے اسلام کو آئے ابھی چند ہی صدیاں گزری تھیں، قرآنی حکم ''فکر و تدبر'' کے تحت اس کائنات کے رازہائے سربستہ کی کھوج میں مصروف تھے، سائنس سمیت لاتعداد علوم و فنون صرف اور صرف مسلمانوں کے ایجاد کردہ ہیں۔ قرطبہ، شام، عراق، خراسان اور بغداد وغیرہ اسلامی خطوں سے اس سلسلے کی بڑی نمایاں خدمات وجود پذیر ہوئیں۔ میڈیکل سائنس پر سب سے پہلے مستند کتابیں لکھنے کا سہرا ابن زہر اندلسی کے سر جاتا ہے، جن کی کتابوں کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، یہ تو محض ایک مثال ذکر کر دی گئی؛ ورنہ اس نوعیت کی بیسیوں مثالیں ہیں، جن کا مفصل ذکر مستقل طور پر ایک مقالے کا متقاضی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ اسلاف کا یہ تحقیقی مزاج اخلاف میں باقی نہ رہا، دولت کی افراط اور معاشی وسائل کی فراوانی نے آنے والی نسلوں کو سہل پسندی کا عادی بنا ڈالا، نتیجۃً قرآن کی عطا کردہ علمی تڑپ ان میں رفتہ رفتہ مضمحل ہوتی گئی اور مسلم سلاطین جو کسی زمانے میں خود بھی تحقیق و تدبر اور فکر و جستجو کے عادی رہے تھے، اب

وہ بھی عیش وعشرت میں پڑ کر اس راہ سے منحرف ہو گئے تھے۔گھات لگائے بیٹھی غیر اقوام کے لیے یہ زریں موقع تھا، چناں چہ یہ ایک بڑی تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ تاتاریوں کے ہاتھوں سقوطِ بغداد کے الم ناک سانحے کے بعد مسلمانوں کا مختلف علوم وفنون پر حاوی بیش قیمت کتابی ذخیرہ زیادہ تر تو دریا کی نذر کر دیا گیا اور بچا کھچا غیروں کی علمی لائبریریوں کی زینت بنا۔بس اس ذخیرہ کو اور دیگر علاقوں کے محقق اہلِ اسلام کی سائنٹفک علوم پر مشتمل کتابوں کو آج کی ان مادہ پرست اقوامِ مغرب نے اپنے کام کی بنیاد بنایا اور ان علوم کی تحصیل پر بڑی شدید محنتیں کیں، ان کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا اور پھر اختراعات وایجادات کا سلسلہ شروع ہوا، جو تادمِ تحریر پورے آب وتاب کے ساتھ جاری ہے، اس پورے پسِ منظر میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ان کی اس ہمہ جہتی ترقی میں اصل کردار قرآن اور قرآنی تعلیمات ہی کا ہے، ورنہ ان کا مذہب ''کلیسا'' تو انہیں کسی ایسے تعمیری کام کے بارے میں سوچنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا اور ان کا کوئی بھی ہم مذہب ایسا کرنے کی صورت میں قابلِ گردن زدنی سمجھا جاتا تھا۔ پروفیسر ''ایڑورڈ کین'' جیسے چند ایک انگریز محققین نے اپنے پر اسلام اور مسلمانوں کے اس قبیل کے احسانات کا اعتراف بھی کیا ہے، مگر اکثریت کا معاملہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں اس کے بالکل برعکس ہے جو اپنے محسن اسلام کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دینے پر مصر ہے۔ **فیا للعجب**

خیر غیر تو بہ ہر حال غیر ٹھہرے، ان سے اعترافِ حقائق کی امید نے ازمنۂ ماضیہ میں بھی بہت مرتبہ دم توڑا ہے اور توحید ورسالت کے عقائد سے عاری انسانوں سے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امور کا صادر ہونا ممکن بلکہ متوقع ہے، اس لیے یہ کوئی زیادہ باعثِ تشویش امر نہیں۔غم واندوہ اور حیرت واستعجاب تو اس پر ہے کہ آج کے مسلمانانِ

عرب وعجم ان خدا بیزار مغربی ملکوں کے ہم خیال اور انہیں کے رنگ میں رنگتے جا رہے ہیں، جبکہ یہ وہ ہیں جن کے پاس قرآن وحدیث جیسا عظیم وانمول سرمایہ ہے، جنہیں اللہ رب العزت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اپنے محبوب نبی دیے ہیں، جن کے پاس مستقل تہذیب وثقافت ہے، اس سب کے باوجود وہ اغیار کی غلامی کو اکثر شعبہ ہائے حیات میں جگہ دیے ہوئے ہیں اور مرعوبیت کی انتہا یہ کہ ماضی میں چند ایک نام نہاد اسلامی ممالک امریکہ بہادر کی خوشنودی کی خاطر اسلامی احکام میں ترمیم و تاویل کرتے دکھائی دئے۔

ہمارے اسلاف اس فانی زندگی کو؛ قرآنی زندگی میں ڈھال کر دنیا وآخرت کی سعادتیں سمیٹ گئے اور ہم اس کی جگہ مغرب کو لاکر آج ذلت وپستی کے جس عمیق غار میں ہیں، اس سے ہر شخص بہ خوبی واقف ہے۔

شاعرِ مشرق علّامہ اقبال کا شعر کیسے موقع پر یاد آیا اور حقیقتِ حال کا کیا خوب ترجمان بھی ہے، آج کی ملت اسلامیہ کو انہوں نے دوٹوک کہا:

وہ معزز تھے زمانہ میں مسلماں ہوکر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

قومِ مسلم کا عروج وزوال قرآن کریم ہی کی تعمیل وعدم تعمیل میں مضمر ہے، جس پر چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ شاہدِ عدل ہے۔ بہ قول مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم امتِ مسلمہ میں اگر پھر سے دینی ودنیوی کوئی عظیم انقلاب وجود پذیر ہوگا، تو وہ صرف اور صرف قرآن اور قرآنی تعلیمات کے اپنانے سے ہوگا، بہ صورتِ دیگر اس کی ہمہ جہتی ترقی کا خواب ایک ایسا خواب ہے، جو شاید تاحشر شرمندۂ تعبیر نہ ہو۔

حضراتِ علما جو اس امت کے قائد ہیں اور امام محمدؒ کے مطابق علما ہی اس امت کی کشتی کو پار لگا سکنے کے واقعی اہل ہیں؛ اس لیے اس مایوس کن دور میں علما کی اولین

ذمہ داری ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تقویت کے لیے اپنے دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں استعمال میں لائیں اور قرآن کریم کے ساتھ ان کے مضمحل ہو چکے روحانی و قلبی رشتے کو پھر سے بحال کرنے اور مضبوط و مستحکم بنانے کی حتی المقدور کوشش کریں، ہمارے وہ علما جو مکاتب، مساجد یا مدارس میں دینی تعلیم کی تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ اپنے یہاں زیرِ تعلیم طالبانِ علوم نبوت کو اس طرز وطریق پر قرآن کریم کی تعلیم دیں کہ انہیں شروع ہی میں یہ بات علی وجہ الکمال محسوس ومعلوم ہو جائے کہ قرآن مقدس ہی ان کا اصل سرمایۂ حیات ہے، اسی میں ان کی دارین کی فوز وفلاح پوشیدہ ہے، اسی میں ان کی اور ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے، اسی سے ان کے امامتِ اقوام کے عہد رفتہ کے عود آنے کی یقین کی حد تک امید ہے اور یہ جب ممکن ہو سکے گا کہ صحتِ مخارج ورعایتِ قواعد کے ساتھ الفاظِ قرآنی کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ، نسلِ نو کے صافی قلوب واذہان کو اس کے معانی ومفاہیم کی جانب دل چسپی کی حد تک ملتفت کیا جائے۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے نزدیک اس جانب پہلے قدم کے طور پر چند اقدامات ناگزیر ہیں، جن کی تفصیل آگے ذکر کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کے طرزِ تعلیم اور پھر آگے کے نصابِ تعلیم سے متعلق حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی ایک مخصوص فکر ہے، جس کی مبسوط ترجمانی آپ نے کئی سال قبل اپنی تحریر میں کی۔ آپ کے اس فکر وخیال کی اس دور میں علمی ودینی حلقوں کی جانب سے بے حد سراہنا کی گئی تھی، حسنِ قبول کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آپ کی اس تحریر کو ملک کے تیس چالیس اخبارات و رسائل نے نقل کیا تھا۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کا یہ تخیل چوں کہ اس کتاب کے اکثر قارئین کے لیے بالکل نیا

ہے، اس لیے اس کی اہمیت ووقعت کے حوالے سے کچھ مزید روشنی ڈال دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آپ کا یہ خیال شروع ہی سے رہا ہے، دارالعلوم دیوبند میں جب آپ تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، اسی دور میں آپ نے باضابطہ اس کا تحریری خاکہ تیار فرما لیا تھا، جس کے ملاحظے کے بعد مولانا محمد میاں صاحبؒ مصنف علمائے ہند کا شاندار ماضی بڑے متأثر ہوئے تھے اور آپ ہی نے مفتی صاحب کو یہ رائے دی تھی کہ آپ اپنا یہ عظیم منصوبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے سامنے رکھئے، ان کی طرف سے منظوری مل جانے کے بعد آپ کا یہ قیمتی تخیل مضبوط بنیادوں پر عمل کی دنیا میں آسکتا ہے؛ چناں چہ مفتی صاحب نے ایسا ہی کیا اور اپنے مکان پر قاری صاحبؒ کی حاضری کے موقع سے ان کے سامنے اپنا موقف وضاحت کے ساتھ رکھا، قاری صاحبؒ نے بھی اس خیال کو سراہا اور اس کام کے لیے ایک مستقل کمیٹی بنانے کا امر فرمایا اور اس کام میں اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا، مگر قسّامِ ازل کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مفتی صاحب بہ حیثیت مفتیٔ اعظم پنجاب مالیرکوٹلہ تشریف لے آئے اور پیچھے دارالعلوم کی تقسیم کے سبب ایسے اہم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی، اس طرح یہ تخیل بس تخیل ہی کی حد تک رہا۔

ابھی چند سال قبل آپ نے پھر یہی بات بہ شکلِ تحریر دارالعلوم وقف، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ندوۃ العلماء کے ذمہ داران کے سامنے رکھی، حسبِ سابق پھر خوب پذیرائی ہوئی۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہم مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اس نصابِ تعلیم کی بہت تعریف کی اور خاص کر دارالعلوم وقف کے ذمہ داران و جملہ اساتذہ نے متفقہ طور پر اس تجویز کو منظور کیا۔ اب وہ تخیل وتجویز سپردِ قلم کی جاتی ہے، جس کے لیے یہ طویل تمہید باندھی گئی۔ وباللہ التوفیق وھو ولی التوفیق

☆ بچے کی ابتدائی عمر یہ بہت ہی قیمتی چیز ہے، یہیں سے اس کے مستقبل کی بنیاد پڑتی ہے، اس عمر میں بچہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اوراس کا اثر قبول کرتا ہے، اس عمر میں بچے کے دل و دماغ میں جیسی بھی فکر ڈال دی جائے، آگے چل کر وہی اپنا اثر دکھاتی ہے، اس لیے والدین اور بچوں کے اولین اساتذہ کی یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کی بہتر سے بہتر تعلیم وتربیت کی طرف پوری پوری توجہ دیں اور اس حوالے سے کوئی ادنی تغافل بھی ہرگز ہرگز نہ برتیں۔

حضراتِ اساتذہ بالکل ابتداء ہی میں ہر بچے کو اس طرز پر تعلیم دیں کہ وہ شروع ہی میں عربی زبان سے مانوس ہو جائے اور اسے محسوس ہو جائے کہ قرآن کریم صرف پڑھنے کی نہیں، بلکہ سمجھ کر پڑھنے کی کتاب ہے، اس کے لیے ہمیں چند طریقیں اختیار کرنے ہوں گے، ایک یہ کہ حروف شناسی کے مرحلے ہی میں بچے کو کوئی ایک آدھ عربی لفظ معنیٰ سمیت یاد کرادیا جائے۔ مثلاً ''ب'' پڑھانے کے ساتھ عربی لفظ ''بَابٌ'' بھی یاد کرادیا جائے۔ ''ت'' پڑھانے کے ساتھ عربی لفظ ''تُحْفَةٌ'' یاد کرادیا جائے۔ ہر لفظ کے ساتھ یہی عمل کیا جائے۔ شروع شروع میں تو ایسا کرنا بڑا مشکل معلوم ہوگا، مگر رفتہ رفتہ عادت بن جانے کے بعد معلم و متعلم کی طبیعت پر کوئی بار باقی نہیں رہے گا۔ اس طرح قاعدہ مکمل کرتے کرتے بچہ عربی کے سینکڑوں الفاظ یاد کر چکا ہوگا اور اگلے دو ڈھائی سال میں بہ صد شوق ورغبت قرآن کریم ناظرہ مکمل کرلے گا۔ انشاء اللہ

دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں ابتدائی تعلیم کے دوران لکھوانے کا رواج بالکل نہیں ہے، جبکہ لکھنا انسان کی فطرت وطبیعت کا اٹوٹ حصّہ ہے، ایک چھوٹے سے بچے کے ہاتھ میں کاغذ قلم پکڑا دیجئے تو وہ اس پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے خواہ الٹی سیدھی لکیریں ہی بنائے، یہ دراصل اسی فطرتِ انسانی کا ایک مظہر ہے، اس لیے بالکل ابتداء ہی میں لکھوانے کا التزام کیا جائے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ بچے کو الف با وغیرہ پڑھانے

کے بعد اسے وہ حرف لکھنے کا پابند بنایا جائے، ایک ایک حرف کے ایک ایک دو دو صفحات روزانہ لکھوائے جائیں، شروع میں بھلے وہ کرم کانٹے ہی بناتا رہے، پر یہ عمل تسلسل کے ساتھ جاری رہے۔ کچھ مدت بعد ٹوٹے پھوٹے حروف بنانے لگے گا اور آخرش ہر حرف کی صحیح کتابت پر قادر ہو جائے گا اور عمر کی اگلی منزلوں میں یہ ذوق وشوق بہت مفید ثابت ہوگا۔

تیسرے جو عربی کا لفظ بچے کو پڑھایا جائے اس کا ماڈل بھی درس گاہ میں میز وغیرہ کسی ایسی جگہ پر رکھ دیا جائے، جہاں سے وہ تمام بچوں کو بہ آسانی نظر آ جائے۔ مثال کے طور پر میم کے ساتھ میم سے شروع ہونے والا ایک عربی لفظ موز یاد کرایا اور ایک کیلا بھی میز پر رکھ دیا، اب کسی ایک بچے سے کہیے کہ ذرا موز لے کر آنا، اب بچہ اٹھ کر جب کیلے کو اپنے ہاتھ میں لے گا، تو اس سے سب بچوں کے ذہنوں میں موز یعنی کیلے کی تصویر بھی آ جائے گی اور اس طرح آنکھوں کے راستے دل ودماغ بھی کام کریں گے۔

چوتھے یہ کہ بچوں کو ہر روز دس پندرہ منٹ کسی مشہور قاری کی آواز میں تلاوتِ قرآن بھی سنا دی جایا کرے؛ تاکہ کان بھی اس آواز سے مانوس رہیں، اس کے ساتھ قرآنی آیات پر مشتمل کتبے بدل بدل کر درس گاہ کی دیواروں پر لگائے جائیں۔ بار بار نظر پڑنے سے ایک تو دلی تعلق بھی قائم ہوگا اور دوسرے یہ کہ وہ اچھی طرح یاد بھی ہو جائیں گی۔ اس پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے خود اپنا ذاتی واقعہ سنایا کہ ہمارے گھر کی دیواروں پر اشعار وغیرہ کے کئی کتبے لگے رہتے تھے اور بار بار نظر پڑنے کی برکت سے سیکڑوں اشعار مجھے بچپن ہی میں یاد ہو گئے تھے اور پھر مثال میں فرمایا کہ میرے تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے گھر میں ایک کتبے پر علامہ اقبالؒ کی رباعی لکھی تھی، جو مجھے بچپن سے یاد ہے، جس کے الفاظ ہیں:

نہ مؤمن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

اس طرزِ تعلیم میں بچے کے ہاتھ، کان اور دل و دماغ بہ یک وقت کام کرتے ہیں اور ایسی ہی تن دہی و جانفشانی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔

شخصیت پر ماحول اور لباس و پوشاک کے اثرات پڑتے ہیں؛ اس لیے بچے کو صاف ستھرے ماحول میں تعلیم دی جائے، درس گاہ اور قیام گاہ میں گندگی کو بالکل برداشت نہ کیا جائے، بلکہ اس پر ہلکی پھلکی زجر و توبیخ سے کام لیا جائے، لباس میں یکسانیت کے اصول کو سختی کے ساتھ عمل میں لایا جائے، ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد چند منٹ کے لیے چھٹی بھی کی جائے، تاکہ دل و دماغ تازہ دم رہیں اور بچہ کسی قسم کا بوجھ یا تھکان محسوس کیے بغیر تفریحی انداز میں اپنی تعلیم میں منہمک رہے۔

ایسے اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا جائے، جو ماہر نفسیات بھی ہوں اور شوق و ذوق سے اس طرزِ تعلیم و تدریس پر عمل پیرا رہیں، ورنہ یہ محنت طلب نصابِ تعلیم ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں ہے۔

مساجد، مکاتب اور مدارس میں تدریسی خدمت انجام دینے والے حضراتِ اساتذہ کا مشاہرہ کم سے کم پندرہ سے بیس ہزار کیا جائے، تاکہ وہ کامل دل جمعی کے ساتھ تدریسی خدمت انجام دے سکیں، ماضی کی ترقی یافتہ اقوام کی ترقی کا ایک راز یہ بھی رہا کہ انھوں نے اپنے مقتدا حضرات کو فکرِ معاش سے بالکل مستغنی و بے نیاز بنائے رکھا۔

ایک بات جو لکھنے سے رہ گئی، وہ یہ ہے کہ اس مذکور الصدر طرزِ تعلیم کے ساتھ قاعدہ و قرآن کریم پڑھانے کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی اردو اور کچھ دینیات نماز کا مکمل مسنون طریقہ، وضو غسل کا طریقہ، چند ایک دعائیں، احادیث اور کلمے وغیرہ یاد کرا دیے جائیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے تعلیم القرآن کے نام سے تین ریڈریں لکھیں، جن میں اس طرزِ تعلیم کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔تعلیم القرآن کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اوراب ایک مرتبہ پھر یہ کتابی سلسلہ مفید اضافوں کے ساتھ منظرِ عام پرآنے والا ہے،مکتبہ فیصل دیوبند کے منتظم جناب صہیب صدیقی صاحب اس اضافہ شدہ تعلیم القرآن کوشائع کرنے کی سعادت حاصل کرر ہے ہیں۔

اسکول اور کالج کے لوگوں نے تعلیم القرآن سے بے حد فائدہ اٹھایا، باضابطہ اسے اپنے یہاں داخلِ نصاب کیا اورایسے مدارس کی تعدادنسبتاً کم ہے۔

☆ مکتبی تعلیم کی تکمیل کے بعدآگے کےنصابِ تعلیم کی بابت مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کاخیال یہ ہے کہ یہ دوحصّوں میں تقسیم ہو۔

پہلا حصّہ ''عمومی نظام تعلیم'' کےعنوان سے معنون ہے۔یہ دس بارہ سالہ عرصے پرحاوی تعلیم کا وہ مرحلہ ہے،جس سے ہر مسلمان بچے کوگزارنا آپ کے یہاں لازم ہے۔اس کے بعدہی اپنی ترجیحات کے مطابق بچے کوکسی بھی تعلیمی میدان کے انتخاب کی اجازت دی جائے۔

اس دس یابارہ سالہ نظامِ تعلیم میں حسبِ ذیل چھ زبانوں کی تعلیم دی جائے:

(۱)عربی

(۲)فارسی

(۳)اردو

(۴)مقامی زبان

(۵)ہندی زبان

(٦)انگریزی زبان

اردو و ہندی زبانوں کی تعلیم اس نصابِ تعلیم کا جزوِلاینفک ہوگی اور بچے کا ان

زبانوں پر کامل عبور حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ کسی ہندی طالبِ علم کے ساتھ اس سے بڑھ کر کوئی خیر خواہی بھی نہیں کہ ہندی اس کی ملکی زبان ہے، جبکہ جملہ علوم وفنون پر مشتمل وقیع علمی ذخیرہ اردو زبان میں ہے۔ بہ قدرِ ضرورت انگریزی اور مقامی زبان کی بھی تعلیم دی جائے اور عربی وفارسی کی اتنی تعلیم دی جائے کہ باضابطہ عربی درجات میں داخلے کے بعد وہ بہ سہولتِ تمام اپنے عربی یا فارسی کے جملہ اسباق دمتعلقہ مضامین حل کر سکے۔

اس دس یا بارہ سالہ نظامِ تعلیم کے مضامین بھی چھ ہی ہوں گے اور وہ یہ ہیں:

(۱) دینیات
(۲) مسائلِ فقہ
(۳) سائنس
(۴) جغرافیہ
(۵) تاریخ
(۶) حساب

یہ وہ علوم ومضامین ہیں، جن کی عظمت واہمیت کا اپنوں وغیروں سب کو اعتراف ہے اور دنیا میں ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے جن کی تحصیل از حد ضروری ہے، دینیات اور مسائلِ فقہ میں مہارت اور ان کی مخلصانہ تعمیل جہاں انسان کی اخروی فلاح کی ضامن ہے، وہیں سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور حساب جیسے علوم میں اس کی اعلیٰ لیاقت وقابلیت، اس کی دنیوی زندگی کو بنی آدم کی نظر میں لازوال اعزاز واعتماد عطا کرتی ہے اور بلاتفریقِ مذہب وملت انسانیت اس کی ذات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔

☆ کسی بھی مدرسے میں زیرِ تعلیم سب طلبہ کے رجحانات یکساں نہیں ہوتے ہیں، اگرچہ اکثر طلبہ کی دل چسپی کا مرکز ومحور درسِ نظامی ہی ہوتا ہے، تاہم بعض طلبہ کا

میلان عصری تعلیم کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور کچھ تعداد ایسے طلبہ کی بھی ہوتی ہے، جنھیں دینی یا عصری تعلیم کی تکمیل کی طرف کوئی قابلِ ذکر التفات نہیں ہوتا وہ شروع ہی سے صنعتی ذہن کے ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اعلی درجے کی عصری تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے کے باوجود وسائل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے یہاں ہر طرح کے طالب علم کو عمومی نظامِ تعلیم کے مرحلے سے تو ضرور گزارا جائے، تاکہ وہ دینِ متین کی اہم اور بنیادی تعلیمات سے روشناس ہو سکے، مکتب کی تدریسی خدمت اور مسجد میں امامت کا فریضہ سرانجام دینے کے قابل ہو جائے اور دفاتر وغیرہ جیسے دنیا سے جڑے ہوئے روزمرّہ کے لاتعداد امور کے حل پر بھی اسے قدرت حاصل ہو جائے، مگر اس نصاب کی تکمیل کے بعد اس کے سامنے تین راستے ہیں اور اساتذہ وسرپرست حضرات کی زیرِ نگرانی اسے ان میں سے کسی بھی ایک راستے کو اختیار کرنے کی اجازت دی جائے اور اسے اس کی ترجیحات کے خلاف کرنے پر زیادہ مجبور نہ کیا جائے، الا یہ کہ اسی میں زیادہ خیرخواہی وسودمندی کا پہلو ہو، ورنہ عام حالات میں اس کے دلی جذبات کو مجروح کرنے کی سعی نہ کی جائے، کیوں کہ اس کے نتائج عملی دنیا میں زیادہ تر مایوس کن ہی ثابت ہوئے ہیں۔

پہلا راستہ یہ ہے کہ وہ آئی ٹی آئی کے ذریعے کوئی ایسا صنعتی کام سیکھ لے، جس کی فی زمانہ زیادہ مانگ ہو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ کالج میں حسبِ خواہش کوئی بھی کورس مکمل کر لے۔ تیسرا اور سب سے اہم راستہ یہ ہے کہ وہ کسی ادارے میں داخلہ لے کر باضابطہ عالمیت کا کورس شروع کر دے اور ان تھک محنت کے ذریعے اپنے کو باکمال علما کی صف میں شامل کرنے کی کوشش جاری رکھے، محض وقت گزاری ہرگز مقصود نہ ہو۔ اس بابت حضرت مفتی صاحب کا موقف کافی سخت ہے، آپ ہر کہ ومہ کے درجاتِ عربیہ میں داخلے کے مخالف ہیں۔ اسی طرح مدارس میں معلمین ومتعلمین

کے یہاں اردو شروحات کا جو سلسلہ چل نکلا ہے، آپ اس سے بھی خفا ہیں اور آپ کے نزدیک باصلاحیت افراد کی کم یابی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ معلمین و متعلمین کی ایک معتد بہ تعداد اردو شروحات پر تکیہ کیے ہوئے ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے مجھ سے دورانِ گفتگو جو کچھ فرمایا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے الفاظ میں اس کی وضاحت کرنے کے بجائے اس سلسلے کے آپ کے موقف کو خود آپ ہی کے واضح الفاظ میں نقل کر دیا جائے۔

آپ فرماتے ہیں:

''اگر بچہ عمومی نظامِ تعلیم سے فراغت کے بعد مدارس کی لائن میں آئے تو اسے خوب اچھی طرح چھلنی میں چھان کر لو، یہ نہیں کہ جو آیا آ جا، جو آیا آ جا، ہمیں کوئی خدانا خواستہ مولویوں کی کھیپ نہیں بنانی، صحیح معنی میں چھان چھٹک کر مولوی بناؤ جو ہمارے یہاں سے نکلے تو واقعی مولوی ہو، بنیادی تعلیم تو اس کی ہوگئی، اب اگر وہ عالم بننا چاہتا ہے، تو دیکھو کہ کیا واقعی اس کے اندر عالم بننے کی صلاحیت ہے، اگر خالی امامت کرنی ہے تو یہ کام تو دسویں بارہویں تک ہو چکا کر لے امامت یا جو بھی اسے کرنا ہے، پھر واقعی وہ عالم بنے، بہت اس کا امتحان لے کر پھر لو، تعداد چاہے کم ہو، آج تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے، لیکن آپ باصلاحیت افراد کو موقع دیں؛ تاکہ جب وہ مدرسے سے نکلیں تو معاشرے پر ان کا پورا اثر ہو، وہ خدمت کا جذبہ لے کر آئیں اور لوگ سمجھیں کہ واقعی یہ ہیں خدامِ دین اور بہتر تو یہ ہے کہ مدارس کو دھیرے دھیرے عربی میڈیم بنائیں۔ اردو میڈیم نے ناس پیٹ دیا ہے، ہر چیز کی شرح ہر چیز کی شرح۔ عربی میڈیم بنائیں۔ آخر جب انگلش میڈیم اسکول بن سکتے ہیں، تو عربی میڈیم

مدرسے کیوں نہیں بن سکتے، ہماری ساری تعلیم عربی میں ہے، ہماری ساری کتابیں عربی میں ہیں، عربی زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم بنایئے اور جب آپ بنائیں گے شروع سے تو عادت پڑ جائے گی اور طلبہ اسی انداز میں چلنے لگیں گے، پھر انشاء اللہ آپ دیکھیں گے انقلاب برپا ہوگا''۔

یہ ہے نصابِ تعلیم سے متعلق آپ کی وہ منفرد رائے، جس پر آپ نے تحریری طور پر بھی روشنی ڈالی، انفرادی واجتماعی طور پر زبانی دعوت کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور جس پر ملک بھر کے مشاہیر علما نے اظہارِ خیال بھی فرمایا۔

اس نصابِ تعلیم سے یہ چند باتیں بالکل صاف ہیں، ایک یہ کہ اس میں طلبہ کی ذہنی سطح اور ان کی نفسیات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے، اسی لیے طویل المیعاد ہونے کے باوجود یہ طرزِ تعلیم طلبہ کی ذہنی وطبعی اکتاہٹ کا باعث نہیں بنتا، ہاں البتہ یہ نصابِ تعلیم استاذ کی بے پناہ دل چسپی ولگن، شوق ورغبت اور جہدِ مسلسل کا متقاضی ضرور ہے۔ کئی سال پہلے مولانا احترام الٰہی صاحب فاضل دار العلوم دیوبند حال مقیم افریقہ نے حضرت مفتی صاحب کی زیرِ نگرانی مرکز الجلیل دیوبند میں اس طرزِ تعلیم کے ساتھ بچوں کو پڑھانا شروع کیا تو حیرت انگیز حد تک اس کے خوش کن نتائج برآمد ہوئے تھے اور بھی چند جگہوں پر آپ کے طرزِ تعلیم کو جگہ دی گئی اور ہر جگہ بیش بہا فوائد محسوس ہوئے۔

دوسرے یہ کہ اس نصابِ تعلیم کے ذریعے طالب علم بالکل ابتدا ہی سے عربی زبان سے مانوس ہوجاتا ہے اور اس کے سیکھنے کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہوجاتا ہے، جو کہ ترقی کا اصل الاصول ہے۔

تیسرے یہ کہ اس میں ہمارے مدارس میں رائج درسِ نظامی کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی ہے، بلکہ اسے جوں کا توں باقی رکھ کر اسے بہ طورِ اضافہ شامل کرنے کی

دعوت دی گئی ہے، تاکہ ہمارے یہاں رائج درسِ نظامی میں مزید استحکام پیدا ہو سکے اور ہر طالب علم میں اتنی استعداد پیدا کی جا سکے کہ وہ اردو شروحات سے بے نیاز ہو کر کسی بھی کتاب کو متعلقہ فن دیکھ کر پڑھانے کے لائق و قابل بن جائے۔ مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے استاذ علامہ ابراہیم بلیاویؒ بڑی سختی کے ساتھ اس اصول پر خود بھی کاربند تھے اور اپنے شاگردوں سے بھی اسی کے خواہش مند تھے۔

یہ اور ان جیسے کئی ایک اختصاصات کے پیشِ نظر عہدِ حاضر کے جملہ اکابر نے اسے بے حد سراہا اور وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔

☆......☆......☆

نانا مرحوم اور مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے باہمی روابط پر ایک نظر

مفتی ہلال عثمانی مد ظلہم سن ۱۹۷۳ عیسوی میں بہ حیثیت مفتیٔ اعظم پنجاب مالیر کوٹلہ تشریف لائے تھے اور اس کے ایک ڈیڑھ سال بعد مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومتوی سورج گڑھ راجستھان سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔

یہاں کے قیام کے حوالے سے (جو مسلمانانِ پنجاب کے حق میں دینی لحاظ سے بڑا سودمند ثابت ہوا) دونوں بزرگوں کے مابین ایک بڑا ہی یادگار و دل چسپ قدرِ مشترک یہ ہے کہ اول الذکر کو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی حوصلہ افزائی نے مالیر کوٹلہ میں جمائے رکھا، جبکہ ثانی الذکر کے حق میں انہیں حکیم الاسلامؒ کی تائید وتصدیق کی بہ دولت شاہی امامت کے عظیم منصب پر فائز ہونے کے راستے وا ہوئے تھے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مد ظلہم اپنے سے پہلے دارالافتاء کے مفتی مولانا مفتی حمید حسن صاحبؒ کے اصرار پر مالیر کوٹلہ تشریف لائے، آپ کی خواہش تھی کہ حکیم الاسلامؒ سے ملاقات ومشورے کے بعد ہی یہ سفر کیا جائے، مگر حکیم الاسلامؒ کے کسی سفر پر ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا اور رمضان المبارک کی تعطیل کے موقع سے دارالعلوم سے عارضی رخصت لے کر آپ یہاں تشریف لے آئے، بعدہ جب آپ نے دارالعلوم واپسی کا اپنے نزدیک پختہ فیصلہ کرلیا اور بہ ذریعۂ خط حکیم الاسلامؒ کو آگاہ بھی فرمایا تو حکیم الاسلامؒ نے جوابی مکتوب میں فرمایا کہ مسلمانانِ پنجاب کو موجودہ حالات میں آپ جیسے عالمِ دین کی سخت ضرورت ہے، اس لیے جب آپ وہاں چلے ہی گئے ہیں، تو کچھ مدت اور ٹھہرئے اور یہاں تک فرمایا کہ تمہارا وہاں ہونا، خود میرا اور دارالعلوم دیوبند کا وہاں ہونا ہے۔

حکیم الاسلامؒ کا یہ جوابی مکتوب مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے حق میں طمانینتِ قلبی کا بڑا اہم ذریعہ ثابت ہوا اور جن چند واقعات نے آپ کو یہیں رہ جانے کا حوصلہ دیا، ان میں سرِ فہرست حکیم الاسلام کا یہ جوابی مکتوب بھی تھا۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے حقیقی دادا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ صاحبِ فتاوی دارالعلوم دیوبند کے نام وکام سے شاید ہی کوئی فاضلِ دارالعلوم ناواقف ہو۔ مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومٹویؒ کو اللہ رب العزت نے مفتی صاحب مدظلہم کے دادا مرحوم کی طرح عجز وانکسار کی دولت سے خوب خوب حصّہ عطا فرمایا تھا، جب تک صحت بحال رہی، وہ اپنے گھر کے اندرونی وبیرونی کام خود کرنے کے عادی رہے، پنکھا یا گھر کی کوئی بھی قابلِ مرمت چیز اپنے کندھوں پر اٹھا کر سرِ راہ لے جانا اور درستگی کے بعد پھر اسی شان کے ساتھ اسے گھر لے آنا اور وہ بھی اپنے سے متعارف مقتدی وغیر مقتدی حضرات کے سامنے، ان کا ہمیشہ کا معمول رہا۔ لباس وپوشاک میں وہ اس درجہ سادگی پسند تھے کہ کشمیر کے اولین وزیر اعلی شیخ عبداللہ آپ کی ایک ریڈیائی فارسی تقریر سے متأثر ہوکر بہ غرضِ ملاقات جب جامع مسجد مالیر کوٹلہ تشریف لائے تھے، تو وہ بھی آپ کی حد درجہ سادگی کی وجہ سے آپ کو پہچان نہیں سکے تھے اور انہوں نے اپنے سامنے موجود خود مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ سے ہی پوچھا تھا کہ مجھے مولانا محمد ہاشم صاحب سے ملنا ہے، جس کا جواب دیتے ہوئے قاری صاحبؒ نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا تھا ''وہ ہاشم جس سے آپ ملاقات کے خواہش مند ہیں، میں ہی ہوں'' یہ سن کر شیخ صاحبؒ کو دیر تک اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا تھا۔

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
(جگر مرادآبادی)

قاری صاحبؒ نے ابتدا میں شہر کے سب سے قدیم اور بافیض ادارے ’’جامعہ حفظ القرآن مالیرکوٹلہ‘‘ میں تدریسی خدمت انجام دینے کے ساتھ جناب عبدالرشید خاں صاحب کے یہاں سلائی مشین کی اصلاح و درستگی کا کام سیکھنا شروع کیا تھا اور آپ مکمل طور پر اسے سیکھ بھی گئے تھے۔ آپ کا ارادہ تھا کہ بہ طور پیشہ اسے اختیار کیا جائے اور دینی خدمت حسبۃً للّٰہ انجام دی جائے۔

انہیں دنوں کا ذکر ہے، قاری منیم صاحب دیوبندیؒ جامع مسجد کی امامت سے ریٹائرڈ ہوئے اور اگلے امام کے طور پر قرعۂ فال قاری صاحبؒ کے نام پر نکلا، جب آپ اپنے مخلص احباب کی خواہش و وساطت سے جامع مسجد میں بہ غرضِ امامت انٹریو دینے گئے، تو آگے جو کچھ ہوا، اس سے متعلق آپ کے حقیقی بھانجے، جامعہ امدادیہ پھلودی جودھپور کے بافیض استاذِ ادب وفقہ اور مصلح الامت حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہم شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈھابیل کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا انوار احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم کا بیان ہے کہ:

> ’’آپ سے حدیثِ نبوی ’’بنی الاسلام علی خمس الخ‘‘ کے بارے میں یہ سوال کیا گیا کہ آپ حدیث میں مذکور ہر جزو سے متعلق اسی کی ہم مضمون احادیث حفظ سنائیں؟ آپ نے جواب میں ہر ہر جزو پر پچیس پچیس حدیثیں مع توضیح وتشریح سنا کر خود انٹریو لینے والے صاحب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

یہ حدیثی مہارت دیکھ کر آپ کی علمی لیاقت وقابلیت پر تو وہاں موجود ہر شخص کو یقین ہو گیا تھا اور یہ بات بھی سب پر عیاں ہو چکی تھی کہ جامع مسجد کی امامت و خطابت کے لیے آپ کی شخصیت بالکل موزوں شخصیت ہے، مگر مشکل یہ تھی کہ آپ کے پاس باضابطہ عالمیت کی سند نہ تھی، گو آپ

نے جامعہ خلیلیہ نظامیہ برکاتیہ ٹونک کے زمانۂ قیام میں صحاح ستہ اور نحو صرف وغیرہ جملہ علوم وفنون کی کتابیں مولانا منظور احمد برکائیؒ وغیرہ اپنے اساتذہ سے فارغ اوقات میں ان کے گھر جاجا کر پڑھی تھیں، مگر یہاں مستقل طور پر عالمیت کا کورس نہ ہونے کے باعث عالمیت کی سند مل جانے کا ظاہر ہے کوئی امکان نہ تھا۔ اس عقدے کے حل کی غرض سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو خط لکھا گیا، جس میں آپ سے پوچھا گیا کہ جامع مسجد مالیرکوٹلہ میں بہ غرضِ امامت ایک ایسے صاحب نے انٹرویو دیا ہے، جن کے پاس عالمیت کی سند تو اگر چہ نہیں ہے، مگر انہوں نے حدیث نبوی ﷺ "بنی الاسلام علی خمسٍ الخ" کی ہم مضمون ایک سو پچیس حدیثیں مع تشریح مجلسِ واحد میں سنائی ہیں۔ تو کیا ایسے شخص کو عالم قرار دیکر جامع مسجد میں امامت کا اہل و مستحق سمجھا جائے یا نہیں؟ حکیم الاسلامؒ نے جواب میں فرمایا کہ "یہ صاحب صرف عالم ہی نہیں، بلکہ حافظِ حدیث بھی ہیں"۔ آپ کی اس تصدیق و تائید کے بعد ہی جامع مسجد کی امامت وخطابت کے عظیم منصب پر آپ کا تقرر عمل میں آیا اور پھر تقریباً تیس سال تک آپؒ نے اس پلیٹ فارم سے دینِ متین کی نشر واشاعت کی زرّیں خدمات انجام دیں"۔

یوں تو ہر علم وفن کی کتابیں مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلیؒ کے زیرِ مطالعہ رہیں، جس پر آپ کا کتب خانہ شاہدِ عدل ہے، مگر آپ کی توجہ کا اصل مرکز علمِ حدیث اور علمِ فقہ رہے۔ کتبِ حدیث وفقہ کے ساتھ کثرتِ ممارست کے نتیجے میں احادیث کا ایک معتد بہ ذخیرہ اور لاتعداد فقہی مسائل ان کے خانۂ ذہن میں محفوظ ہوگئے تھے۔ لوگوں کے دقیق سے دقیق فقہی مسائل وہ چٹکیوں میں حل فرمادیا کرتے تھے، فقہی وحدیثی مہارت

کے ساتھ اللہ نے ان کو عمل کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا تھا، جس کا اعتراف کرنے والوں میں مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم، جناب الحاج جمیل احمد صاحب تکھڑویؒ، شیرِ پنجاب مولانا محمد قاسم صاحب میواتیؒ اور آپ کے شیخ و مرشد بانی ماہنامہ الفرقان حضرت اقدس مولانا منظور احمد صاحب نعمانیؒ جیسے خدا رسیدہ بزرگانِ دین شامل ہیں۔

نانا مرحوم مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومٹویؒ عمر کے لحاظ سے حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے تین چار سال چھوٹے تھے اور یہ ان کی حد درجہ تواضع ہی کی بات تھی کہ وہ مدت العمر اپنے سے چھوٹے یا بڑے ہر عالمِ دین کے دل سے قدرداں رہے اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے ساتھ تو ان کا بڑا گہرا قلبی تعلق تھا اور وقتاً فوقتاً حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے دولت کدے پر حاضری ایک زمانے تک ان کا معمول رہی۔

قاری صاحبؒ کے بعض متعلقین و متوسلین سے خود احقر نے یہ بات سنی کہ نجی مجالس میں آپؒ مفتی صاحب کی خدماتِ علمیہ کا بہت بلند الفاظ میں ذکر کیا کرتے تھے اور بعض دفعہ خصوصی نوعیت کے حامل کسی سوال کا از خود جواب دینے کے بجائے اس کے حل کے سلسلے میں سائل کو حضرت مفتی صاحب کی طرف مراجعت کی تلقین فرماتے تھے۔

مفتی صاحب مدظلہم اور مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ جس زمانہ میں یہاں تشریف لائے تھے، وہ ایک ایسا دور تھا، جس میں علمائے حق کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا، چناں چہ دونوں ہی بزرگوں کو حدیث نبوی ﷺ "اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل" سے بھی حصہ پانے اور اس کا مصداق بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ رب العزت کے فضل و کرم اور اسی کی دست گیری کی بہ دولت ان حضرات نے اس دور کو عبور کیا اور بدعات و خرافات کے کامل سدِّ باب کے لیے وہ یادگار خدمات انجام دیں، جو ہمارے اکابر علمائے دیوبند کا قدیم سے طغرائے امتیاز رہی ہیں۔

مالیر کوٹلہ میں تین یا چار صدیوں تک نوابی حکومت کا سلسلہ رہا تھا، نواب افتخار علی خاں نوابی دور کی آخری یادگار تھے، جن کے لاولد ہونے کی بنا پر ان کی وفات کے ساتھ ہی یہ نوابی سلسلہ دم توڑ گیا، نواب افتخار علی خاں مرحوم علم دوست وعلما نواز انسان تھے۔ مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ اور مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کے ساتھ ان کا محبّانہ ومخلصانہ تعلق تھا، جسے تا دمِ واپسی انہوں نے بہ خوبی نبھایا۔ نواب صاحب کسی نہ کسی بہانے دونوں بزرگوں کے اجتماع اور اس طرح شہر کی سیاسی وسماجی شخصیات (جو اکثر ان کے یہاں مجتمع رہتی تھیں) کے دینی استفادے کا ذریعہ بنے رہے۔

مالیر کوٹلہ کے محسنِ علما افراد میں ایک بڑا اہم نام جناب عبدالرشید خاں صاحب کا بھی ہے، یہی وہ مرحوم بزرگ ہیں، جن کے ایک وسیع وعریض مکان میں مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کا قائم فرمودہ مدرسہ تعمیرِ سیرت ایک عرصہ تک جاری رہا تھا۔

مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ نے سلائی مشین کی اصلاح ودرستگی کا کام انہیں کے یہاں سیکھنا شروع کیا تھا، بہ قول مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم بھائی مولانا محمد ہاشم صاحبؒ سے میری اولین ملاقات اور سب سے پہلا تعارف یہیں ہوا تھا۔ یہ بزرگ بھی نواب صاحب کی طرح دونوں بزرگوں کی بڑی قدر کیا کرتے تھے اور باہمی ملاقات کا ایک بڑا ذریعہ بھی تھے۔

نواب صاحبؒ اور جناب عبدالرشید خاں صاحبؒ دونوں ہی اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے ہیں۔ اللہ ان کو علما کی خدمات اور علما سے ان کی بے پناہ عقیدت و محبت کے طفیل اپنی رضا نصیب فرمائے۔

مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ کی مفتی صاحب کے تذکروں پر مشتمل مجالس کا حال جو کچھ رہا ہوگا، اس کی مکمل داستان سپردِ قلم کرنا راقم الحروف کے لیے مشکل ہی ہے، کیونکہ عاجز کے شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی نانا مرحوم راہیِ آخرت ہو گئے

تھے، تاہم حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا آنکھوں دیکھا حال یہ ہے کہ جب کبھی ان کی مجلس میں مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کا نام آجاتا ہے، تو پھر حضرت کی زبانی ان کے ساتھ رہے اپنے تعلقات، ان کی علمی ودینی خدمات اور ان کے اوصافِ حمیدہ پر گفتگو کا طول طویل سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

آج سے چار پانچ سال قبل مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کی حیات وخدمات پر مشتمل مضمون ترجمانِ دارالعلوم پوکرن میں شائع ہوا تھا۔ جن دنوں میں نے یہ مضمون آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس وقت آپ علالت کے دور سے گزر رہے تھے، بایں ہمہ وہ شمارہ شوق ورغبت کے ہاتھوں وصول فرمایا اور اچھے خاصے طویل مضمون کو پڑھ کر ہی اسے اپنے سامنے موجود میز پر رکھا اور یہ ان کے ساتھ آپ کے حددرجہ تعلق ہی کی بات ہے کہ باوجود ضعف وعلالت کے فرمانے لگے کہ ''میں بھائی مولانا محمد ہاشم صاحب کی حیات وخدمات پر مضمون لکھوں گا'' اس کے بعد آپ کی علالتِ طبع کا سلسلہ مزید شدت اور طول اختیار کرگیا اور میں نے یاددہانی مناسب نہ سمجھی، ابھی چند ماہ قبل احقر نے اس بات کا ذکر کیا تو اگلے ہی روز آپ نے مولانا محمد ہاشم صاحبؒ سے متعلق اپنی بیش قیمت تحریر قلم بند کرائی، جو دو رفیقوں کے بیچ کی پچیس تیس سالہ مثالی رفاقت کی حسین ترجمان بھی ہے اور مولاناؒ کی حیات کے کچھ ایسے پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتی ہے، جو اب تک پردۂ خفا میں تھے۔

○❖○

وہ تحریر یہ ہے:

میرے مخلص رفیق مولانا قاری محمد ہاشم خلیلی گومٹویؒ

تحریر: مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم سابق استاذ دارالعلوم دیوبند وحال صدر مفتی دارالعلوم وقف دیوبند

اکابر علمائے دیوبند میں ایک معتد بہ تعداد ایسے خدامِ دین کی ہمیشہ ہی رہی ہے، جو شہرت و ناموری کے معروف ذرائع سے کوسوں دور رہ کر مدت العمر دینی تعلیمات کی نشر واشاعت اور بندگانِ خدا کی اصلاح وتربیت کے لیے وقف رہے۔ ایسے ہی خاموش خدام دین میں ایک اہم نام میرے مخلص رفیق مولانا قاری محمد ہاشم صاحبؒ کا بھی ہے۔ مولانا کا تعلق ایک علمی ودینی خانوادے سے تھا اور وہ خود بھی اپنی جگہ علم وعمل کا ایک بحرِ بے کراں تھے۔ زندگی بے حد سادہ تھی، غیر شناسا لوگوں کے لیے ان کو عالم باور کرنا کارے دارد تھا اور واقف کار حضرات کے لیے دینی مسائل کے حل کے حوالے سے ان کی شخصیت ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی تھی۔

تصنیف وتالیف کا انہیں کوئی خاص ذوق نہیں رہا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ انہوں نے اگر یہ کام بھی کیا ہوتا، تو وہ ایک کامیاب مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے۔ ان کی کچھ تحریریں وقتاً فوقتاً میری نظر سے گزری ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے دین متین کی تشریح کے باب میں لسانی وقلمی دونوں ہی صلاحیتوں سے انہیں وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ یہ ان کے اپنے ذوق واختیار کی بات ہے کہ انہوں نے دینی خدمت کے لیے وعظ وخطابت کی راہ اختیار فرمائی۔

مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کی ایک غیر مطبوعہ کتاب ہے، جس میں انہوں نے چرندوں، پرندوں اور مچھلی وغیرہ مختلف جانوروں کی حلت وحرمت کا حکم بیان کیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ پہلے اس جانور کے عربی، فارسی اور اردو نام کو ذکر کیا ہے اور اس سے آگے چار الگ الگ خانوں میں متعلقہ جانور کا ائمہ اربعہ کے یہاں حکم لکھا ہے۔ یہ کتاب ان کی متعدد کتبِ فقہ کی ورق گردانی کا نتیجہ ہے۔ قاری کو اس کتاب میں بہت سی وہ مفید باتیں یکجا حاصل ہو جاتی ہیں، جن کی تلاش وتتبع کے لیے بسا اوقات کئی کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ بیش بہا معلومات کا یہ ذخیرہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ مولانا کے نواسے عزیزم مفتی محمد عارف جیسلمیری سلمہ اس کتاب کی مکمل تحقیق وتخریج کے بعد اسے منظر عام پر لانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تحقیق وتخریج کے مراحل سے گزر کر جب یہ کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگی تو اس کی افادیت کا دائرہ حیرت انگیز حد تک وسیع ہوگا اور تنہا یہی کتاب بھائی مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کے حق میں رفع درجات کا بڑا اہم ذریعہ ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ

ہم لوگ اپنے بزرگوں کے صرف آخری دور پر نظریں جمائے رکھتے ہیں اور ان کے شروعاتی دور سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔ چند ایک استثنائی مثالوں کو چھوڑ دیا جائے، تو تقریباً ہر بزرگ اپنے شروعاتی دور میں ابتلاءات وآزمائشوں سے گزرا ہوتا ہے اور صبر واستقلال کے نتیجے میں پھر انہیں پروردگار فتوحات وآسائشوں سے نوازتا ہے؛ اس لیے ہمیں اپنے بزرگوں کے آخری دور سے کہیں زیادہ ان کے شروعاتی دور کو دیکھنا چاہیے، تاکہ خدمتِ دین کے لیے بڑی سے بڑی جانی یا مالی قربانی دینا ہمارے لیے سہل ہو اور کوئی بڑی سے بڑی ابتلاء بھی ہمیں راہِ حق سے منحرف نہ کر سکے۔

رفیقِ محترم مولانا محمد ہاشم صاحبؒ جس دور میں جامع مسجد مالیرکوٹلہ میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے تھے، وہ بدعات وخرافات کے شباب کا دور تھا، بہ حیثیتِ مجموعی شہر

میں مبتدعین کا غلبہ تھا، علمائے حق اور علما نواز عوام کا تناسب نہ ہونے کے مساوی تھا، جامع مسجد کے اردگرد تخریب پسند لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کی عظیم حکمتِ عملی ہی کا مظہر تھا کہ انہوں نے ایسے نازک دور میں جامع مسجد مالیر کوٹلہ میں فریضۂ امامت اس شان سے سرانجام دیا کہ وہ مقبولِ عوام وخواص بھی رہے اور اپنے بے داغ کردار و عمل کے ذریعے عوام کو علما وائمہ کا شیدائی وقدرداں بنا گئے، یہ ان کا وہ عظیم کارنامہ واحسان ہے جس کے لیے یہاں کی علمی و دینی برادری ہمیشہ ہی ان کی شکرگزار رہے گی۔

جب مولانا بالکل نئے نئے یہاں آئے تھے تو ماحول سے واقفیت کے سبب میں ڈرتا رہتا تھا کہ مولانا محمد ہاشم صاحب بیچارے شریف آدمی ہیں، غلط کار لوگ کہیں ان کی شرافت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ ان کی حکمتِ عملی کے آگے ایسے تمام تر موہوم خطرات دم توڑ گئے۔ مولانا کا ایک لائقِ ذکر کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایسے تاریک و پرخطر ماحول میں اپنے مثالی طرزِ تعلیم وتربیت کے ذریعے علماء وخدامِ دین کی ایک ایسی کھیپ تیار کردی، جو اپنے مرحوم ومحسن استاذ کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہے۔ شہر کے قدیم ائمہ اور یہاں کے باثر علما میں اچھی خاصی تعداد ان کے تلامذہ ومتعلقین کی ہے۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ان کا یہ علمی ودینی فیض نسل درنسل منتقل ہوتا رہے گا۔ ان شاء اللہ

میں مولانا کے وطن راجستھان گیا ہوں۔ مولانا فضل الرحمٰن مجددی جے پوری سے میرا بہت اچھا تعلق رہا ہے، ان کے گھر بھی جانا ہوا ہے اور یوں بھی میٹنگوں وغیرہ میں ان سے ملاقات ہوتی رہی ہے۔ وہاں کا ایک الگ ہی مزاج ہے، جس کا رنگ ہمارے یہاں کے پنجاب کے رنگ سے بالکل ہی جداگانہ ہے۔ راجستھان کے اس مزاج میں ادبیت بھی ہے، لطافت بھی ہے اور ایک جاذبیت بھی۔ خواہ وہاں کا ادب ہو یا وہاں کی

زبان ہو یا پھر وہاں کے باشندگان، غرض ہر چیز میں یہ مخصوص مزاج نمایاں ہے، ہم اس سے ذرا کچھ زیادہ انسیت سی محسوس کرتے ہیں اور ہمیں وہ اچھا لگتا ہے۔ بھائی مولانا محمد ہاشم صاحبؒ جن کے ساتھ ہماری رفاقت کی مدت پچیس تیس سال کے عرصے پر مشتمل ہے، وہ اسی مخصوص راجستھانی مزاج میں رچے بسے ایک حددرجہ متقی و پارسا انسان تھے، ان سے مل کر اپنائیت کا عجب احساس ہوتا تھا۔ مختلف اجتماعات اور تقریبات کے بہانے ہماری ملاقات ہوتی رہتی تھی اور کبھی کبھار وہ میرے یہاں بھی تشریف لے آیا کرتے تھے۔ اللہ نے صفتِ سخاوت سے بھی خوب نوازا تھا، وہ میرے پاس جب بھی آتے، مٹھائی یا کوئی اور چیز بہ طور تحفہ ضرور ساتھ لاتے۔ میں ان سے کہتا بھی کہ مولانا آپ ہر دفعہ یہ تکلف نہ کیا کریں؟ جواب میں فرماتے ''تکلف کی کوئی بات نہیں، بس میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ کے لیے کچھ لے کر جاؤں''۔ یہ حسنِ اخلاق اور یہ مودت و محبت اس کے نمونے اب کہاں نظر آتے ہیں۔

مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کی مجلس میں ممنوعاتِ شرعیہ غیبت وغیرہ کا مطلق گزر نہ تھا۔ صرف علمی و دینی یا باہمی تعلقات پر مشتمل گفتگو تک اپنے کو محدود رکھنا اور کسی غائب یا حاضر کے بارے میں کوئی قابلِ اعتراض گفتگو کرنے سے اپنا دامن یکسر بچائے رکھنا یہ بھائی مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کا وہ خاص وصف تھا، جس کی مثالیں اب عوام کا ذکر نہیں، خواص میں بھی بہت کم پائی جاتی ہیں۔

انہیں اکابر علمائے دیوبند کے واقعات وملفوظات کے مطالعے سے خاص شغف تھا، احادیث ومسائل فقہ پر ان کی گہری نظر تھی اور عہدِ حاضر کے حالات ومقتضیات اور ان کے طرقِ حل سے بھی پورے طور پر آگاہ رہتے تھے۔ ان سب کی آمیزش نے ان کی تقاریر کو قبولِ عام عطا کر دیا تھا۔ آواز بھی بڑی گرجدار قسم کی تھی، دورانِ خطاب مضامینِ علمیہ کی آمد اور پھر ان کی یہ گھن گرج آواز سامعین کو ہر دوسری طرف سے بے

خبر کر دیتی تھی اور وہ ہمہ تن گوش رہتے تھے۔عمر کے آخری چند سالوں میں وہ صحت رہی تھی اور نہ ہی آواز کی وہ گھن گرج باقی رہی تھی۔

مولانا کے افرادِ خاندان اسی شہر میں اقامت پذیر ہیں۔ان کے صاحبزادے عزیزم حافظ امداد اللہ سلمہ وقف بورڈ کی مسجد میں امام ہیں اور مزاج و عادات میں اپنے والد ماجدؒ کی یادگار ہیں۔مولانا کے نواسے عزیزم مفتی محمد عارف جیسلمیری سلمہ مسجد عمر فاروقؓ پنجابی باغ ٹبہ روڑ لدھیانہ میں امام ہیں۔پچھلے دنوں آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں میرا لدھیانہ جانا ہوا تھا۔عزیزم کی عوامی خدمات اور ان کی کچھ نہ کچھ لکھتے و پڑھتے رہنے کی لگن دیکھ کر میرا دل بڑا خوش ہوا ہے۔یہ سب کچھ دراصل مولانا محمد ہاشم صاحبؒ ہی کا فیض ہے۔اللہ تعالیٰ اس پورے گھرانے کو شاد و آباد اور خوش رکھے۔

ہم دونوں ایک ڈیڑھ سال کے فرق کے ساتھ اس شہر میں آئے اور تقریباً ایک ہی ساتھ اپنی اپنی سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہوئے۔مولانا عمر کے لحاظ سے تین چار سال مجھ سے چھوٹے تھے،ان کی یادیں تازہ ہیں اور ان شاء اللہ تازہ ہی رہیں گی۔بہت عزت و آبرو اور نیک نامی و اچھائی کے ساتھ وقت گزار کر وہ اپنے رب کے پاس چلے گئے۔اب ہم بھی چراغِ سحری ہیں،کیا پتہ ہے کب تک ہیں کب چلے جائیں گے۔یادیں رہیں گی۔ان شاء اللہ

اللہ تعالیٰ مولانا محمد ہاشم صاحبؒ کو وہاں کی راحتیں عطا فرمائے،انہیں جنت کے اعلیٰ مراتب عطا فرمائے اور ان کے طفیل میں اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنی رحمت کے سایے میں جگہ عطا فرمائے۔

شعبان المعظم ۱۴۳۹ہجری

سید محبوب رضویؒ-و-مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ

کچھ یادیں کچھ باتیں

مفتی صاحب کی عظیم المرتبت شخصیت کی تعمیر وترقی میں یوں تو کئی نادرِ روزگار اکابر علمانے حصّہ لیا، پھر آپ نے رب العزت کے فضل وکرم سے وہ فطرتِ سلیمہ پائی، جس نے اپنے شہرہَ آفاق عثمانی خاندان کی لاثانی شخصیات کے صالح اثرات کو خوب خوب اپنے اندر جذب واخذ کیا۔ایک طرف حکیم الاسلام جیسے شیخ ومرشد کے ہاتھوں آپ نے تربیتِ باطن کے جملہ مراحل طے فرمائے، تو دوسری جانب فقہی دنیا میں آپ کو مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ جیسے فقیہ النفس انسان کی سرپرستی میسر آئی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، امام المعقولات والمنقولات حضرت علاّمہ ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزازعلی امروہوی جیسے اساتذہ آپ کے اقبال کی بلندی کا باعث بنے۔

آپ کی شخصیت میں ان جملہ مرحوم اکابر کے اوصاف وخصائل علی وجہ الکمال جمع ہیں۔اکابر کے جو سوانح وافکار ہم کتابوں میں پڑھتے یا اساتذہ واکابر کی زبانی سنتے آئے ہیں، مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کی شخصیت ان کے عکسِ جمیل اور حسین سنگم کا درجہ رکھتی ہے۔

سید محبوب رضویؒ جو اپنے دور کے ایک عظیم محقق گزرے ہیں۔تاریخِ دارالعلوم دیوبند جن کا زندہ وجاوید کارنامہ اور ان کے نام وکام کے بقائے دوام کی ضمانت

ہے۔ سید صاحب کی دوربیں نگاہ نے بھی مفتی صاحب میں مخفی جوہر کو ان کے بچپن ہی میں تاڑ لیا تھا اور یہ ان کی ذرہ نوازی اور اپنے چھوٹوں کو علم و فضل کی دنیا کا شہ سوار بنا دینے کی سوچ ہی کا مظہر تھا کہ عمر کے عظیم تباین کے باوجود مفتی صاحب کے گھر اکثر خود چلے جاتے اور اپنی معلومات افزا گفتگو کے ذریعے آپ کے ذہن کی گرہوں کو کھولنے کا کام کرتے۔

یہ اس شخص کا حال ہے جسے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جیسے متبحر ہندی عالم نے ''عالم بین الدفتین'' کا درجہ دیا تھا اور اپنا تاثر یہاں تک ظاہر کیا تھا کہ ''سید صاحب اگر باضابطہ عالم ہوتے، تو اپنے دور کے ابن خلدون ہوتے'' سید صاحب بڑے باصلاحیت اور حد درجہ نفیس و صاف ستھرے ذوق کے حامل انسان تھے۔ کسی بھی موضوع کی مالہ وماعلیہ مکمل تحقیق کے بعد اس پر قلم اٹھاتے تھے اور اپنی امکانی حد تک اس کا حق ادا کر دیتے تھے۔

ان کا خاص وصف، جیسا کہ ذکر آیا، چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی علمی بلندی کی فکر تھا۔ اللہ نے بیوی بھی اسی وصف کی عطا فرمائی تھی، جو لاتعداد خواتین کے قرآن پڑھنے کا ذریعہ بنی۔ دیوبند کے محلّہ گدی واڑہ میں وہ ایک عرصہ تک مقیم رہے، بعدہ ان کی قیام گاہ محلّہ قلعہ کی طرف منتقل ہوگئی تھی اور تعلیمی منزل کے نام سے ان کا گھر دیوبند بھر میں مشہور تھا۔ سید صاحب کے یہاں اولاد نہیں ہوئی تھی، انہوں نے ایک رشتہ دار خاتون کو اپنا متبنی قرار دیا تھا، جن کی صاحبزادی استاذی المحترم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر سے منسوب ہیں۔

سید صاحب کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ''تاریخِ دیوبند'' کے نام سے یکے بعد دیگرے دو کتابیں لکھیں، جو دیوبند کے حوالے سے معلومات کا انمول

خزینہ ہیں، جن سے یہاں کے اکثر عوام بلکہ خواص بھی ناواقف تھے۔ اس کتاب میں مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کا ذکر خیر شامل ہے اور بہ قول خود مفتی صاحب مد ظلہم انہیں تصنیف و تالیف کی راہ پر ڈالنے والے بزرگوں میں مولانا ازہر شاہ قیصرؒ اور سید محبوب رضویؒ کا نام سب سے پہلے ہے۔

دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا ازہر شاہ قیصر، سید محبوب رضوی وغیرہ اس دور کے اکابر کی تقریباً ہر روز مجلسیں لگتی تھیں جو کہ بڑی تاریخی و ادبی ہوا کرتی تھیں۔ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم بھی ایک زمانے تک ان مجالس کے حاضر باش رہے تھے اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کی یکجائی سے خوب خوب محظوظ و مستفید ہوئے تھے اور بہ ظاہر اسباب انہیں مجالس نے آپ کے آبائی و موروثی لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق کو پروان چڑھایا تھا۔

ازہر شاہ قیصرؒ اور سید محبوب رضویؒ آپ کو برابر کچھ نہ کچھ پڑھتے اور لکھتے رہنے پر اکساتے رہے اور آپ کی تحریرات کو ماہنامہ دارالعلوم میں چھاپ کر حوصلہ افزائی فرماتے رہے، یہ وصف ہمارے اسلاف کا مابہ الامتیاز رہا ہے اور یہ اسی کا صلہ ہے کہ ان کے مشن کو باقی رکھنے والے اور اس کی نشر و اشاعت میں مخلصانہ کردار ادا کرنے والے ان کے شاگردان و فیض یافتگان آج بھی معتد بہ تعداد میں کرۂ ارض پر موجود ہیں۔

ازہر شاہ قیصرؒ نے ایسی ہی کسی مجلس کے موقع پر مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کو مطالعۂ کتب کے بارے میں ایک بہت ہی عمدہ اور قیمتی نصیحت فرمائی تھی، جو ہم سبھوں کے لیے نہ صرف لائقِ تقلید و اتباع، بلکہ حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے۔ آپ کی وہ نصیحت — جس پر ناصح موصوف خود بھی عامل رہے — یہ تھی کہ کسی بھی کتاب کے مطالعے کے بعد اس کا خلاصہ اپنے روزنامچے یا ڈائری وغیرہ میں قلم بند کر لینا چاہیے، جس کا ایک فائدہ تو یہ کہ

مطالعہ کردہ کتب کی فہرست محفوظ فی الذہن رہے گی۔ دوسرے یہ کہ اس خلاصے کے ملاحظے سے کتاب کے جملہ مندرجات ذہن میں تازہ و مستحضر ہو جاتے ہیں؛ ورنہ مطالعے کردہ کتب کی کچھ باتیں یاد رہتی ہیں اور کچھ ذہن سے نکل جاتی ہیں، یہ مطالعے کے فوری بعد کا حال سپرد قلم کیا گیا ورنہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد تو مندرجات تو مندرجات رہے خود کتاب کا نام بھی ذہن سے محو ہو جاتا ہے؛ اس لیے اپنے یومیہ مطالعہ کی حفاظت کی اس سے بہتر و کامیاب کوئی صورت نہیں کہ اس کا خلاصہ لکھنے کا التزام کیا جائے۔

مفتی صاحب مدظلہم نے اس کی تعمیل میں سب سے پہلے غالباً مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتاب ''تذکرہ'' کا خلاصہ لکھا اور اس کتاب کی بابت اپنا تاثر بھی قلم بند کیا پھر یہ تلخیص و تاثر پر مشتمل تحریر ایک مستقل مضمون کی شکل میں ماہنامہ تعمیر سیرت وغیرہ میں چھپی۔

اس التزام کے فوائد میں مضامینِ کتب کی حفاظت اور مضمون نگاری کی تمرین کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ متعلقہ کتب کے مضامین دیر تک خانۂ ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ اس بات کی تمثیلی توضیح کے لیے خود مفتی صاحب مدظلہم کی ذات کو لیجیے، آپ نے مذکور الصدر طریقے کے ساتھ جن کتابوں سے استفادہ کیا تھا ان کی بیش تر باتیں آپ کو ابھی تک یاد ہیں؛ جبکہ آپ کی قوتِ سماعت و بصارت تقریباً جواب دے چکی ہیں، مخاطب کے بہ آواز بلند کوئی بات کہنے کے بعد بھی آپ بہ مشکل اس کی بات سن پاتے ہیں اور بینائی کچھ عرصے سے اس درجہ متاثر ہے کہ کتب بینی کا سلسلہ بالکلیہ موقوف ہو کر رہ گیا ہے۔ ضعف و نقاہت اور علالتِ طبع کا عارضہ تو کئی سالوں سے لاحق ہے، مگر اس سب کے باوجود مضامینِ علمیہ کے استحضار کا عالم یہ ہے کہ جو بات بھی بہ غرضِ حل آپ کے سامنے رکھ دی جائے تو پھر اس سے متعلق معلومات کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مارنے

لگتا ہے۔ ''تذکرہ'' کے اب تک محفوظ مضامین میں سے ایک بہت ہی اہم بات آپ نے یہ ذکر فرمائی کہ علماء سوا ور علماء حق کی من جملہ علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ علماء حق حق کے تابع رہتے ہیں اور حق کے ارد گرد گھومتے ہیں، جبکہ علماء سو حق کے تابع رہنے کے بجائے تاویلات کے ذریعے حق کو اپنی طرف گھماتے ہیں۔

○❖○

قادیانیت ورڈّ قادیانیت آپ کی نظر میں

سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک جتنے نبی اور رسول مبعوث ہوئے، وہ سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے تھے اور جنہیں حضرت یعقوبؑ کی نسبت سے انبیاء بنی اسرائیل کہا گیا۔ اس طول طویل عرصے میں آپ کے دوسرے فرزند سیدنا اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے کوئی ایک بھی رسول یا نبی مبعوث نہ ہوا۔

عیسٰی علیہ السلام کے بعد جو آخری نبی مبعوث ہونے والے تھے، اس نبی سے متعلق مکمل تفصیلات کا ذکر کتبِ سماویہ میں کر دیا گیا تھا، کیوں کہ بہ قول مفتی ہلال عثمانی مدظلہم ''رسول کی بعثت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتی، وہ کوئی اجنبی نہیں ہوتا جو عام لوگوں سے اٹھ کر دعوت کے لیے منبر سنبھال لیتا ہے۔ اس کی آمد سے پہلے نبیوں کی ایک بڑی جماعت اس کا تعارف کراتی ہے، اس تعارف میں ابہام ہوتا ہے نہ اجمال، اس میں اس کا وطن، اس کی دعوت کے خصائص، اس کا زمانہ، اس کی قوم، اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات، اس کے ساتھیوں کی صفات، اس کا نام، غرض ہر چیز وضاحت کے ساتھ بتائی جاتی ہے، وہ آتا ہے تو اپنی دعوت کی ابتدا اسی حوالے سے کرتا ہے اور اپنے مخالفوں پر اتمامِ حجت کے لیے بار بار یہی کہتا ہے کہ: ''مُصَدِّقاً لِمَا بَیْنَ یَدَیَّ'' یعنی میں تمہارے ہاں پہلے سے موجود پیشین گوئیوں کا مصداق بن کے آیا ہوں۔ وہ اس بات کو ان کے سامنے اپنی صداقت کی قطعی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

چناں چہ ہمارے نبی ﷺ کی بعثت کی خبر آدم علیہ السلام سے لے کر عیسٰی علیہ

السلام تک آنے والے جلیل القدر انبیا ورسل نے دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو اپنی قوم پر یہ بھی واضح کردیا تھا کہ وہ آنے والا نبی بنی اسرائیل سے نہیں، بلکہ بنی اسماعیل سے ہوگا۔

موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے ہمارے نبی ﷺ کی بعثت وآمد کی جو خبریں دیں، وہ تحریف شدہ کتب میں آج بھی موجود ہیں۔

افادۂ عام کی غرض سے ان اخبار کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے انہیں کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے، تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا''۔ (استثناء باب ۱۸/آیت ۱۵-۱۹)

اس عبارت میں ''تیرے ہی بھائیوں میں سے'' اور ''انہیں کے بھائیوں میں سے'' کے الفاظ سے آپ ﷺ کے بنی اسماعیل سے ہونے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واضح فرمایا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی ہمارے نبی ﷺ کی بعثت سے متعلق کئی پیشین گوئیوں میں سے چند ایک یہ ہیں:

''یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتابِ مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے، اس لیے میں تم سے

کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا، اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا"۔

(متی: باب ۲۱۔ آیت ۴۲۔۴۴)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں"۔ (یوحنا: باب ۱۴۔ آیت ۳۰)

قرآن کریم میں بھی متعدد مقامات پر الفاظ کے خفیف تغیر و تبدل کے ساتھ ان موسوی و عیسوی پیشین گوئیوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

سورۂ اعراف میں اہلِ ایمان کی صفات میں ارشادِ باری ہے:

"اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ"

سورۂ صف میں حضرت عیسیٰ کی ہمارے نبی ﷺ کی آمد سے متعلق گفتگو قرآن کریم نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

"وَاِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ"۔

یہود و نصاریٰ اپنی اپنی کتب کی تصریحات کے مطابق اس نبیِ آخر الزماں کے منتظر تھے، بلکہ مدینہ منورہ میں اس نبی آخر الزماں کے علاقے کی نشانیاں اور علامتیں دیکھ کر بعضے اہلِ کتاب نے مدینہ منورہ ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ یہود و نصاریٰ اپنے معاصرین و مخالفین سے کہا کرتے تھے کہ ان نبی آخر الزماں کا اتباع کر کے ہم پوری دنیا پر چھا جائیں گے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کا پہلا انسانی تعارف انہیں کے ذریعے ہوا۔

اس سب کے ساتھ انہیں یقین کی حد تک امید وتوقع تھی کہ وہ نبی بھی بنی اسرائیل ہی سے ہوں گے۔ ''اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ'' اللہ عزاسمہ نے ایک طویل عرصے تک سلسلۂ نبوت ورسالت کو بنی اسرائیل میں جاری رکھنے کے بعد اپنے آخری نبی ﷺ کو اپنے حکم واختیار کے تحت بنی اسماعیل میں سے مبعوث فرمایا، بس یہی بات ان اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ کو ناگوارِ خاطر گزری اور اسے انہوں نے اپنی توقعات اور امیدوں کا خون سمجھا، حالانکہ یہ کوئی قابلِ اعتراض امر نہ تھا، جو کچھ بھی ہوا، خود ان کے پالن ہار کی حکمت ومصلحت اور اسی کے حکم سے ہوا اور پھر ان نبیٔ آخر الزماں ﷺ کی آمد سے برسہا برس پہلے خود ان کے ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا واضح اشارہ بھی دے دیا تھا، پس انہیں اوّلِ وہلہ ہی میں ان پر ایمان لے آنا چاہیے تھا، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ یہودی وعیسائی دنیا کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حد درجہ ضدی واڑیل قسم کی قوم ہیں، اپنی چاہت کے خلاف نبی کا اقدام بھی انہیں راس نہ آیا اور صرف اسی جرم بے گناہی میں خدا معلوم کتنے ہی اپنے وقت کے اولوالعزم پیغمبران کے ہاتھوں شہید ہوئے، یہی ان کا وصف یہود کو عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی جانب لے گیا اور اسی کے چلتے وہ رومی بادشاہ کے ہاتھوں آپ کو مصلوب کرانے کے درپے ہوئے، مگر اللہ رب العزت نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھالیا اور آخرش ان کی اسی ادا نے نبیٔ آخر الزماں ﷺ کا دامن تھامنے سے انہیں روک دیا۔ اہل کتاب ایسے حساس واہم موقع پر اپنے پیغمبروں کی زبانی تعلیمات اور کتبِ سماویہ میں موجود اس سلسلے کی تصریحات (جن کا حقیقی مصداق ہمارے نبی ﷺ تھے) کے علی الرغم آپ کی اور آپ پر نازل شدہ شریعت کی تکذیب اور نبی ﷺ ومتبعینِ نبی ﷺ کی ایذا رسانی پر اتر آئے۔

عبداللہ بن سلام جیسے یہودی عالم آپ پر ایمان لائے، مگر ایسے سعید انسانوں کی

تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی شاید ہی ہو، اکثریت نسل پرست اور تعصب پرست تھی، جس نے دعوائے نبوت ورسالت کے ساتھ ہی آپ ﷺ کے پیغام کی مخالفت کو اپنا مشن بنایا، قدم قدم پر دھوکے دیے، بعض مواقع پر العیاذ باللہ ہمارے نبی ﷺ کے قتل کی سازش میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شرکت کی اور متعدد معرکوں میں نبی ﷺ واصحابِ نبی ﷺ کے مقابلے مشرکینِ مکہ اور دیگر کفارِ عرب کی افواج کی تعداد بڑھائی۔

یہ ذہنی وقومی تعصب نسل درنسل ان میں چلتا رہا؛ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مسلم دشمنی میں مزید اضافہ ہی ہوتا رہا اور شروع سے ان کی کوشش رہی کہ کس طرح اسلام اور مسلمان کمزور رہوں اور دنیا کے نقشے پر صرف اور صرف ہماری ہی حکومت و چودھراہٹ قائم ہو، اس کے لیے وہ پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے ہر قسم کے مکروہ ہتھکنڈے اپناتے آرہے ہیں۔

یہودی وعیسائی یہ دونوں قومیں ایک زمانے تک باہم ایک دوسرے کی حریف و دشمن رہی ہیں؛ کیوں کہ عیسائیوں کے خیال کے مطابق یہودیوں نے ان کے نبی حضرت عیسٰی علیہ السلام کو پھانسی پر چڑھانے کا نا قابلِ معافی جرم کیا تھا، مگر نبیِ آخرالزماں کی آمد کے بعد یہودیوں نے عیسائیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور مسلم دشمنی جو دونوں ہی ان مغضوب وضال قوموں کا مشترکہ مشن ہے اس مشن کی مضبوطی کی خاطر عیسائیوں نے بھی ان کی یہ خطا معاف کردی اور دونوں مل کر اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہیں۔

انہوں نے ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی اپنے طور پر کوششیں جاری رکھیں، دنیا کی ہر اسلام دشمن تنظیم وتحریک کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسری طرف خود مسلمانوں میں سے کچھ غدارانِ اسلام کو تلاش کرنا اور اپنے مذموم مقاصد کی نشر واشاعت کی خاطر انہیں آلۂ کار بنانا اور اس کے عوض ان کو جانی و مالی امداد بہم پہنچانا

اپنا سب سے اہم اور اولین فرض سمجھا اور اس دوسری شق پر بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا رہے، قادیانیت جس کی ایک کڑی ہے، جو اپنے خانہ ساز نبی مرزا غلام قادیانی کی نبوت کے اصل بانیان یہود ونصاریٰ کی زیرِ نگرانی اپنی پیدائش سے لے کر اب تک دنیا بھر میں کفر وشرک اور ارتداد کے جراثیم پھیلانے کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعماری وتخریبی کاروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے اور اس نمک حلالی کے نتیجے میں یہود ونصاریٰ کی مادی عنایات سے خوب خوب محظوظ و مستفید ہوئی اور ہو رہی ہے اور یہ اسی کرم نوازی کا مظہر ہے کہ قادیانیوں کو اسرائیل جیسے اسلام دشمن خطے میں اسلام مخالف سرگرمیاں جاری رکھنے کی مکمل اجازت ہے اور اس کے لیے باضابطہ اچھے خاصے قطعۂ زمین پر انہوں نے ایک بڑا مرکز بھی قائم کر رکھا ہے۔نشاناتِ منزل منزل کا پتہ دیتے ہیں۔قادیان سے اسرائیل تک کی داستان ایک مستقل فرصت کی متقاضی داستان ہے، جس کے لیے کئی صفحات وساعات درکار ہیں۔اس تحریر میں اس جانب فقط اشارے پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء عیسوی میں عیسائیوں کا ہندوستان پر مکمل قبضہ ہو گیا اور بلا شرکتِ غیرے وہ یہاں کے مالک بن بیٹھے۔اس ملک کی زمامِ اقتدار چوں کہ مسلمانوں سے ان کے ہاتھوں منتقل ہوئی تھی، اس لیے اول دن ہی سے انہوں نے اپنا اصل حریف انہیں کو جانا اور پھر اپنی طاقت وحکومت کے بل پر مسلمانوں کو جو جانی و مالی نقصانات پہنچائے، وہ محتاجِ بیاں نہیں۔

یہ اس دور کا ذکر ہے، جب یہ ملک واقعی گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ تھا، غیر مسلم برادرانِ وطن بھی چند ایک اسلامی قدریں اپنائے ہوئے تھے، اپنے خطوط کی ابتدا تک ''بسم اللہ'' سے کرتے تھے۔یہاں قابض عیسائی حکومت کے لیے دو مختلف العقائد قوموں میں یہ یگانگت ناقابلِ برداشت تھی، اس نے اپنے مخصوص نظامِ تعلیم کے جبری

نفاذ کے ذریعے اس کا سدِّ باب کیا۔ ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کا جذبۂ جہاد: یہ اس کی راہ کے دو بڑے پتھر تھے جنہیں راستے سے ہٹائے بغیر اپنی حکومت کو طول دینا اس کے خیال میں کارے دارد تھا۔

اسیرِ ختمِ نبوت شورش کاشمیری کے مطابق ان کے سامنے ہندوستان میں برطانوی عمل داری کو استحکام دینے کے لیے چار سوال تھے اور وہ یہ تھے:

☆ ''ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی درازئ عمر اور سیاسی استحکام اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک مسلمانوں میں روحِ جہاد کارفرما ہے''۔

☆ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مغائرت و منافرت کیوں کر پیدا کی جاسکتی ہے۔ اب تک عقیدوں کی ضد کے باوجود ان کے ذہنوں میں تصادم نہیں تھا۔ دونوں مذہبی بعد کے باوجود انگریزوں سے متحد ہوکر لڑے تھے اور تب سوال صرف مسلمانوں کی بادشاہت کا تھا۔

☆ اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر رکیک حملوں کا آغاز کیا جائے۔ اس طرح مسلمان جہاد سے روگرداں ہوکر مدافعت کے محاذ پر آجائیں گے، مجادلہ کی جگہ مناظرہ لے گا، جہاد کا خدشہ مٹے گا، مسلمانوں کی کایا کلپ ہوگی، نتیجتاً برطانوی سلطنت کے استحکام کی راہیں ہموار ہوں گی۔

☆ مسلمانوں میں نئے اور پرانے فرقوں کی معرفت متحارب و متصادم عقائد پیدا کیے جائیں، جن سے ان کی ملّی وحدت پراگندہ ہوجائے اور وہ باہمی نفاق کی مخلوق ہوں۔'' (تحریک ختم نبوت ص ۱۳-۱۴)

عیسائی حکومت نے اسلام اور مسلمانوں پر رکیک حملوں کا آغاز بدنامِ زمانہ سر ولیم میور جیسے دریدہ دہن انسان کے ذریعے کرایا، پھر تو اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرنے والوں کی باڑھ سی آگئی تھی، لندن سے صرف اسی کام کے لیے اور عیسائیت کے فروغ

کے لیے عیسائیوں کی ایک کھیپ کی کھیپ ہندوستان لائی گئی، جس کے خلاف مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور دیگر علماء حق کو میدان میں اترنا پڑا۔

باقی تین سوالوں کا حل کچھ نام نہاد مدعیانِ اسلام کے ذریعے انجام پایا، مگر مرزا غلام قادیانی یہ وہ شخص ہے، جس نے بہ یک وقت برطانوی حکومت کے تحفظ کے لیے چاروں ہی سوالوں کا توڑ پیدا کیا، اس نے اپنی کتابوں میں برطانوی حکومت کو ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں خدائی رحمت بتایا، اس کے خلاف جہاد کی حرمت کا فتوی دیا، خود کو اور اپنی قادیانی جماعت کو اس کا خود کاشتہ پودا قرار دیا اور انگریز کی حمایت اور اس کے خلاف جہاد کی منسوخی میں اتنی کتابیں لکھ ڈالیں کہ بہ قول خود مرزا غلام قادیانی اگر انہیں اکٹھا جائے، تو کئی الماریاں بھر جائیں اور ایسے شخص سے امید بھی یہی تھی، جسے انگریز نے اسی لیے نبی بنایا تھا۔

سن ۱۸۶۹ء عیسوی میں برطانوی ممبرانِ پارلیمنٹ اور ہند و برطانیہ کے مسیحی رہنما ؤں نے ایک جگہ مجتمع ہو کر کئی امور کے بارے میں غور و خوض کیا، مثلاً ۱۸۵۷ء عیسوی کے غدر کے محرکات کیا تھے؟ اور یہ کہ مسلمانوں میں ایسی کون سی تحریک برپا کی جائے، جو ملکی سطح پر ان میں انتشار و افتراق کا ذریعہ بنے؟ ایک مدت کے غور و خوض کے بعد وہ سب کے سب حسبِ ذیل تجویز پر متفق ہوئے:

> ''ملک ہندوستان کی آبادی کی اکثریت اندھا دھند اپنے پیروں یعنی روحانی رہنماؤں کی پیروی کرتی ہے، اگر اس مرحلے پر ہم ایک ایسا آدمی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں، جو اس بات کے لیے تیار ہو کہ اپنے لیے ظلّی نبی ہونے کا اعلان کر دے، تو لوگوں کی بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہو جائے گی؛ لیکن اس مقصد کے لیے مسلمان عوام سے کسی شخص کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے، اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے، تو ایسے شخص کی نبوت کو

سرکاری سرپرستی میں پروان چڑھایا جاسکتا ہے،ہم نے پہلے بھی غداروں کی مدد حاصل کرکے ہندوستانی حکومتوں کومحکوم بنایا ہے،لیکن وہ مختلف مرحلہ تھا، اس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غداروں کی ضرورت تھی ،لیکن اب جبکہ ہم نے ملک کے کونے کونے پر اقتدار جمالیا ہے اور ہر طرف امن اور آرڈر ہے،ہمیں ایسے اقدامات کرنے چاہئیں،جن سے ملک میں داخلی بے چینی پیدا ہوسکے''۔

(مطبوعہ رپورٹ سے اقتباس انڈیا آفس لائبریری لندن)

اب ایسے شخص کی تلاش شروع کی گئی اور ریورنڈ بٹلر اور پارکنسن جیسے اعلیٰ مسیحی دماغوں نے بہت جلد مرزا غلام قادیانی کو پالیا،مرزا غلام قادیانی ان دنوں سیالکوٹ کچہری میں منشی گری کی معمولی نوکری پر مامور تھا،جہاں پارکنسن اور ریورنڈ بٹلر کی اس سے کئی خفیہ ملاقاتیں ہوئیں،جس کا اعتراف خود قادیانی ذریت کو بھی ہے،ان پسِ پردہ ملاقاتوں میں مستقبل کے عزائم کو روبہ عمل لانے کے بارے میں غور وخوض ہوا اور اندرخانہ سب کچھ طے پاجانے کے بعد ریورنڈ بٹلر اور پارکنسن عازمِ برطانیہ ہوئے، جبکہ مرزا غلام قادیانی بلا کسی معقول وجہ کے ملازمت سے مستعفی ہوکر قادیان چلا آیا اور خلافِ معمول ایک مصنف اور اسلامی مناظر کی حیثیت سے اپنے کو متعارف کرایا اور جب کچھ معتقدین ومریدین کا حلقہ بن گیا تو سب سے پہلے ''لدھیانہ'' آکر مجدد ہونے کا دعویٰ کرڈالا جو دعوائے نبوت کی جانب اس کا پہلا قدم تھا،پھر یکے بعد دیگرے متضاد قسم کے دعوے کرتا رہا؛ تا آں کہ نبی ہونے کا مدعی بن بیٹھا،جس کے لیے ایک عرصے سے زمین کی ہمواری کا کام جاری تھا،اس مسند پر براجمان ہونے کے بعد اس نے اپنے مرسل وخدا عیسائی حکومت کی ہر خواہش پوری کی اور آقا کی بھی اپنے غلام پر شروع سے نظرِ عنایت رہی۔

مرزا غلام قادیانی مدت العمر اس وہم وخیال میں مبتلا رہا کہ برطانوی حکومت کا سورج ہند پر ہمیشہ طلوع ہی رہے گا، مگر اس کے آں جہانی ہوئے ابھی کامل چالیس سال بھی نہ گزرے تھے کہ قضائے الٰہی کے تحت یہ ملک عیسائیوں کے چنگل سے آزاد ہوگیا اور آقا کا یہ انجام دیکھ کر غلام قادیانی کی ذریت کو بہ وجوہ نوخیز اسلامی مملکت پاکستان منتقل ہوجانے میں ہی عافیت نظر آئی، چناں چہ قادیانیت کے اصل مولد ومسکن قادیان ضلع گرداسپور پنجاب کو خیر باد کہا گیا اور اگلے مرکز کے طور پر پاکستان کے شہر چناب نگر کا انتخاب عمل میں لایا گیا اور ۷ ستمبر ۱۹۷۴ عیسوی میں علامہ انور شاہ کشمیری کے لائق وفائق شاگرد مولانا یوسف بنوریؒ، مولانا مفتی محمود صاحبؒ اور دیگر اکابر علما کی شبانہ روز جہد مسلسل اور مسلمانانِ پاکستان کی جانی و مالی قربانیوں کے نتیجے میں حکومتِ پاکستان نے بھی قادیانیوں کو سرکاری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا، تو اس موڑ پر قادیانیت نے اپنے اس وقت کے سربراہ مرزا ناصر کی سربراہی میں اپنے اصل آقاؤں کی گود میں لندن جا کر پناہ لی، چناں چہ اب قادیانیوں کا ہیڈ آفس لندن میں ہے اور موجودہ سربراہ مرزا مسرور مستقل طور پر وہیں مقیم ہے اور وہیں سے دنیا کے مختلف خطوں میں آباد قادیانیوں کے نام ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔

مرزا غلام قادیانی کا اصل خواب اگرچہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، مگر اتنا مادی فائدہ ضرور ہوا کہ خود اس کی زندگی کے آخر کے چند سال عیش وعشرت میں گزرے اور اس کی ہلاکت کے بعد اس کی اولاد شہزادوں کی سی زندگی گزار رہی ہے اور عالمی سطح پر انہیں ہر قسم کا جانی و مالی تحفظ حاصل ہے، مسلمانوں کے ساتھ یہ سختیاں اور قادیانیوں کے حق میں یہ فراخ دلی۔

''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا''

دنیا کے تقریباً تمام اسلام دشمن اشخاص وملل قادیانیت کے اصل کردار سے آگاہ

ہیں اور اپنی حد تک اس کی مکمل پشت پناہی کا فریضہ بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ ایک ہندی غیر مسلم نے قادیانیت کی بابت اپنا تاثر کچھ اس طرح کے الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ ہمیں اس قادیانی جماعت کو بہ نظرِ استحسان دیکھنا چاہیے؛ کیوں کہ اس جماعت کے لوگوں کا نبی ہندوستان میں ہے، ان کا قدیم مرکز ہندوستان میں ہے، اس لیے ایک قادیانی، خواہ وہ ہندوستان میں ہو یا دنیا کے کسی اور ملک میں رہتا ہو اس کی عقیدت و محبت کا مرکز مکہ و مدینہ نہیں؛ بلکہ قادیان ہوگا، جس کا لازمی و منطقی نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ وہ عرب اور اہلِ عرب سے نہیں بلکہ ہند اور اہلِ ہند سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا ہوگا اور اس کی تعمیر و ترقی میں بھی اپنی نمائندگی ضرور درج کرائے گا۔

ہمارے ملک کی موجودہ حکومت کی ہمدردیاں بھی اس جماعت کے ساتھ ہیں اور باوجودیکہ وہ ہندی مسلمانوں کی اصل تعداد کو منظرِ عام پر لانے سے ہمیشہ گریزاں رہی ہے، مگر اس جگہ وہ بھی قادیانیوں کو مسلمانوں میں شامل سمجھنے پر مصر ہے، کیوں کہ وہ بھی یہ بات بہ خوبی جانتی ہے کہ قادیانی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ہی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور آگے بھی پہنچاتے رہیں گے، اس مصنوعی و جعلی لبادے کو اتار دینے کے بعد یہ الگ تھلگ پڑ جائیں گے اور مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی جرأت پھر ان کے بس میں نہیں رہ جائے گی۔

قادیانی تقاریب میں ہمارے ملک کے نامی گرامی سیاست دانوں کی شرکت ایک عام سی بات ہے۔ یہاں کے اخبارات بھی قادیانیوں کی خبریں چھاپنے میں بڑی دل چسپی دکھاتے ہیں۔ متعدد ہندی اخبارات میں قادیانی خبریں جلی عنوانات کے تحت نظر نواز ہوتی رہتی ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ آج کی اخباری دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ اول تو ان کی اہم اور ضروری خبریں چھاپنے سے پہلو تہی کی جاتی ہے اور اگر چھاپی بھی جاتی ہیں، تو قطع و برید کے بعد۔ غرض اکثر حساس مواقع پر مسلمانوں کے بالمقابل

قادیانیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔اس کی ایک وجہ مغربی دنیا کا دباؤ بھی ہے جس کی کئی مثالیں ہیں،مگراس کی بنیادی وجہ قادیانیوں کے اصل کردار سے ان کا اطمینان کلی ہی ہے۔

یہ قادیانیت کا بہت مختصر سا پس منظر ہے جسے مفتی ہلال عثمانی کے ملفوظات اور آپ کی کتاب ''تحریکِ قادیانیت: ایک فتنہ۔ایک سازش'' کی روشنی میں قلم بند کیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں ردّ قادیانیت وتحفظ ختم نبوت کا کام کس طرح کیا جائے؟ اور خدمتِ دین کا وہ کون سا طریق اختیار کیا جائے کہ دنیا کے سامنے دینِ اسلام کی کامل ومکمل تصویر آئے اور قادیانیت خود ہی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے؟اس سلسلے میں مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے یہاں دو الگ الگ نقطہ ہائے نظر ہیں۔

☆

ہر دور کے فکر و انداز جداگانہ ہوتے ہیں۔کتبِ قدیمہ کی طرف مراجعت اور ان سے کما حقہ استفادے کے رجحان میں عہدِ حاضر میں حیرت انگیز حد تک کمی واقع ہوئی ہے،آج کل رسائل وجرائد اور یومیہ اخبارات کا مطالعہ ہی معلومات میں اضافے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ایک زمانہ تھا کہ آریہ، سناتن دھرم اور عیسائیت وغیرہ ہر مذہب ودھرم کے لوگ مناظرے کیا کرتے تھے؛مگر اب اس کے بالکل برعکس صورت حال یہ ہے کہ حکمت ومصلحت اور موقع شناسی کے ساتھ کی جانے والی تخلیے کی گفتگو زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے اور مناظرے سے بجائے اصلاحِ حال کے مخاطب ضد و ہٹ کا شکار ہو کر اپنی گم راہی پر مزید پختگی کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے،اس لیے تحفظِ ختمِ نبوت وردّ قادیانیت کے محاذ پر کام کرنے والوں کو یہ اہم فریضہ بڑے اچھے مثبت انداز میں انجام دینا چاہیے،جس سے مخاطب ناصح کو اپنا واقعی مصلح تسلیم کرنے پر آمادہ ہو اور پھر یہی آمادگی اس کے لیے قبولِ حق کا وسیلہ بنے۔اخبارات ورسائل میں ردِّ قادیانیت

سے متعلق ایسے مضامین و مقالات لکھے وشائع کیے جائیں، جن کا انداز سنجیدہ ہو، جارحانہ نہ ہو۔ بہ قول شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ''حق بات اگر حق نیت سے اور حق طریقہ سے کہی جائے، تو کبھی رائگاں نہیں جاتی'' علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی زیرِ نگرانی مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، مولانا ادریس کاندھلویؒ اور مولانا مرتضی حسن چاند پوریؒ جیسے ان کے ارشد تلامذہ نے قادیانیوں سے جو مناظرے کیے، وہ اس دور کے مقتضائے حال کے عین مطابق تھے؛ کیوں کہ قادیانیوں کو عیسائی حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور تقریباً پورے ملک کا منظر نامہ یہ تھا کہ ایک طرف قادیانی پنڈت سادہ لوح مسلم عوام کو مناظروں کے چیلنج سے مرعوب کر رہے تھے اور دوسری طرف مسیحی پادریوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر کیچڑ اچھالنے کا ناپاک سلسلہ شروع کیا ہوا تھا، جس کے نتیجے میں مسلم عوام میں دینِ اسلام سے بدظنی اور ارتداد کے واقعات میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا اور '' **الناس علی دین ملوکھم** ''کی صداقت کھلی آنکھوں نظر آنے لگی تھی، اس لیے ہمارے اکابرؒ کو میدان میں آنا پڑا اور یہ اقدام چوں کہ برموقع تھا، اس لیے ان مناظروں کے خاطر خواہ اثرات ونتائج بھی برآمد ہوئے۔

بہار، اڑیسہ اور پنجاب کی قادیانیت سے متاثر کئی بستیاں، جو جہنم کے بالکل دہانے جا لگی تھیں، ان مناظروں کے طفیل انہیں پھر سے راہِ حق کی طرف رجوع اور اس پر کامل استقامت کی سعادت نصیب ہوئی؛ لیکن اب زمانے کی وہ فضا رہی اور نہ ہی مناظروں کی وہ افادیت باقی رہی، جس کا اعتراف کرنے والوں میں مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے علاوہ مولانا منظور احمد صاحب نعمانیؒ جیسے اپنے دور کے مشہور وکیل احناف بھی شامل ہیں۔ اندریں حالات عوام الناس کو فتنۂ قادیانیت کی خطرناکی سے ضرور آگاہ کیا جائے؛ تاکہ وہ اس فتنے کا شکار ہونے سے خود بھی بچ سکیں اور اپنے حلقۂ احباب کو بھی اس کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔ قادیانی بسا اوقات اپنا تعارف کرائے بغیر ہی

مسلمانوں میں اپنے باطل نظریات کا پرچار شروع کر دیتے ہیں، جس کا پائدار حل عوامی آگاہی ہی ہے اور جہاں کسی کے بارے میں قادیانیوں سے قربت کی خبر موصول ہو، اس کے پاس پہنچ کر اس کے سامنے قادیانیت کے غلیظ چہرے پر سے نقاب کشائی کی جائے اور راہِ حق کی طرف راغب کیا جائے۔ قادیانیت ہو یا کوئی اور فتنہ وفرقہ، اس کے خلاف حد سے زیادہ پروپیگنڈا نہ کیا جائے؛ کیوں کہ ہمارے اس ملک میں ہر چیز کا پروپیگنڈا مضر ثابت ہو جاتا ہے، دوسرے اس کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اس سے باطل بڑے پیمانے پر متعارف ہوتا ہے اور باطل تو چاہتا ہی یہی ہے کہ اس کا خوب ذکر ہو، تاکہ لوگ اس کو جانیں، لہٰذا ہر وقت اسی مسئلے کو اٹھائے رکھنا بہتر نہیں ہے۔

☆

بلکہ اس سے کہیں زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ مکمل دین کے فروغ کی کوشش کی جائے، غیر مسلموں تک دین کا اصل پیغام بالتفصیل پہنچایا جائے، دین کی اہمیت وافادیت سے روشناس کرایا جائے جس سے وہ از خود یہ نتیجہ اخذ کر سکیں کہ اسلام آئے گا، تو انسانیت کو یہ یہ فائدیں ملیں گے اور لاینحل سمجھے جانے والے مسائل یوں حل ہوں گے۔ ہندی مسلمانوں کے حوالے سے یہ ایک بڑا لمحہ فکریہ ہے کہ انہوں نے مکمل دین کی تبلیغ کا کوئی خاص اہتمام بہت کم کیا؛ بلکہ اس کے بارے میں جیسی فکر کی جانی چاہیے تھی، افسوس ہے کہ نہیں کی جا سکی۔ اکا دکا افراد وآحاد کی مثالیں ضرور ہیں اور ان کی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں؛ مگر دینِ اسلام جیسی عظیم نعمت کا حقِ تبلیغ ادا ہو جانے کا عنوان، ان انفرادی کوششوں کو ظاہر ہے نہیں دیا جا سکتا۔ جماعتِ دعوت وتبلیغ کے ذریعے مثالی کام انجام پایا اور علماءِ حقہ کی زیرِ نگرانی اور ان کی آرا کی تعمیل واحترام کے ساتھ آگے بھی یہی قریب بہ یقین امید ہے، مگر یہ کام چوں کہ مسلمانوں تک ہی محدود ہے، غیر مسلموں تک دینی پیغام رسانی کا کوئی معقول نظم اس جماعت کا حصہ نہیں اور چند ایک استثنائی مثالیں چھوڑ کر

مدارس اور خانقاہوں کا بھی یہی حال ہے؛ اس لیے یہ جملہ مراکزِ دینیہ اصلاح کے زمرے میں داخل ہیں اور اپنی اپنی جگہ بساغنیمت ہیں کہ دین کا جو کچھ اجالا نظر آرہا ہے، انہیں کی دین ہے، مگر غیر اقوام میں تبلیغ دین کا پروگرام وہ بالکل ایک جداگانہ شئے ہے، جس کے لیے تعلیم المسلمین واصلاح المسلمین کی غرض سے موجود متعدد تنظیمات وتحریکات کی طرح، مستقل تنظیمات وتحریکات کا وجود از حد ضروری ہے، اسی وقت صحیح معنوں میں ملکی و عالمی سطح پر دینِ اسلام کی کماحقہ تبلیغ ہوسکتی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کا کماحقہ ازالہ ہوسکتا ہے۔

کسی بھی ملک میں دینی یا دنیوی پروگرام کی کام یابی کے لیے وہاں کے باشندگان کے جذبات واحساسات اور نفسیات ورجحانات کا پاس ولحاظ رکھنا پہلی شرط ہے، ورنہ وہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی اختتام کو پہنچ جائے گا۔ ہندوستان میں برادرانِ وطن کے مابین تبلیغ دین کے موقع پر ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کچھ غلط خیال وتنگ نظر تاریخ نویسوں کی تاریخی کتب نے ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کے آٹھ سو سالہ عہدِ حکومت کی بڑی بھیانک تصویر ان کے ذہن وخیال میں پیوست کر دی ہے، آپسی منافرت وبعد کی خلیج انہیں کتب کی پیدا کردہ ذہنیت کی دین ہے؛ لہٰذا ہمیں اللہ کے دین کا تعارف ایسے انداز میں پیش کرنا ہے کہ وہ اسے اللہ کی نعمت اور عطا باور کریں، قومی دین قرار دینے کی طرف ان کا ذہن بالکل ملتفت نہ ہو، بہ صورتِ دیگر فائدے کی جگہ نقصان کا قوی اندیشہ ہے۔ اس طریقِ کار کی رعایت کے ساتھ اور ذہنوں کے مطابق گفتگو کے ذریعے دینی پیغام رسانی سے امید ہے کہ موجودہ شکوک وشبہات سے لبریز تاریک فضا کی کایا کلپ ہوگی اور قادیانیت بغیر کسی مزاحمت کے خود ہی اپنے بل میں گھسنے پر مجبور ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

قادیانیوں کے بارے میں ایک لائق ذکر بات یہ بھی ہے کہ وہ برادرانِ وطن کے

بیچ اپنی مظلومیت کا رونا رو کر اور اپنی مسلم مخالف سرگرمیوں کا حوالہ دیکر اپنے کو ان سے قریب اور اسلام کی درست تعلیمات اور مسلمانوں سے انہیں متنفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جواہر لال نہرو جیسے لوگ بھی ان کی اس سازش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے، جن کی ذہنی صفائی کے لیے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کو زبان و قلم کے ساتھ میدان میں آنا پڑا تھا، اس لیے غیر مسلموں کو قادیانیوں کی حقیقت سے آگاہ کرنے اور اسلام کے اصل پیغام سے روشناس کرانے کا ایک آسان اور نفع بخش طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ماضی قریب کے غیر مسلم مفکرین اور سائنس داں حضرات کی ان تحریرات کو ان کی خدمت میں پیش کیا جائے، جن میں انہوں نے آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے اور آپ ﷺ پر نازل شدہ شریعت کی حقانیت و آفاقیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی سہارنپوری مدظلہم نے ''رسولِ اکرمؐ اغیار کی نظر میں'' کے زیرِ عنوان اپنی ایک تحریر میں، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''اسلام کی صداقت اغیار کی نظر میں'' اور کچھ دیگر ہندو مآخذ و مراجع سے، اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں، جن میں سے کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

پنڈت گوپال کرشن لکھتے ہیں:

''رشی محمد (ﷺ) کی زندگی کے بارے میں جب ہم وچار کرتے ہیں، تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ایشور نے ان کو سنسار سدھارنے کے لیے بھیجا تھا، ان کے اندر وہ شکتی تھی جو ایک گریٹ ریفارمر اور مہاپرش میں ہونی چاہیے''۔

(بہ حوالہ ماہنامہ آستانہ دہلی نومبر ۱۹۹۴)

شری کرشن اوتار ہنگولی آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر بالکل کھلے کھلے لفظوں میں رقم طراز ہیں:

''ہندوعقیدے کے مطابق انسانیت کی ارتقا کے لیے خدا کی طرف سے ایک کلکی اوتار یعنی آخری پیغمبر آئے گا، جو دنیا میں امن ومساوات قائم کرے گا۔ جو حضرات اس کلکی اوتار کی راہ پر آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں، انہیں اب راہ دیکھنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ وہ اوتار چودہ سو سال قبل سرزمینِ عرب پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے ظاہر ہو چکا ہے اور اصلاحِ انسانیت کی خدمت بہ خیر وخوبی انجام دیکر رحمت خداوندی سے جاملا ہے''۔

ہنکولی کے بہ قول یہ صرف ان کا کوئی ذاتی تخیل نہیں ہے؛ بلکہ شری وید پرساد اُپادھیائے جی سمیت بھارت کے آٹھ مشہور ومعروف سنسکرت پنڈتوں نے اس بات کی تصحیح وتصدیق پر اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔

(بحوالہ سویت ہفت روزہ پونے ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ عیسوی)

الفضل ماشہدت بہ الاعداء کے تحت یوں تو پنڈت گوپال کرشن جی کا یہ اعتراف ہی سو دلیلوں کی ایک دلیل ہے، تاہم مزید اطمینان کے لیے حضرت حکیم الامتؒ کے نقل فرمودہ غیروں کے اعترافی واقعات کو بھی اس تحریر میں شامل کیا جاتا ہے۔

پروفیسر باسورتھ اسمتھ لکھتے ہیں:

''بلاشک حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے رسول ہیں، اگر پوچھا جائے کہ افریقہ؛ بلکہ پوری دنیا کو مسیحی مذہب نے زیادہ فائدہ پہنچایا یا اسلام نے؟ تو کہنا پڑے گا کہ اسلام نے''۔

مہاتما ستیہ دھاری نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

''پیشوائے اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دنیا کو بے شمار قیمتی سبق پڑھاتی ہے اور آپ کی زندگی ہر ایک حیثیت سے دنیا کے لیے سبق آموز ہے بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھ سمجھنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل موجود ہو''۔

ہمارے نبی ﷺ کو ہمارے ملک کی نامور شخصیت مہاتما گاندھی جی نے ان بلند و بالا الفاظ میں خراجِ تحسین وعقیدت پیش کیا ہے:

''مغربی دنیا اندھیرے میں غرق تھی کہ ایک روشن ستارہ چمکا، اس نے بے قرار دنیا کو روشنی اور تسلی کا پیغام دیا میں پیغمبرِ اسلام کی زندگی کا مطالعہ کر رہا تھا جب کتاب پوری ہوئی، تو مجھے افسوس ہوا کہ ایسی عظیم الشان ہستی کا مطالعہ کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہ تھا، ہندوؤں کو کھلے دل سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، پھر وہ بھی میری طرح اس سے محبت کرنے لگیں گے''۔

(بہ حوالہ اسلام کی صداقت اغیار کی نظر میں از حکیم الامتؒ)

یہ حوالہ جات برادرانِ وطن کو اسلام اور مسلمانوں سے مانوس کرنے میں حددرجہ ممد ومعاون ثابت ہوں گے اور پھر خود اسلام کی فطری کشش اپنی طرف مائل کیے بغیر نہ چھوڑے گی انشاء اللہ۔ جب سیکولزم، کمیونسٹ اور سوشلزم پروپیگنڈے کی بنیاد پر اپنی افادیت ثابت کر سکتے ہیں، تو اسلام میں اس کی صلاحیت کہیں زیادہ ہے کہ وہ تو فطرت کا دین ہے، خود انسان کی فطرت جس کو قبول کرتی ہے۔ جس روز مثبت رخ سے مضبوط بنیادوں پر تبلیغِ اسلام کا اہم کام شروع ہوگا، تو اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ ملکی وعالمی سطح پر ایک عظیم دینی انقلاب برپا ہوگا اور مسیلمۂ کذّاب اور مرزا غلام قادیانی جیسے لوگ اور ان کے متبعین اپنی موت آپ ہی مر جائیں گے، جس کے لیے دورِ نبوت ودورِ صحابہ کی شکل میں ایک بہترین مثال ونمونہ ہمارے سامنے پہلے سے موجود ہے۔

○❖○

مفتی ہلال عثمانی مشاہیر کی نظر میں

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

مفتی فضیل الرحمٰن کا مالیر کوٹلہ میں ہونا میرا اور دارالعلوم کا وہاں ہونا ہے، مفتی فضیل الرحمٰن میں بلند حوصلگی اور علمی امنگ ہے۔

مولانا شریف حسن صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

مفتی فضیل الرحمٰن بہ حکم ''الولد سر لابیہ'' چشم و چراغ و ماہتاب اس خاندان کے ہیں، جو علم و فضل میں مصداق ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کے ہے۔ ہلال بن کر سامنے آئے جو بعد میں بدر و آفتاب ہوں گے۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ

سابق مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند

خاندان حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بحرِ بیکراں کی شاخ دیوبند کا عثمانی خاندان بھی اپنے فیضانِ علمی میں مشہور ہے۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن عثمانی، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اس خاندان کی وہ یگانۂ روزگار شخصیات ہیں، جن کے فیضانِ علمی سے ہزارہا تشنگانِ علوم سیراب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ان بزرگوں کی علمی یادگاریں ان کی علمی حیاتِ جاوید کا ثبوت ہیں۔

مسرت کی بات یہ ہے کہ چمنستانِ علم کا یہ شجر اب بھی سرسبز و شاداب ہے اور نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلۃ الذہب باقی ہے۔ عزیزم جناب مولوی مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی اسی خاندان کے چشم و چراغ، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے پوتے، مولانا قاری جلیل الرحمٰن کے صاحبزادے اور ہونہار اہل علم و اہل قلم ہیں۔ ان کی تحریر میں زبان کی سلاست و شگفتگی بھی ہے، ذوقِ لطیف کی چاشنی بھی ہے اور علم کی وسعت و گہرائی بھی؛ بہ یک وقت یہ خوبیاں بلاشبہ ان کی ذہانت، فکرِ رسا اور خداداد فراست کی غماز ہیں۔

ہز نائی نس نواب افتخار علی خاں آف مالیر کوٹلہ

۱۹۷۳ عیسوی کے نئے سال کے آغاز کو دارالافتاء مالیر کوٹلہ کے نئے دور کا آغاز کہا جاسکتا ہے، جبکہ سابق مفتی صاحب کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد دارالعلوم دیوبند کے فاضل استاذ مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب کو مفتیٔ اعظم مالیر کوٹلہ کے عظیم منصب کے لیے منتخب کیا گیا۔ فقہ اسلامی کی باریکیوں کو سمجھنا ہر شخص؛ بلکہ ہر عالم کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ معاملات کے تصفیے میں شرعی احکام کی نزاکتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے زبردست قوت فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور حالات و زمانہ کی بھی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ یہ اہالیانِ مالیر کوٹلہ اور پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ مفتی ہلال صاحب عثمانی نے اس منصب کو سنبھالا ہے۔ ایک اچھے مفتی اور مذہبی رہنما کو جن اوصاف اور صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہیے، وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور بفضلہ اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو اپنے علم و فضل میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو ان سے بہت کچھ ان شاء اللہ فائدہ پہنچے گا۔ حکومت بھی ان کی ہمت افزائی میں پوری فراخ دلی سے کام لے رہی ہے۔

مولانا علی نقی نقوی صاحب

صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجھے مالیرکوٹلہ میں دارالافتاء کی بناء اور اس کی کارکردگی کے متعلق معلومات حاصل کرکے بہت مسرت ہوئی، میرے خیال میں اگر اس مالیرکوٹلہ کے دارالافتاء کی مثال سے جو قائم ہے دوسرے مقامات کے مسلمان بھی فائدہ اٹھائیں، تو نہایت ہی مناسب اور اصلح ہوگا۔ جناب مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی سے ملاقات کرکے بہت خوشی ہوئی اور امید ہے کہ آپ اس دارالافتاء کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں اپنی سعی جمیل کامیاب طریقے پر جاری رکھیں گے۔

سنت ونو بھاوے کے نمائندوں کے تاثرات

آج مورخہ ۲۶-۴-۱۹۸۶عیسوی کو محترم مفتی صاحب کا شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ معاشی مذہبی حالات پر انہوں نے عالمانہ تقریر فرمائی۔ مفتی صاحب ایک عالم ہی نہیں؛ بلکہ انسانیت کے پورے پورے حامی ہیں اور اس مقولے پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں کہ گر قربِ خدا چاہے نیکی سے محبت کر بدی میں بہتری کی کوئی صورت ہو نہیں سکتی۔

مفتی سید احمد علی سعید سابق مفتی دارالعلوم دیوبند

دارالافتاء مالیرکوٹلہ میں مفتی جیسے قابلِ قدر عہدے پر تقریباً دس سال سے مولانا مفتی فضیل الرحمٰن صاحب فائز ہیں جو کہ خاندانی مفتی ہیں، ان کے دادا مفتی عزیز الرحمٰنؒ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی تھے، جو تقریباً چالیس سال دارالعلوم دیوبند میں مفتیٔ اعظم رہے۔ ان کے تایا مفتی عتیق الرحمن صاحب ہیں، جن سے انڈیا

کے عوام وخواص واقف ہیں۔ مفتی فضیل الرحمٰن صاحب بھی ایک قابل اور فہیم وذکی عالم ہیں، جو اس منصب کی ذمہ داریوں کو بہ احسن اسلوب انجام دے رہے ہیں۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب

ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد وترجمان آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

علمی گہرائی کے ساتھ ساتھ ان کے قلم کی خوب صورتی اور تحریر کی شگفتگی ودل آویزی علما واہلِ قلم کے لیے ایک نمونہ ہے، وہ مشکل سے مشکل مضمون کو آسان ترین زبان میں لکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، خشک سے خشک موضوع کو بھی زبان کی رعنائی دل چسپ بنادیتی ہے۔ سنجیدہ مضامین میں بھی ادب کی چاشنی اور گاہے طنز ومزاح کے نشتر اصحابِ ذوق کی ضیافت کرتے ہیں، ان علمی وقلمی سرفرازیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو فکرِ رسا عطا فرمائی اور قومی وملی مسائل پر ان کی سوچ جس قدر دور رس ہوتی ہے، وہ بھی ان کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو ہے؛ اس لیے مختلف ملی تنظیمیں ان کے مشوروں سے استفادہ کرتی ہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکنِ رکین اور مختلف تنظیموں کے رہنماؤں میں ہیں اور ہر جگہ ان کی رائے کو قدر ووقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (ماخوذ از پیش لفظ حیاتِ عزیز۔ صفحہ ۱۶)

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

استاذ حدیث وفقہ جامعہ رحیمیہ دہلی

مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ’’خاندانِ عثمانی‘‘ کے قابلِ فخر چشم وچراغ ہیں، بلاشبہ آپ ہندوستان کے باشعور علما میں شمار کیے جاتے ہیں، موصوف اپنی روایتی ذہانت وذکاوت اور شرافت ونجابت کی بنا پر ہر دل عزیز ہیں۔ مفتی صاحب مسلم پرسنل

لا بورڈ کے فعال رکن ہونے کے ساتھ دوسری دینی وقومی جماعتوں وتنظیموں سے بھی غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں، آپ پنجاب کے باہوش دینی قائد ہیں۔ مفتی فضیل الرحمن صاحب ہلال عثمانی ایک ادیب و انشا پرداز ہیں، آپ عنفوانِ شباب ہی سے دینی موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔

(ماخوذ از دنیائے اسلام کی چند عظیم شخصیتیں صفحہ ۱۱۶)

عبداللہ عثمانی

وہ ہمارے عہد کے نہایت فعال اور سرگرم عمل شخص ہیں اور ہمہ وقت خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ سب اس آب شارِ علم وتہذیب دارالعلوم کا طفیل ہے، جس کی کوکھ سے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مولانا محمد میاںؒ، مولانا حامد الانصاری غازی جیسے نادرۂ روزگار افراد نے جنم لیا۔ ہلال عثمانی مستند عالمِ دین، جید معلم اور ممتاز مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر مفتی بھی ہیں۔ ان کے قلم سے جہاں متعدد تصانیف نکلیں وہیں ہزار ہا فتاوی بھی ان کی فقہِ اسلامی پر نظر وفکر کا آئینہ ہیں، یہ فتاوی اپنی زبان واسلوب اور جامعیت کے لحاظ سے بھی اہم ہیں، اس اہم کام میں انہوں نے مفتی عزیز الرحمٰن کے طرزِ تحریر کی کامیاب پیروی کی ہے۔ وہ سہل سادہ اور عام فہم زبان میں مستند حوالوں کا التزام کرتے ہیں۔

(ماخوذ از چند شخصیتیں زبان وبیان کے اچھوتے انداز میں صفحہ ۱۱۶)

منظور عثمانی دیوبندی

مولانا ذوالفقار علیؒ اور مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ اور ان کی اولادوں نے جو بھی نام پایا، وہ دینی علوم کی وجہ سے پایا۔ اس کے برخلاف جس نے بھی دنیاوی علوم حاصل

کیے، وہ سارے خاندانی خصائص کے باوجود دنیا کی بھیڑ میں گم ہوکر رہ گیا۔تقریباً سب کا انجام اکبر کے اس شعر کا سا ہوا:

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

خوشی کی بات ہے کہ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے بزرگوں کی میراث کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، وہ ہمیشہ ہی روایتِ اسلاف پر گامزن رہے۔مفتی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سرزمینِ پنجاب میں صحیح عقائد کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔سرزمینِ پنجاب میں ایک اور عظیم کارنامہ ادارہ دارالسلام اور مدرسہ تعمیرِ سیرت کا قیام ہے۔

ہلال عثمانی صاحب مستند عالم، جید معلم، معتبر مفتی، بہترین خطیب اور ممتاز مصنف ہیں، متعدد تصانیف، ہزارہا فتاوی ان کے قلم سے نکلے ہیں۔

ایسے دیدہ ور کم ہوتے ہیں، جو دینی اور دنیوی معاملات میں یکساں طور پر معزز و محترم ہوں۔یہ خوبی مفتی عتیق الرحمٰن کے بعد میں نے مفتی فضیل الرحمٰن میں پائی۔مفتی صاحب کے حضور میں نے احتراماً وہ سر جھکے دیکھے، جو اقتدار کی اعلیٰ سطحوں پر متمکن تھے۔

قصہ مختصر ہلال عثمانی اپنے دادا، پڑدادا اور تایا کی علمی روایتوں کے امین و وارث ہیں۔کم ہوتا ہے کہ تین تین نسلوں کا قابلِ فخر نقیب ہو، ماشاء اللہ مفتی فضیل الرحمٰن کو یہ اعزاز حاصل ہے۔سنا ہے ثقلِ سماعت کا شکار ہوگئے ہیں، بہر حال یہ بھی ان کے جنتی ہونے کی دلیل ہے۔اللہ انہیں تادیر ملت کی رہنمائی کے لیے قائم رکھے۔آمین

مولانا نایاب حسن قاسمی

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ایک شریعتِ اسلامی کے اسرار و رموز سے بھرپور

واقفیت رکھنے والے عالمِ دین تو ہیں ہی، ساتھ ہی عصری تقاضوں اور مطالباتِ زمانہ پر بھی ان کی نظر بڑی وسیع ہے؛ اس لیے ان کی تحریریں بڑی تحقیقی ہوتی ہیں، وہ کسی بھی موضوع پر لکھتے وقت ہر ناحیے سے اس پر غور کرتے اور پورے انشراح وانبساطِ قلب کے ساتھ لکھتے ہیں اور کسی بھی اعتبار سے اس موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑتے ہیں، اسی طرح زبان واسلوب کے اعتبار سے بھی ان کے قلم پارے بڑے پرلطف اورنشاط بخش ہوتے ہیں، الفاظ کی شیرینی، تعبیرات کی دلکشی، اسلوبِ بیان کا جمال اور محاورات و امثال کا برمحل استعمال ان کی تحریر کی افادیت ومعنویت کو کئی آتشہ کردیتے ہیں اوران کا قاری جہاں نت نئی معلومات اور اسلامی علمی و تاریخی نکتوں سے فیض یاب ہوتا ہے، وہیں اس کا ادبی مذاق بھی آسودگی حاصل کرتا ہے۔

اخبارات ورسائل میں چھپنے والے سینکڑوں مضامین، اسی طرح مختلف انٹرنیشنل سیمیناروں میں پڑھے گئے تحقیقی مقالات کے علاوہ مفتی صاحب کی باضابطہ تصنیفات کی تعداد ساٹھ سے زائد ہے، جوتفسیر قرآن وتشریحِ حدیث سے لے کر سیرتِ نبوی، تذکرہ شخصیات، فقہ اسلامی، عربی و فارسی کی نصابی کتابوں اور دعوتی وتبلیغی و اصلاحی موضوعات کومحیط ہیں۔

مولانا محمد ساجد کھجناوری

مدرس حدیث وفقہ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

عالمی شہرت کی حامل دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے عمل تاسیس تعلیمی ترقیات روحانیت کی تکبیر مسلسل اورزمانی ومکانی وسعتوں کا انتساب دیوبند کے جن قابل ذکر خانوادوں سے جڑا ہے اس میں خاندانِ عثمانی بھی نمایاں شناخت کا حامل

رہا ہے چنانچہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی، تاج الادبا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، فقیہ دوراں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جیسے کئی بھاری بھرکم نام ہیں جو ہماری کلاہ افتخار کے روشن ستارے ہیں۔

مخدوم گرامی مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند بھی اسی علمی خاندان کے گل سرسبد ہیں۔ عظیم نسبتوں کے حامل مفتی ہلال عثمانی کی تعلیم وتربیت کا مرکز دارالعلوم دیوبند ہی رہا، گو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جیسے مناہل کے بھی وہ جرعہ نوش رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی شخصیت علم وکتاب کا خوب صورت مرقعہ ہے۔ ذکاوت وفراست کی دولت عظمیٰ جسے میسر ہو اور قلم وقرطاس کی کاشت جس کا پسندیدہ موضوع رہا ہو، بھلا اس کی عظمتوں کا کیا ٹھکانہ۔ آج ہندوستان کے تعلیمی اور ملی حلقوں میں اپنی علمی رفعتوں، فقہی نکتہ سنجیوں، قلمی معرکوں اور اصابت رائے میں مفتی ہلال صاحب کو ضرب المثل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ فقہ وفتاوی میں لازمی پختگی کے ساتھ توسع اور جادۂ اعتدال سے منحرف نہ ہونا بھی ان کے معنوی کمال کو درشاتا ہے، عربی فارسی اور اردو زبان پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے، علم وتحقیق کے تقریبا ہر گوشہ پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا پڑھا ہے وہ اتنا مدلل جامع اور ہمہ گیر ہوتا ہے کہ قاری نئے نئے انفس وآفاق کے مطالعے سے ہم آشنا ہوتا ہے، ایسی باکمال ہستی کو دیکھ اور پڑھ کر یہی آرزو مچلتی ہے کہ تم جیو ہزار برس۔

○❖○

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

حضرت مفتی فضیل الرحمٰن صاحب نے جس ماحول میں پرورش پائی اور ان کی تربیت ہوئی، جن لوگوں کے درمیان رہے اور جس درس گاہ میں تعلیمی مراحل طے کیے، سب جگہ ان کا رابطہ ان لوگوں سے رہا جو اپنے آپ میں ایک مثال اور ایک نمونہ تھے۔ جن لوگوں کے درمیان آدمی رہتا ہے زندگی گزارتا ہے ان کے اثرات زندگی پر، دل ودماغ پر، افکار وخیالات پر یقینی طور پر مرتب ہوتے ہیں، حضرت مفتی صاحب کی طبیعت میں صلاح کا غلبہ رہا اور انہوں نے ایک صاف ستھری قابلِ رشک زندگی گزاری۔ وقت کو کام میں لانے کا سلیقہ اور اس کی قیمت کا اندازہ جن لوگوں کو ہوتا ہے، وہ کبھی خالی نہیں بیٹھتے، کچھ نہ کچھ کرنا ان کا مزاج ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے بڑے کام کیے ہیں اور اپنے وقت کو قیمتی کاموں میں لگایا ہے، ان کی مطبوعہ کتابیں بتارہی ہیں کہ انہوں نے عمر رواں کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا اور وقت کی قدر کی۔

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب، عثمانی خاندان کے وہ واحد فرد ہیں کہ جن پر آج عثمانی خاندان کے علم، کمال اور بلند کرداری کی پوری عمارت ٹکی ہوئی ہے، انہوں نے نہ صرف اپنی ذات اور کمال کا ثبوت فراہم کیا؛ بلکہ اپنے بڑوں کے نام کو زندہ رکھا اور توانائی بخشی۔ وہ لوگ جو صاحبِ نسبت ہیں ان کو دوہری محنت کرنی پڑتی ہے کہ وہ خود بھی کچھ بن کر دکھائیں اور اپنے بڑوں کے نام اور شہرتوں کو بھی باقی رکھیں۔ مفتی صاحب اس معیار پر پورا اترتے ہیں، عمر کی پچھتر سے زائد بہاریں دیکھ چکے ہیں صحت اب ان کی ضعف کے لپیٹ میں ہے چلنے پھرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے؛ لیکن تحریر اور تقریر، تصنیف وخطابت کا کامیاب سفر بہت سوں کے لیے عنوانِ عمل ہے۔ بلاشبہ ان کی ذات اس وقت جماعتِ دیوبند کے لیے فخر وامتیاز کا

باعث ہے کہ ایسے ہی لوگوں سے دارالعلوم دیوبند کی تاریخ جلا پاتی ہے اور اس تاریخ کے جلیل القدر انسانوں کی طرح وہ بھی ہمارے اس دور کے برگزیدہ لوگوں میں ہیں۔ اللہ رب العزت ان کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے کہ یہی لوگ پچھلوں کی زندگی کی یادیں تازہ کرنے والے اور ان کے پاکیزہ شب و روز کی داستان بیان کرنے والے ہیں۔ یہ ہیں تو وہ پاکیزہ سلسلہ جاری ہے، جس سے دیوبند کی شناخت اور پہچان ہے۔

○❖○

کتابِ زندگی کے چند درخشاں ورق

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کی خدماتِ علمیہ کا ہر حلقے و طبقے کے ذی علم افراد نے بہ صدقِ دل اعتراف کیا ہے، جس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ جتنے مسالک پائے جاتے ہیں، انسانیت اور اسلام کی بنیاد پر آپ سب کے ساتھ اشتراک واتحاد کے پرزور داعی ہیں اور اپنی حد تک اس کے لیے عملی کوشش بھی کرتے رہے ہیں، مسالک اور ان میں مختلف فیہ جزوی مسائل کے بہانے جو بعد وانتشار کی کیفیت اس وقت دنیا کے اکثر خطوں کو محیط ہے، حضرت مفتی صاحب اس کے سخت مخالف ہیں اور موجودہ حالات کے تناظر میں اس فضا کو مسلمانانِ عالم کے حق میں سمِّ قاتل کا درجہ دیتے ہیں۔ آپ کی تصنیفات بھی آپ کی اس نادر ومفید سوچ کی بہترین نمائندہ و ترجمان ہیں۔ تفسیر نور القرآن جو حال ہی میں شائع ہوئی، اس میں مسالک ومشارب سے بالاتر ہوکر فقط اسلام کی ترجمانی کی گئی ہے، اس تفسیر نے اپنی اس انفرادیت و اختصاصیت کے باعث مختلف مکاتبِ فکر سے وابستہ افراد سے خراجِ تحسین وعقیدت حاصل کیا ہے اور ہر جگہ شوق ورغبت کے ہاتھوں وصول کی گئی ہے۔

یہ وسعتِ ذہنی آپ کے یہاں شروع ہی سے رہی ہے، اس میں بڑی حد تک خاندانی اثرات وروایات کا بھی دخل رہا ہے اور خود آپ کے تجربات ومشاہدات بھی اس راہ میں آپ کے معین ومددگار ثابت ہوئے ہیں۔

آپ کے اخلاقِ حسنہ اور عظیم اداؤں میں سے ایک یہ بھی نرالی ادا ہے، جس نے آپ کی شخصیت کو اپنوں وبیگانوں میں ہر دل عزیزی اور دلی احترام ومحبت کا درجہ بخشا ہوا ہے اور یہ بھی اسی کا طفیل وبرکت ہے کہ آپ کی لسانی وقلمی خدمات سے بلا تفریقِ مذہب وملت انسانیت مستفیض ہو رہی ہے۔

آپ جب دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں اپنے استاذ مفتی مہدی حسن شاہ جہانپوریؒ کی زیرِ نگرانی فتاوی نویسی کی مشق وتمرین میں مشغول تھے، اس عہد کی بات ہے، ہمارے کئی مدارس کے دارالافتاء مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی ہم خیال جماعت سے متعلق استفتائات کے جواب میں مولانا مودودی کی تحریروں کو بنیاد بنا کر اس جماعت کے خلاف فتوے صادر کر رہے تھے، بعض جوشیلے قسم کے مستفتی حضرات ان فتاوی کو اشتہارات کی صورت میں چھاپ لیتے تھے اور ملک کے مرکزی وحساس شہروں میں ایسے اشتہارات آویزاں کیے جارہے تھے، اس سب سے ملک بھر میں ایک عجیب سی شورش برپا تھی۔ مولانا منت اللہ رحمانیؒ ان دنوں دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر تھے اور شوریٰ کی کسی نشست میں شرکت کی غرض سے دارالعلوم دیوبند آئے ہوئے تھے، حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے حضرت مولانا رحمہ اللہ سے بہ وقتِ ملاقات اپنی یہ بات ان کی خدمت میں رکھی کہ ”میری رائے میں حضرتِ والا تھانویؒ کے اصول کے مطابق صاحبِ تحریر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بہ راہِ راست ملاقات کے ذریعے یا خط وکتابت کے ذریعے ان سے- ان کی متنازع تحریروں کی بابت- ان کی مراد ومنشأ معلوم کی جائے اور جب تک یہ گفتگو کسی نتیجے تک نہ پہنچ جائے، ہمارے دارالافتاء اس حوالے سے احتیاط برتیں“ مولانا منت اللہ رحمانیؒ جو خود وسیع الفکر اور صحیح العقیدہ ایک متبحر عالمِ دین تھے، اس بات سے بے حد خوش ہوئے، اس رائے سے کلی اتفاق ظاہر فرمایا اور ایک تجویز کی شکل میں ارا کینِ شوریٰ کے سامنے یہ بات رکھی اور پھر امارتِ شرعیہ بہار کی جانب سے ایک سوال نامہ مولانا مودودی کے نام بھیجا گیا۔ مولانا مودودی کی کتاب ”رسائل ومسائل“ کی چوتھی جلد میں امارت شرعیہ کا وہ سوال نامہ اور مولانا کی طرف سے دیے گئے اس کے جوابات شائع شدہ ہیں۔ غرض یہ ایک واقعہ ضمناً نوکِ قلم پر آ گیا، ورنہ آپ کی حیات میں ایسی کئی مثالیں اور واقعات

ہیں، جو آپ کی اس مخصوص فکر کا آئینہ دار ہیں اور جن سے آپ کی شخصیت کا یہ پہلو کھل کر سامنے آتا ہے کہ آپ مسلکی اختلافات کی خلیج کو پاٹنے اور اسے کم سے کم کرنے کے قائل ہیں اور ہر ایسے عمل کے مخالف ہیں، جو اس خلیج کو مزید وسیع اور گہرا کرنے والا ہو۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کی عملی زندگی اپنے دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کی زندگی کے ساتھ کافی حد تک ہم آہنگ ہے۔انہیں کے مثل زندگی میں حد درجہ سادگی ہے، کسر نفسی اور انکسار وتواضع کا آنکھوں دیکھا حال یہ ہے کہ ان کے پاس آنے والا خواہ شناسا ہو یا غیر شناسا، اس کے ساتھ ادب واحترام کا وہ معاملہ فرماتے ہیں کہ آنے والا غرقِ ندامت ہو جاتا ہے، احقر کو یوں تو ۲۰۱۱ عیسوی سے ہی آپ کی خدمت وصحبت سے مستفید ہونے کے وقتاً فوقتاً مواقع ملتے رہے ہیں؛ مگر لدھیانہ کے مستقل قیام کے بعد حاضری کے ان گنت مواقع نصیب ہوئے، ہر مرتبہ حدیثی، فقہی، اصلاحی، دعوتی اور دیگر مختلف موضوعات سے متعلق نئی نئی باتیں اور اہم ہم انکشافات آپ سے سننے کو ملتے ہیں، کئی علمی نکتے جو محض آپ کے ذِہن رسا کا نتیجہ ہوتے ہیں، انہیں کبھی ادعائی انداز میں ذکر فرمایا ہو احقر کو ایسی کوئی ایک مثال بھی محفوظ نہیں، اپنے اکابر کے حالات کے ضمن میں یا کسی خاص مسئلے پر گفتگو کے دوران وہ ایسے لطائفِ علمیہ بے تکلف بیان کر جاتے ہیں اور حاضر باش افراد اپنے اپنے ظرف کے مطابق دامنِ مراد بھر کر لوٹتے ہیں۔نرم مزاجی آپ کی شخصیت کا ایک اہم عنصر ہے، گفتگو کرتے ہیں، تو حد درجہ متانت وسنجیدگی کے ساتھ، جذباتی اور سطحی باتوں سے بالکلیہ احتراز فرماتے ہیں، دیوبند اور مالیر کوٹلہ ہر دو جگہ آپ کو مخالفتوں کے دور سے گزرنا پڑا، تعجب ہے کہ ایسے صبر آزما مواقع پر بھی کوئی سخت بات آپ کے منہ سے نہ نکلی، جس کا ثمر من جانب اللہ آپ کو یہ عطا ہوا کہ متعلقہ اشخاص آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی کے طالب ہوئے اور آپ نے بھی سنتِ یوسفی کے مطابق سب کو

معاف فرما دیا۔آج الحمدللہ وہ آپ کے مخصوص قدردانوں میں شامل ہیں۔آپ کی حیات احادیثِ نبویہ "اشدالناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل" اور "صل من قطعك واعف عمن ظلمك واحسن الی من اساء الیك" کی زندہ وجاوید تصویر ہے۔دراصل یہ بھی من جملہ ان خوبیوں میں سے ایک ہے، جو گویا آپ کو اپنے دادا مرحوم کی وراثت کے طور پر عطا ہوئی ہیں۔

مفتی صاحب کی صحت اب تشویش ناک حد تک انحطاط کا شکار ہے،قوتِ سماعت وبصارت تقریباً جواب دے چکی ہیں؛اس لیے زیادہ تر اوراد و وظائف میں اشتغال رہتا ہے۔صحت کے دورِ آخر کا وہ حصہ جو میں نے دیکھا، اس کا حال یہ تھا کہ حوائجِ بشریہ میں مشغول وقت کے علاوہ آپ کا تمامتر وقت علمی کاموں میں صرف ہوتا تھا،اس دور میں جب بھی جانا ہوا،آپ کو کسی کتاب کے مطالعے یا کوئی مضمون لکھنے لکھانے میں مستغرق پایا۔

آپ کو اوصاف وکمالات کے لحاظ سے مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کا ثنی قرار دینا بالکل بجا ہوگا۔دادا مرحوم کے دو نمایاں وصف اعراض عن الدنیا ورغبت الی الآخرۃ اور خدمتِ خلق بھی تھے،احقر نے حضرت مفتی صاحب کی عملی زندگی کا پچھلے تین چار سالوں میں بہ فضلِ باری بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے،آپ کی خداترسی اور استحضارِ آخرت کی ہمہ وقتی کیفیت کی ہر وہ شخص شہادت دے گا، جسے آپ کی صحبت میں رہنے کے کم یا زیادہ مواقع میسر ہوئے ہیں۔شاید ہی کوئی مجلس فکرِ آخرت اور ذکرِ الٰہی سے خالی رہتی ہو،اسہال ضعف وعلالت اور متعلقین واہلِ خانہ کے خیرخواہانہ مشوروں کے باوصف رمضان المبارک کے کامل روزے رکھے۔جمعرات کو بعد مغرب آپ کی مجلسِ ذکر میں کافی تعداد میں مقامی احباب شریک ہوتے ہیں،اس مجلس میں ذکر ہوتا ہے اور آخر میں شرکائے مجلس کو فکرِ آخرت کی ترغیب دی جاتی ہے۔حال میں "دین سیکھیے" کے

نام سے آپ کی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے، جس کی سطر سطر سے اعراض عن الدنیا ورغبت الی الآخرۃ کا مضمون مترشح ہے۔ آپ اپنے ہی بہ قول ''ذہنی وفکری طور پر مابعد الموت کی ابدی زندگی کے لیے پا بہ رکاب ہیں'' اور اس ذاتی تیاری کے ساتھ ساتھ تحریر اور تقریر کے ذریعے یہی فکر عامۃ الناس میں منتقل کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا ہے۔

مفتی صاحب کو اس شہر میں آئے چھیالیس سال مکمل ہونے کو ہیں، اس طول طویل عرصے میں یہاں کے اہالیان نے دینی وفقہی رہنمائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کئی نازک مواقع پر، آپ کی ذات سے مادی منافع بھی حاصل کیے۔

مفتی صاحب مدظلہم نے اپنے حقیقی چچا سسر مفتی حمید حسن صاحب عثمانیؒ کی خواہش واصرار پر مفتیٔ اعظم پنجاب کا منصب سنبھالا تھا۔ مفتی صاحب مدظلہم کی باضابطہ تقرری کے دو ہی سال بعد سابق مفتی صاحبؒ رحلت فرما گئے تھے۔

مفتی صاحب مدظلہم کو مفتیٔ پنجاب کا قلم دان سنبھالے ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ کی خدمت میں نکاح وطلاق کا ایک ایسا معاملہ پیش ہوا، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے چند در چند الجھاؤ لیے ہوئے تھا اور سرکاری محکمے کے بعض ملازمین نے مفتی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس معاملے کے رفع کی صورت میں آپ کی ملازمت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ سابق مفتی صاحب نے شوہر کے حق میں پہلے سے اپنا فیصلہ صادر فرما دیا تھا۔ مفتی ہلال عثمانی صاحب نے اپنی ملازمت کو درپیش خطرہ سے بالاتر ہو کر اس فیصلہ پر اپنی حتمی مہر ثبت فرما دی اور اس طرح اس بیچارے غریب انسان کے ایک بڑی مشکل سے بہ سلامت نکل جانے کا آپ ذریعہ بنے۔

پھگواڑہ جالندھر کی جامع مسجد میں مجاہدِ آزادی حضرت مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانویؒ ایک لمبے زمانہ تک امام وخطیب رہے تھے اور اب اسی مسجد سے متصل بہ جانبِ شرق مدفون ہیں۔ تقسیم کے بعد کے مشرقی پنجاب میں اسلام اور اسلامی

تعلیمات کی نشاۃِ ثانیہ میں مولانا کی خدمات کا بڑا دخل ہے۔مولانا مرحوم قائد آزادی، رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے اور دارالعلوم دیوبند کے مثالی ونامور فرزند تھے۔علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو اپنے اس شاگرد سے دلی محبت تھی اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا، جب وہ ایک سال کی اسیری کے بعد لدھیانہ سینٹرل جیل سے رہا ہوئے تھے اور اپنے والدِ ماجد رئیس الاحرارؒ کی معیت میں دیوبند کے سفر پر گئے تھے۔

عثمانی خاندان اور علمائے لدھیانہ کے اس خانوادے میں قربت قدیم سے چلی آرہی ہے۔ بہ قول مفتی ہلال عثمانی مدظلہم ''تایا مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جب کبھی مالیرکوٹلہ تشریف لاتے تھے تو آتے ہوئے یا واپسی کے سفر میں لدھیانہ جاکر اس خاندان کے موجودہ اکابر سے ضرور ملاقات فرماتے تھے۔تاحیات ان کا یہی معمول رہا'' اس تعلق کو مفتی صاحب نے بھی خوب نبھایا۔مولانا خلیل الرحمٰن صاحب اور ان کے مرحوم برادران مولانا سعید الرحمٰن لدھیانوی و مولانا مفتی احمد رحمانی لدھیانوی جب تک بہ قیدِ حیات رہے، آپ نے ان کے ساتھ اپنے اکابر کا سا معاملہ رکھا اور اب بھی آپ کے علماء لدھیانہ کے موجودہ علمی وروحانی جانشین مجلس احرارِ اسلام ہند کے جرأت مند قائد و امیر، پنجاب کے شاہی امام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ثانی لدھیانوی مدظلہم اور دیگر افرادِ خاندان کے ساتھ بڑے خوش گوار برادرانہ تعلقات قائم ہیں۔

ایک دفعہ مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانویؒ نے حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے ایسا کام کرنے کو کہا، جو آپ کے لیے قانونی لحاظ سے خاصا مشکل تھا؛ مگر آپ نے یہاں بھی اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال کر ایک بزرگ جوڑے کے اپنے کسی غیر ملک میں مقیم صاحبزادے کے پاس پہنچنے کے راستے وا کیے۔ایک مرتبہ آپ نے

مجھ حقیر سے دوران گفتگو یہ دلی بات کہی تھی کہ ''مالیر کوٹلہ آنے کے بعد ایسے کئی کام کر ڈالے، جن سے ملازمت کے خطرات سے دوچار ہونے کے قوی امکانات تھے۔ بس پیشِ نظر یہ تھا کہ لوگوں کی حتی الوسع راحت رسانی کے اسباب فراہم کیے جائیں اور ملازمت اگر چلی بھی گئی، تو اس کا نعم البدل دارالعلوم دیوبند کی تدریس پہلے سے موجود ہے۔ اللہ کا شکر ہے مسلمانوں کے پیچیدہ کام ہمیشہ بے خوفی کے ساتھ کیے اور ملازمت پر کبھی کوئی حرف نہیں آیا'' ایسے نازک و پر خطر کام مفتی صاحب جیسے خدا ترس بندگانِ خدا ہی سے متوقع ہیں، جن کا دل خدمتِ خلق کے پاکیزہ جذبات سے معمور ہو اور جنھوں نے دوسروں کے کام آنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہو۔

کئی سال پہلے کی بات ہے، راقم الحروف ان دنوں غالباً دارالعلوم دیوبند میں طالب علم تھا اور چند روزہ رخصت پر نانا مرحوم مولانا قاری محمد ہاشم صاحب خلیلی گومٹویؒ سابق شاہی امام وخطیب جامع مسجد وعیدگاہ مالیر کوٹلہ پنجاب کے وطنِ ثانی مالیر کوٹلہ آیا ہوا تھا۔ حسبِ معمول بعد عصر مفتی صاحب مدظلہم کی خدمت میں حاضر تھا، عصر اور مغرب کے بیچ ایک ضعیف ومعمر خاتون آئیں، جس کی قوتِ سماعت جواب دے چکی تھی، یہ ایک مفلوک الحال غربت زدہ ایسی ضعیفہ تھی، جس کی بدنصیب اولاد نے اس عمر میں انہیں اپنے گھر سے نکال رکھا تھا، مفتی صاحب نے کچھ نقد رقم کے ذریعے اس کی مدد فرمائی اور احقر سے فرمانے لگے ''کیسی بدنصیب اور خوفِ خدا سے عاری ہے وہ اولاد، جس نے اس بڑھیا کا اس عمر میں یہ حال کر ڈالا ہے'' یہ تو محض معدودے چند وہ واقعات ہیں جن سے یہ عاجز ذاتی واقفیت رکھتا ہے؛ ورنہ اس قسم کے خدا جانے کتنے واقعات پیش آئے ہوں گے اور کتنے بے آسرا اور بے یار ومددگار لوگوں کے حق میں آپ خضرِ راہ ثابت ہوئے ہوں گے۔

دارالافتاء کا عظیم واہم کام جہاں قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ عمیق ودقیق علوم کا متقاضی ہے وہیں بے پناہ قوتِ عمل، جہدِ مسلسل، بے باکی وحق گوئی اور حب جاہ ومال سے بالکلیہ دوری جیسے صالح اوصاف کا بھی طالب ہے، ایسے ہی علمی وعملی کمالات و ملکات کو فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی دوررس ودوربیں نگاہ نے مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ کی ذات میں تاڑ لیا تھا اور پھر انہیں کے حکم ومشورے پر مفتی صاحب مرحوم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے عظیم منصب پر فائز ہوئے، مابعد کے حالات نے عوام وخواص سب سے آپ کے فیصلے کی صداقت کا اعتراف کرایا، چناں چہ اس نحیف الجثہ شخص سے دارالعلوم کے اس مرکزی شعبے نے جس طرح ترقی کے مراحل طے کیے اور ان کی زیرِ نگرانی ایشیاء کو جو عظیم محدث وفقیہ نصیب ہوئے، ان سے ایک جہاں واقف ہے۔''عیاں راچہ بیاں''

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال صاحب اپنے خاندان کے شہرہ آفاق اکابر وعلما مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ، مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ وغیرہ کے علوم ومعارف کے امین ووارث ہیں، مفتی صاحب کی علومِ قرآن وحدیث پر گرفت کا زمانہ قائل ہے، ان کی فقہی مہارت کے معترف ماضی اور حال کے وہ نامور فقہاء ہیں، جن کا نام ہی اپنی جگہ ایک عظیم تر شہادت ہے، حضرت کی فقہی خدمات کی سراہنا ملک کے جن مشاہیر فقہا نے کی ہے، اس کی قدرے تفصیل ''دارالافتاء مالیر کوٹلہ'' اور ''مفتی ہلال عثمانی مشاہیر کی نظر میں'' ان دو ماسبق عنوانات کے ذیل میں آچکی ہے۔

مفتی صاحب کا یہ دینی سفر جو ساٹھ پینسٹھ سالہ طویل عرصے کو محیط ہے، اس بات کا شاہدِ عدل ہے کہ انہوں نے تدریس، تحریر اور تقریر کے ذریعے دینِ متین کی خدمت کے حوالے سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور مختلف ملی، سماجی اور رفاہی پلیٹ

فارموں سے انہوں نے اسلامیانِ ہند کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان سب کی بنا فقط رضائے الٰہی پر قائم ہے۔ اس کے عوض انہیں عزت وشہرت کی طلب ہے اور نہ ہی مال وزر کی۔ بے نفسی اور اخلاص وللّٰہیت کی انتہا ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے باوجود زبانِ قال سے یہی کہتے ہوئے سنے گئے کہ ''مجھ سے اپنی زندگی میں اسلام اور مسلمانوں کی کوئی قابلِ ذکر خدمت انجام نہ پاسکی، بس وہ رب کریم ہی اپنے فضل سے کسی ٹوٹے پھوٹے عمل کو باعث نجات قرار دے دیں، تو اس ضعیف وناتواں کی آخرت سنور سکتی ہے''

یہ اس شخص کا حال وقال ہے، جس نے خدمتِ دین کی راہ میں دنیاوی مفادات کو اپنے قریب تک نہ آنے دیا اور جہاں غلط راہوں سے اس دنیا نے قدم بوسی کی کوشش کرنی چاہی، تو آپ نے روایاتِ اسلاف کے مطابق اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے تک کے روادار نہ ہوئے۔ آپ کی حیات میں ایسے بہت سے موڑ آئے کہ خلافِ شرع بات پر آپ کی تصدیق وسند حاصل کرنے کے لیے آپ کو بڑی بڑی رقموں کی پیش کش کی گئی، مگر الحمدللہ آپ کے ثبات و استقلال اور حق گوئی کے آگے ہر ایسی ناجائز کوشش نے ہر مرتبہ دم توڑا۔

مالیر کوٹلہ کا چھیالیس سالہ قیام ایسی کئی ایک مثالیں اپنے اندر لیے ہوئے ہے، صرف ایک مثال خود آپ کی زبانِ قلم سے نقل کی جاتی ہے، اسے پڑھیے اور خدمتِ دین کے تئیں آپ کے خلوص وللّٰہیت اور ثبات واستقلال کا اندازہ آپ خود ہی لگائیے۔

لکھتے ہیں:

> ''ایمرجنسی کا زمانہ تھا، اندرا گاندھی کے بیٹے سنجے گاندھی نے پورے ملک میں جبری نس بندی کی مہم چلا رکھی تھی، اس زمانے میں یہاں مالیر کوٹلہ میں ایک نئے آئی ایس آفیسر پیارے رام، ایس ڈی ایم مقرر ہوئے۔
>
> ایک روز ایس ڈی ایم صاحب نے تحصیل دار صاحب کو میرے پاس

بھیجا،معلوم ہوا کہ ایس ڈی ایم صاحب کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں،اس وقت ایس ڈی ایم کا دفتر یہیں قریب میں پرانی کچہری میں تھا۔میں گیا تو وہ اندر ڈرائنگ روم میں لے گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ سرکار نے اتنے آپریشن کا کوٹہ مقرر کردیا ہے،میں کوشش کے باوجود بہت کم آپریشن کرا سکا ہوں، یہاں مالیر کوٹلہ میں کیوں کہ مسلم آبادی ہے،یہ لوگ نس بندی کا آپریشن نہیں کراتے اور کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں جائز نہیں ہے۔اگر آپ اس کے متعلق جائز ہونے کا فتوی دے دیں،تو میرا کام آسان ہوجائے گا۔

میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے،مگر وہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا،انہیں تو سرکاری کوٹہ پورا کرنے کی فکر تھی۔

انہوں نے اشارۃً یہ بھی کہا کہ میرے پاس ریڈکراس کے فنڈ کے نوے ہزار روپے پڑے ہوئے ہیں،آپ ان کو کہیں بھی خرچ کرسکتے ہیں۔

جب بات بنتی نظر نہ آئی،تو انہوں نے کچھ دھمکی آمیز بات بھی کہی۔

نرم اور گرم دونوں باتوں کا میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا۔اس زمانے میں ہمارے ضلع سنگرور کے ڈپٹی کمشنر ڈاکٹر رتن کمار ہوا کرتے تھے،انہوں نے بھی بہانے سے بلا کر مجھے کافی سمجھایا۔

دارالعلوم دیوبند کے میرے بڑے مشفق حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب،ان کو معلوم ہوا تو انہوں نے نرمی کا مشورہ دیا،ان سے قرابت کا تعلق بھی تھا کہ ان کی بیٹی کی شادی میرے چھوٹے بھائی سے ہوئی تھی اور ویسے بھی وہ بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔حالات بھی بڑے سنگین تھے۔جے

پرکاش نارائن اور بڑے بڑے لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ دہلی میں ترکمان گیٹ پر جو واقعات پیش آئے تھے، وہ بھی سامنے تھے۔

مگر ان تمام حالات کے باوجود جو خطرے سامنے تھے، ان کو محسوس کرتے ہوئے بھی میں نے اپنے رویے میں ذرا لچک پیدا نہیں کی۔ بہت کچھ دباؤ سہنا پڑا اور اس کا ردِّ عمل بھی بعد میں سامنے آیا۔ اس طرح اور بھی واقعات متعدد بار پیش آئے"۔

(بہ حوالہ میرے قابلِ احترام اساتذۂ کرام صفحہ ۵۸-۵۹)

بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسوم وکفریات کے خلاف کامیاب جہاد

فضلائے دارالعلوم کا طغرائے امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے عقائدِ حقہ کی ترویج و اشاعت اور بدعات وخرافات اور رسوم وکفریات کے کامل تعاقب کا کام بلاخوف لومۃ لائم ہر دور میں کیا ہے۔اس فریضے کی انجام دہی کی خاطر وہ بعض مواقع پر وقت کے حکمرانوں سے بھی ٹکرا گئے اور یہ ایک تلخ حقیقت کہ ان کے آہنی وفولادی عزم وہمت کے آگے فرعونِ وقت نے بار ہا ہتھیار ڈالے۔

دراصل یہ وہ فکر ہے، جو بانئ دارالعلوم حجۃ اللہ فی الارض الامام الاکبر قاسم العلوم و الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم النانوتویؒ سے سینہ بہ سینہ فضلائے دارالعلوم میں منتقل ہوتی چلی آئی ہے، بانئ دارالعلوم کی حیاتِ طیبہ کا یہ پہلو بڑا تابناک ہے کہ انہوں نے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے معاملے میں حینِ حیات کوئی حکومتی یا عوامی دباؤ کبھی بھی قبول نہیں فرمایا اور اعلاء کلمۃ اللہ اور حفاظتِ حرمین شریفین زادہما اللہ شرفا وعظمۃ کے عظیم مقصد کی خاطر جنگ بلقان کے موقع پر حکومتِ ترکی کو وہ امداد بہم پہنچائی کہ باضابطہ ترکی کے صدر اعظم جناب ابراہیم ادہم صاحب نے آپ کے اور دیگر اس وقت کے اکابرینِ دارالعلوم دیوبند کے نام شکریے کا خط لکھا۔

عہدِ حاضر کے نامور مؤرخ ومحقق مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب مدظلہم نے اپنی کتاب ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال وآثار و باقیات و متعلقات'' میں اس فارسی خط کو اپنے ترجمہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔خط کی نایابی اور اس کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر اسے مولانا موصوف کے شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

شکریہ از جانب

دستور معظم ،صدر اعظم ، جناب ابراہیم ادہم صاحب بہادر لازال ظل کرمہ

جناب مدرسان مدرسہ دیوبند، ضلع سہارنپور فضیلت مآبان صاحب!

اعانت نقدیہ بجہت اولاد وعیال عساکر شاہانہ کہ در جنگ سربستان شربت شہادت نوشیدہ بودند، پیش ازیں فراہم آوردہ ارسال فرمودہ بودید، بتامی واصل گردید۔ برائے توزیع آں باب استحقاق بانجمن مخصوص تسلیم نمودہ شد، وازیں ہمت فتوت مندانہ کہ مجرد از غیرت دینیہ وحمیت اسلامیہ شما بوقوع آمدہ است، ہمہ وکلائے دولت علیہ عثمانیہ فرحناک گشتہ، وعلی الخصوص بدرجہ کمال بادی خوشنودیت ایں مخلص بے ریا گردیدہ است۔

مبلغ مرسول علاوہ برآنکہ باضطراب محتاجین تخفیفے بہم رسانیدہ، کسانیکہ ازیں اعانت حصہ دار شدند بملاحظہ آنکہ در ممالک بعیدہ ہندوستان برادران دینی ہستند کہ بر حال پرملال بچشمِ تأسف نگاہ می کنند، و برزخم ہائے کہ از دشمنانِ دین خوردہ ایم، مرہم تسلیت می نہند، اظہار مزید شکرانیت کردند واشک رقت ریختہ حصّہ خود شانرا گرفتند، بنا بریں از جناب رب مستعان کہ نصیر وظہیر یگانہ گویان است، التماس آں دارم کہ سعی جمیل شما عنداللہ مشکور گشتہ، در دنیا وعقبٰی مظہر اجر جزیل باشید۔

والسلام

عن دار الخلافۃ العالیہ العثمانیہ (وزیراعظم ابراہیم ادہم)

۹ جمادی الاول ۱۲۹۴ ہجری

....

وزیراعظم حکومتِ عثمانیہ ترکی کا شکریے کا خط

جناب مدرسین مدرسہ دیوبند ضلع سہارن پور!

فاضلانِ محترم! نقد تعاون (اورامداد) کی رقم شاہی فوج کے ایسے جوانوں کی اولاد اور اہلِ خاندان کے لیے جنھوں نے سربستان کی جنگ میں شہادت کا جام پی لیا ہے اور اس سے پہلے بھی جو رقم اکٹھی کر کے روانہ فرمائی تھی، سب پوری مل گئی ہے اور

اس سخاوت نشان ہمت سے جو آپ صاحبان کی غیرت دینی اور حمیت اسلامی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے، عثمانی حکومت کے سب نمائندے بہت خوش ہوئے ہیں اور خاص طور سے مجھ مخلص کی انتہائی مسرت کا سبب ہوئی ہے۔

روانہ کی گئی رقم اس کے علاوہ کہ اس کو وصول کر کے ضرورت مندوں کو اپنی تکلیف اور نقصان میں (کسی قدر) کمی کا احساس ہوگا، یہ بات مزید تشکر کا سبب ہے کہ دور دراز ملکوں اور ہندوستان میں ان کے دینی بھائی ہیں، جو ہمارے خستہ حال سے غمگین ہیں اور ان زخموں پر جو ہم (عثمانی فوجیوں اور ان کے اہلِ خاندان) نے دین کے دشمنوں سے کھائے ہیں، تسلّی کا مرہم رکھتے ہیں اور اپنے آنسوں بہاتے ہوئے اس خدمت میں اپنا حصّہ لے رہے ہیں۔

اس وجہ سے رب تعالیٰ شانہ سے جو مدد فرمانے والا اور ظاہر کرنے والا ہے، یہ التجا کرتا ہوں کہ آپ صاحبان کی یہ مبارک کوشش حق تعالیٰ شانہ کے یہاں مقبول ہو کر دنیا اور آخرت میں اجرِ عظیم کی صورت میں ظاہر ہو۔

والسلام

دار الخلافہ عالیہ عثمانیہ وزیرِ اعظم ابراہیم ادہم

۹ جمادی الاول ۱۲۹۵ھ

(قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال و آثار و باقیات و متعلقات۔ صفحہ ۱۲۷-۱۲۸)

عثمانی خانوادے کے اربابِ علم و فضل مولانا ذوالفقار عثمانیؒ والد ماجد شیخ الہندؒ اور مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ پر دادا مرحوم مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم وغیرہ بھی اس مہم میں از ابتدا تا انتہا حضرت نانوتویؒ کے معاون خصوصی رہے۔

دار العلوم دیوبند جس زمانہ میں قائم ہوا تھا، اس وقت دیوبند شہر میں پابندی کے ساتھ رسمِ تعزیہ انجام دی جاتی تھی، اس رسم کے سد باب کے لیے حضرت نانوتویؒ اور

ان کے مرید حاجی محمد یاسین عرف دیوان جی کے علاوہ احقر کی یادداشت کے مطابق مولانا ذوالفقار صاحب عثمانیؒ میدانِ عمل میں اترے، ان حضرات کی جانب سے شہر بھر میں یہ منادی کرا دی گئی کہ اب دیوبند کے گلی کوچوں میں تعزیہ داری کے جلوس نکالنے پر بالکل پابندی عائد ہے۔

جب کچھ رسوم و بدعات سے متأثر مقامی شیوخ نے اس اعلان کی مخالفت کی تو حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقائے کار کی جانب سے یہ دوسرا اعلان جاری کیا گیا کہ ''اس مرتبہ اگر تعزیہ نکلے گا تو وہ قاسم، یاسین اور ذوالفقار کے سینوں پر سے نکلے گا''۔

شہر بھر میں؛ بلکہ ملک بھر میں ان حضرات کی خدمات کا کیوں کہ بڑا شہرہ تھا، انہیں ان کی دینی و ملی خدمات کی بنا پر ہر جگہ عقیدت و محبت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا؛ اس لیے ان کے اس بھاری بھرکم اعلان کے بعد مبتدعین اس رسم کو ادا کرنے کی مطلق جرأت نہ کر سکے۔ وہ دن تھا اور آج کا دن ہے، اس شہر میں پھر سے اس رسمِ بد کی انجام دہی کا کوئی ایک بھی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

مابعد کے ادوار میں بھی عثمانی خاندان کے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع عثمانی اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی وغیرہ ایسے متعدد نابغۂ روزگار افراد نے یہ زریں سلسلہ باقی و جاری رکھا اور اسلامیانِ عالم کے معتقدات و نظریات یا ان کی جانوں پر جب کبھی اور جہاں کہیں داخلی یا خارجی طور پر حملے ہوئے، انہوں نے ہر ایسے نازک مرحلے پر اسلامیانِ عالم کی جانوں اور ان کے عقائد و ایمانیات کی صیانت و حفاظت کا اور غیروں سے ان کی مدافعت کا اپنی حد تک حق ادا کر دیا، اس عبقری خاندان کی اس سلسلے کی خدمات مستقل ایک کتاب کی متقاضی ہیں۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم جو اس وقت فکرِ قاسمی وعلومِ قاسمیہ کے ایک معتمد ومستند شارح وترجمان ہیں اور استاذِ محترم حضرت مولانا نسیم اختر شاہ کے الفاظ میں ''عثمانی خاندان کے وہ واحد فرد ہیں کہ جن پر آج عثمانی خاندان کے علم، کمال اور بلند کرداری کی پوری عمارت ٹکی ہوئی ہے'' آپ بھی ردِّ بدعات ومنکرات کے اس بنیادی واہم کام سے مدت العمر وابستہ رہے۔

مالیر کوٹلہ میں جس زمانے میں آپ پہلے پہل تشریف لائے تھے، تو وہ پنجاب میں بالخصوص بدعات وخرافات کے شباب کا دور تھا۔ شہر مالیر کوٹلہ کے باشندگان کا حال کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ اپنے کو مشرباً دیوبند کی جانب منسوب کرتے وسمجھتے تھے؛ مگر ان کے افکار وخیالات میں بڑی حد تک بریلویت اور کچھ حد تک شیعیت کے اثرات پائے جاتے تھے، چناں چہ ہر جمعرات کو کھانے پر فاتحہ اور ختم دلوانا اور پھر یہ کھانا غریب غربا وغیرہ میں تقسیم کرنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ گھر کے کسی فرد کے انتقال کر جانے کی صورت میں بہر صورت فاتحہ وختم کے اس دور کے مروجہ طرق پر عمل کیا جاتا تھا۔ شبِ برأت کے موقع پر وہ آتش بازی کی جاتی تھی کہ الامان والحفیظ اور اس موقع پر حلوہ بنانا تو گویا امرِ واجب کے درجے میں تھا، اگر پاس میں کچھ موجود نہ ہوا تو سود پر کہیں سے رقم حاصل کر کے شبِ برأت کا حلوہ تیار کیا جاتا تھا، اس کے بغیر شبِ برأت کا تصور ہی ان کے یہاں ایک مستبعد اور ناممکن امر تھا۔

ایک اور بدعت جس کے ڈانڈے شرک سے ملے ہوئے تھے، یہ تھی کہ جب کسی کے گھر لڑکا تولد ہوتا تھا، تو اس گھر کے باہر کچھ پتے، کچھ ناریل اور چند ایک اور چیزیں لٹکائی جاتی تھیں اور یہ بے جا اور من گھڑت خیال قائم کیے ہوئے تھے کہ ایسا کرنے سے بچے کو کسی طرح کی کوئی نظر نہیں لگے گی اور وہ ہر طرح کی نظرِ بد سے محفوظ

رہے گا۔ سچ ہے احداث فی الدین کی نحوست عقلِ انسانی کو ناکارہ بنا دیتی ہے، وہ لڑکے کی پیدائش پر تو یہ سب کچھ کرتے تھے، مگر لڑکی کی پیدائش پر ایسا کچھ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔

ایک حد درجہ قبیح و مذموم عمل اس دور میں یہ بھی رائج تھا کہ مردے کی تدفین سے فراغت کے بعد بہ وقتِ واپسی راستے میں گندے پانی کی کسی نالی کے پاس لائن لگا کر بیٹھ جاتے تھے، کافی دیر کے بعد مردے کا وارث ان سے کہتا کہ اب جانے کی اجازت ہے، تب وہاں سے اٹھتے۔ حضرت مفتی صاحب نے جب یہ عجیب وغریب حرکت دیکھی اور اس کی حقیقت دریافت کی، تو جواب میں آپ کو یہ بے سر وپا اور بالکل بے اصل واہمہ سنایا گیا کہ ''دراصل بات یہ ہے کہ قبر میں الائیں بلائیں آتی ہیں، وہ ذرا دیر بعد پانی کی ان گندی نالیوں میں آکر گر جاتی ہیں، اس کے بعد ہی ہم اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ تدفین کے فوراً بعد گھروں کو چلے جانے کی صورت میں یہ بلائیں ہمارے ساتھ ہمارے گھروں میں منتقل ہو جاتی ہیں''

مختلف علاقوں میں مختلف رسمیں پائی جاتی ہیں، راقم السطور کا خطہ، خطۂ مارواڑ بھی آج سے نصف صدی قبل رسوم ورواج اور بدعات وخرافات کا گڈھ تھا۔ غرض دہلی، اتر پردیش، راجستھان اور پنجاب وغیرہ وہ خطے جہاں احقر کو کچھ قیام کا موقع ملا، ہر جگہ کچھ نئ قسم کے رسوم ورواج علم میں آئے۔ پنجاب کے مستقل قیام کے بعد یہاں کے مسلم عوام میں رائج جن چند عجیب وغریب رسموں سے واقفیت حاصل ہوئی، ان میں سے ایک رسم، رسمِ قل کے نام سے موسوم ہے اور یہ غالباً اسی صوبے میں پائی جاتی ہے، دیگر جگہوں پر کم از کم مجھے اسے دیکھنے یا سننے کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ ہوتا یہ تھا کہ تدفینِ میت کے بعد چند احباب نوع بہ نوع کے پھل ایک جگہ رکھ کر اس کے گرداگرد بیٹھ جاتے تھے اور پھر کچھ دیر چاروں قلوں (سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص،

سورۃ الفلق، سورۃ الناس) کی تلاوت میں اشتغال کے بعد یہ پھل بچوں اور وہاں موجود دیگر لوگوں کے بیچ تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہ عمل غم خوردہ مرحوم کے اہل خانہ کے یہاں اور انہیں کے خرچ پر انجام دیا جاتا تھا۔ دیکھا جائے تو اس کا اصل مقصد شکم پروری کے سوا کچھ نہ تھا؛ مگر اب اسے کیا کہیے کہ اس دورِ جاہلیت کے جہالت زدہ زعمائے قوم نے اپنی تن پروری کے لیے اس طرح کی اور بھی نہ جانے کتنی رسموں کو عوام کالانعام میں جاری کر رکھا تھا، رسمِ قل کے بعد نواں بیسواں کے نام سے بھی دو رسمیں تھیں، رسمیں کیا تھیں، بس ایک طرح سے یہ بھی کھانے کی اجتماعی دو دعوتیں تھیں، انتقالِ میت کے ٹھیک سوا مہینے کے بعد ایک دفعہ یہی مجمع پھر سے مجتمع ہوتا تھا، پہلی دو دعوتوں کے مقابلے یہ تیسری دعوت ذرا کچھ اور زیادہ وسیع پیمانے پر ہوا کرتی تھی۔ اس طرح کی بے شمار رسموں تلے اسلامی برادری دبی ہوئی تھی اور چوطرفہ جہالت کا عالم یہ تھا کہ انہیں کو عینِ ایمان سمجھا ہوا تھا اور ان کے خلاف زبان کھولنے والا باغی اور مجرم سمجھا جاتا تھا۔

بدعات و رسوم کے معاملے میں یہاں کے دیہی علاقوں کا حال اور بھی زیادہ تشویش ناک و خوف ناک تھا، ایسی ایسی واہی تباہی رسمیں سرانجام دی جاتیں تھی، جن کے محض تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

پنجاب کے دیہاتوں میں آباد مسلمان آبائی طور پر زیادہ تر پنجابی یا گوجر برادری سے تعلق رکھتے ہیں، زمانۂ دراز تک درست دینی رہنمائی حاصل نہ ہونے کی بنا پر وہ نہ صرف بدعاتِ شنیعہ کے مرتکب ہوئے تھے؛ بلکہ علانیہ کفر و شرک تک کرنے لگے تھے۔ غسل اور نماز کے صحیح طریقے سے بے خبری ایک عام سی بات تھی، بہت سے مرد و عورت ہم بستری کے بعد غسلِ جنابت کے ایک معروف فقہی و اسلامی مسئلے سے ناآشنا تھے، اول تو ترکِ صلاۃ کا ماحول تھا اور چند مستثنیٰ حضرات جو الٹی سیدھی نماز پڑھتے

تھے، ان میں ایک معتد بہ تعداد بشری ضرورت کی تکمیل کے بعد بلا غسل ہی نمازِ فجر ادا کرنے والے اشخاص وافراد کی تھی۔

جو شخص سورۂ فاتحہ اور دو تین اور چھوٹی موٹی سورتیں غلط صحیح سے قطعِ نظر یاد کر لیتا تھا، اسے مولوی کہا و سمجھا جاتا تھا، آج بھی بعض علاقوں میں ایسے مولوی موجود ہیں۔

ان ڈھونگی قسم کے مولویوں کا حال یہ تھا کہ انہوں نے آلِ رسول اور سید کے عنوان سے عوام میں اپنے کو متعارف کرا رکھا تھا، گلے میں بیس بیس پچیس پچیس تسبیحیں لٹکائے رکھتے تھے، عوام ان پر جان تک نچھاور کرتے تھے، ان سیدوں کے پیر چومے جاتے، آمد کا مژدہ سن کر مہینوں پہلے بکرے خریدے و پالے جاتے، جو ان کی آمد پر ذبح کیے جاتے اور پھر دعوتیں کی جاتی تھیں۔ ان پیروں کی نشست گاہ کو بہت اہتمام سے سجایا و تیار کیا جاتا تھا، قدِ آدم کے قریب جس کی اونچائی ہوتی، اسے چاروں طرف سے باپردہ کیا جاتا اور جوان عورتیں اپنے ان سید پیروں کی جسمانی خدمت کے لیے اس نشست گاہ میں جاتی تھیں۔ عوام ان پیروں کو بڑے بڑے تحفے و نذرانے پیش کیا کرتے اور اس کو اپنی عظیم سعادت مندی و خوش نصیبی باور کیا کرتے تھے۔

جب کوئی شخص مرض الوفات میں مبتلا ہو جاتا تو ''پیر کا صدقہ'' کے نام سے بکرا خریدا جاتا، بکرے کے سر پر مریض کا ہاتھ رکھوایا جاتا اور آخر میں ذبح کر کے شکم کی آگ بجھائی جاتی، پھر جب یہ شخص وفات پا جاتا تو جنازہ تیار ہو جانے کے بعد جنازہ کے چاروں طرف کھڑے ہو کر دعا کی جاتی، قبر میں میت کو اتار لینے اور باضابطہ اس پر تختے رکھ دیے جانے کے بعد ایک عجیب وغریب اور احمقانہ حرکت یہ کی جاتی تھی کہ منہ کی طرف سے چند تختے ہٹا کر میت کا وارث یا کوئی اور شخص میت سے مخاطب ہو کر اور اس کا نام لے کر بہ آوازِ بلند کہتا کہ ''اب منکر نکیر آویں گے، وہ تجھ سے پوچھیں گے تیرا

رب کون ہے؟ تو جواب میں کہیو میرا رب اللہ ہے۔ وہ تجھ سے پوچھیں گے تیرا دین کیا ہے؟ تو کہیو میرا دین اسلام ہے۔ الخ'' پھر دوبارہ تختے رکھے جاتے اور قبر تیار ہو جانے کے بعد قبر پر دعا ہوتی، چالیس قدم چل کر پھر دعا ہوتی، گھر آ کر ایک دعا اور کی جاتی۔ میت کے نام سے ایک بھینس کو اسی دن ذبح کیا جاتا اور اس سے آنے والوں کی ضیافت کی جاتی۔ تیسرے دن پھر اسی طرح کی کوئی دعوت ہوتی، انتقال کے بعد آنے والی پہلی جمعرات میں بہت سے لوگ اکٹھے ہوتے، ہر آنے والا اپنے ساتھ ایک دوکلو دیسی گھی لاتا، آج کے دن شرکائے دعوت کے لیے ''کھیر'' بنائی جاتی اور سات آٹھ بکرے ذبح کر کے ان کا گوشت تیار کیا جاتا تھا۔ دن کے ایک ڈیڑھ بجے جب کھانا بن کر تیار ہو جاتا، تو پیر اور مرید سب مل کر بہ آوازِ بلند کلمۂ طیبہ، درود شریف اور آخر میں الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ وغیرہ کا ورد کرتے پھر پیر صاحب کی دعا ہوتے ہی اس مجمع کو کھانا کھلایا جاتا۔

بھینس کے نوزائیدہ بچے مزاروں پر چڑھائے جاتے تھے۔ حاملہ بھینس سے نر یا مادہ بچہ پیدا ہونے کا اپنے نزدیک خیال باندھ لیتے اور خلافِ خیال ہونے کی صورت میں بھینس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کوئی دوسرا بچہ اس کے آگے کر دیتے اور اس بچے کو پیدائش کے فوراً بعد ہی موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ انسان نما جانور تھے، جو معمولی معمولی باتوں پر باہم دست و گریباں ہوتے اور ایک دوسرے کا قتل تک بھی کر ڈالتے تھے۔

ان کا طریقۂ نکاح بھی اسلامی طریق سے ہٹا ہوا تھا۔ ایجاب وقبول نکاح کے ارکان میں سے ہیں؛ مگر ان کے جاہل قاضی دولہے اور دلہن دونوں سے قبول کرانے کا کام کرتے تھے، ایجاب سرے سے ہوتا ہی نہیں تھا۔ ان قاضیوں کے نکاح پڑھانے کا طریقہ بھی بڑا عجیب وغریب تھا۔ مجلس نکاح میں قاضی دلہے، وکیل اور دو گواہوں کی

موجودگی میں سب سے پہلے لڑکی کے والد سے کچھ اس طرح کے کلمات کہتا ''حکم خدا دے نال، خدا دے رسول دے نال، ملت حضرت ابراہیم دے نال، قولِ امام اعظم دے نال، چار اماماں دے نال، وکیل دی وکالت دے نال، شہداء دی شہادت دے نال اور حق مہر ایک سونے دے زیور دے نال جس کی قیمت تقریباً تیس ہزار روپے ہے، تو نے اپنی لڑکی کا نفس فلاں ابن فلان کے لیے بخش دیا، تیری اجازت ہے، تیری لڑکی کا حقِ نکاح کرادیا جائے۔''

لڑکی کا والد جواب میں کہتا کہ ''حکم خدا دے نال میری طرف سے اجازت ہے، نکاح پڑھا دیا جائے'' تین مرتبہ لڑکی کے والد سے یہ کلمات کہہ کر اجازت طلب کی جاتی اور تینوں ہی مرتبہ اسے اپنا یہ جواب دہرانا ہوتا۔

اب وہ وکیل اور گواہ مجلسِ نکاح سے اٹھ کر دلہن کے پاس چلے جاتے۔ اول وہ سونے کا زیور اس کے گلے میں پہنا دیا جاتا، جو اسے مہر کے طور پر دیا گیا ہے۔ بعدہ لڑکی سے چار کلمے، صفتِ ایمان اور دعاء قنوت پڑھوا کر وکیل اس سے کہتا ''کیا تو نے اپنا نفس فلاں ابن فلاں کو بخش دیا'' وہ جواب دیتی ''حکم خدا دے نال میں تے اپنا نفس انہیں بخش دیا'' یہ پورا عمل مکمل بے پردگی کے ماحول میں انجام پاتا تھا۔

لڑکی سے اجازتِ نکاح لے کر یہ گواہ و وکیل پھر مجلسِ نکاح میں حاضری دیتے، اور بہ آوازِ بلند سلام کرتے، تو وہ قاضی سلام کا جواب دے کر وکیل سے پوچھتا کہ ''ہاں بھائی تسی کون ہو اور کتھے گئے تھے'' یعنی کون ہو اور کہاں گئے تھے؛ حالانکہ وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی اس کے پاس سے اجازت لینے گیا تھا، لیکن یہ ایک مجنونوں کی سی حرکت پابندی کے ساتھ کی جاتی تھی۔ وکیل کہتا کہ جی میں لڑکی کی طرف سے وکیل ہوں اور نفس بخشوانے کی اجازت لے کر آیا ہوں۔ قاضی پھر گواہوں سے بھی یہی دریافت کرتا

کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ وہ کہتے ہم دونوں گواہ ہیں اور دلہن کے پاس سے آئے ہیں۔

اس سب کے بعد قاضی بغیر خطبۂ نکاح پڑھے دلہے سے کلمے وغیرہ پڑھوانے کے بعد کہتا کہ ''تو نے اپنا نفس فلاں بنت فلاں کے لیے بخش دیا'' وہ کہتا ''حکم خدا دے نال میں نے اپنا نفس فلاں بنتِ فلاں کو بخش دیا''

اس دوطرفہ قبول کے بعد لمبی چوڑی دعا ہوتی اور دعا کے بعد تمام شرکائے مجلس چینی کے ساتھ مخلوط کچے چاول کھاتے، اس کے بعد کہیں جا کر انہیں پکا ہوا کھانا نصیب ہوتا تھا۔

تقسیم ہندو پاک کا سب سے بڑا اور سب سے برا خمیازہ مشرقی پنجاب کو بھگتنا پڑا۔ یہ تقسیم باشندگانِ پنجاب کے حق میں جانی اور ایمانی بہر دو لحاظ سے زہرِ قاتل ثابت ہوئی۔

امرتسر، جالندھر، کپورتھلہ، ہوشیار پور، فیروز پور، انبالہ، پٹیالہ، لدھیانہ، سرھند، فرید کوٹ، پٹھان کوٹ اور بٹھنڈہ جیسے مرکزی شہر جہاں علما بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے، مسجدیں اور مدارس بہ کثرت تھے، روحانی مرشد بھی ہر چہار طرف تھے۔ تقسیم سے قبل حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے بافیض خلفاء کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی، جن میں سے مفتی حسن صاحب امرتسریؒ اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری ثم ملتانیؒ بانی خیر المدارس جالندھر و ملتان کے نام احقر کو فی الوقت محفوظ ہیں۔ تقسیم کے بعد نوے فی صد مسلمانانِ پنجاب کے پاکستان ہجرت کر جانے کی بنا پر انہیں شہروں کی خانقاہیں اور مساجد و مدارس جو بندگان خدا کی ظاہری و باطنی اصلاح کا بڑا ذریعہ تھے، ایک طویل زمانے تک ویرانی کا شکار رہے۔ ایک زمانے تک اس حال میں رہنے کے بعد بہت سے معابد و مدارس غیر اقوام کی عبادت گاہوں یا ان کی تجارت گاہوں میں تبدیل ہو گئے اور صوبے بھر میں بہ مشکلِ تمام آٹھ دس فی صد مسلمان جو کسی بھی عذر سے ہجرت نہیں کر سکے تھے، ان میں سے ایک معتد بہ تعداد نے جب

یہاں کی زمین کو اپنے اوپر تنگ ہوتا محسوس کیا، تو انہوں نے سکھوں کے سے پگڑ باندھ لیے اور گردواروں میں جا کر ان کے مخصوص دھارمک کاموں میں شرکت شروع کردی۔ باطن کا حال تو عالم الغیب والشہادت کو معلوم ہے، بہ ظاہر انہوں نے یہ کام اپنی جان بچانے کے لیے اختیار کیا تھا۔

طویل عرصے تک انہوں نے اس پر عمل درآمد جاری رکھا۔ ڈر خوف کا عالم ان پر اس درجہ طاری رہا کہ انہوں نے اپنی ظاہری و باطنی اس افسوسناک مغایرت کی اطلاع اپنی نسل نو کو دینا بھی خلافِ مصلحت سمجھا؛ بلکہ شاید ایسا کرنا اپنی جاں بخشی کی راہ میں ایک مانع اور حائل سمجھا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ اسلامی تاریخ کا طالب علم بہ آسانی نکال سکتا ہے۔ نسلِ نو نے اپنے کو مسلمان نہیں؛ بلکہ سکھ سمجھا اور تادمِ تحریر بھی ان کا اپنے متعلق یہی خیال ہے کہ وہ آج سے نہیں؛ بلکہ قدیم سے اسی دھرم کے پیرو ہیں۔ کچھ لوگ جن کو اپنے آبا واجداد کی اصل کہانی کی کہیں سے بھنک لگی، وہ اپنی یہ غم ناک کہانی سناتے ہیں اور زار وقطار روتے ہیں۔

ہر چند کہ اب ایسے بہت سے مرتدین آغوشِ اسلام میں آچکے ہیں اور یہ عمل سست رفتاری کے ساتھ ہی سہی، آج بھی بحمد اللہ کسی درجہ جاری ہے؛ لیکن اب بھی ایسے لوگوں کی بڑی تعداد دیہی علاقوں میں رہتی وبستی ہے، جن کے نام سکھبیر سنگھ خان، دلمندر خان، رام پال خان، جگدیش خان اور سوم خان جیسے غیر مسلمانہ ہیں اور تقسیم کے بعد سے اب تک جن کی زندگیاں شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کے استعمال میں گزری ہیں، گردواروں میں پاٹھی (سکھوں کی مشہور کتاب گرو گرنتھ کو گردوارہ میں پڑھنے والے کو پاٹھی کہا جاتا ہے) نسل در نسل چلے آرہے ہیں، اپنی لڑکیوں کی شادیاں سکھوں اور دیگر غیر مسلموں میں کرتے ہیں، مردوں کو بجائے دفن کرنے کے جلاتے ہیں اور ان جیسے لاتعداد کفریات وخرافات میں غرق ہیں۔

افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ تقسیم کے بعد کے تیس چالیس سالوں میں کوئی معتمد دینی رہنما اور مصلح و مربی انہیں نصیب نہ ہوسکا، نتیجتاً اس وقت کی مخصوص فضا میں جان و مال کی سلامتی کے خیال سے ان کے آباء نے جو ارتداد کی راہ اختیار کی تھی، مابعد کے ادوار میں بے خبری میں یہ بھی اسی راہِ ارتداد پر گامزن رہے۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم، مولانا قاری محمد ہاشم خلیلی گومٹویؒ اور اس دور کے دیگر اکابر علما نے اللہ رب العزت کی توفیق سے باشندگانِ پنجاب کو بدعات وخرافات سے نکالنے اور مرتدین کو اسلام جیسی عظیم و بنیادی اور اہم ترین متاعِ گم گشتہ سے ہم آشنا کرنے کا نازک کام بڑی دانائی اور حکمت کے ساتھ کیا۔ ان حضرات کی سبق آموز سوانح سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے انہیں اپنے بھٹکے ہوئے بندوں کی اصلاح ہی کے لیے یہاں بھیجا تھا، چناں چہ ان قدسی صفات بزرگان دین نے ہر طرح کے موافق ومخالف حالات میں اپنے اس مشن کو جاری رکھا، جس کے بہت بہتر نتائج برآمد ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی ردّ بدعات وخرافات سے متعلق مساعی آیت قرآنی ”اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ“ کی عمدہ عملی تفسیر اور سیرتِ نبویہ کے اس سلسلے کے گوشوں کی زندہ وجاوید مثال ہیں۔

آپ ایک علمی انسان ہیں اور دارالعلوم دیوبند جیسے علمی مرکز سے مستعفی ہوکر پنجاب تشریف لائے تھے۔ تدریس وتالیف کے ہمہ وقتی مشاغل نے ایک حد تک آپ کو یکسوئی کا عادی بنا ڈالا تھا؛ بایں ہمہ پنجاب کے علمی ودینی ریگستان میں آپ نے تہذیب وتمدن اور ادب واکرام سے بے خبر عوامِ پنجاب کے اپنے ساتھ روا و ناروا ہر طرح کے سلوک بشاشتِ قلب کے ساتھ سہے و برداشت کیے۔ آنے والوں کی وضع

قطع غیر اسلامی ہوتی؛ مگر آپ نے صرف اس کو بنیاد بنا کر کسی کو ڈانٹنے یا اپنی مجلس سے اٹھ جانے کی بات کبھی بھی نہیں کہی، اسی حال میں اسے اپنا گرویدہ بنانے اور اس بہانے اس کی اور اس کے واسطے سے اس کی بستی والوں و متعلقین کی دینی اصلاح و تربیت کا کام حد درجہ خاموشی کے ساتھ کرتے رہے۔

مولانا عبدالباری ندوی راوی ہیں کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی خدمت میں مقطوع اللحیہ احباب بہ کثرت حاضری دیتے اور آپ ان سب کے ساتھ اخلاقِ کریمانہ کا برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہتے تھے کہ ملاقات کے اوقات میں ایسے لوگوں کا ایک طرح سے تانتا لگا رہتا تھا۔ ایک دفعہ کسی کی طرف سے بہ طورِ شکوہ کہا گیا کہ آں حضرت ایسے ایسے عاصی اور نافرمان لوگوں کے ساتھ اس درجہ اپنائیت اور محبوبیت کا معاملہ فرماتے ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے جواب میں فرمایا کہ یہ لوگ اسی طرح ہم سے مانوس ہوں گے اور پھر دوسرے قدم کے طور پر صحبتِ صالحین کی بہ دولت دینی زندگی کو اپنا کر اس طرح کے منکرات سے کنارہ کش ہو جائیں گے؛ لیکن اگر ان کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر ان کے ساتھ اعراض و تغافل برتا گیا، تو پھر ان کے اس سے بھی بڑے گناہوں میں مبتلا ہونے کے امکانات ہیں۔

حضرت والا تھانویؒ کے یہاں مشہور شاعر جگر مرادآبادیؒ جب پہلی بار حاضر ہوئے تو حضرت حکیم الامتؒ نے ان کی مے نوشی کی عادت کی وجہ سے ان کو بالکل بھی برا بھلا نہیں کہا؛ بلکہ اس کے بجائے ان کے ساتھ بے تکلفی کے ماحول میں شعر و ادب سے متعلق گفتگو فرمائی اور ان کی کسی بھی غلط عادت کا اس پہلی ملاقات میں ذکر تک نہیں فرمایا۔ جگر صاحب آپؒ کے اس طرزِ عمل سے بے حد متأثر ہوئے اور پھر بہ تدریج یہ عمل ان کی اصلاح و تربیت پر منتج ہوا۔ اس دینی و اصلاحی انقلاب کا اثر جگر صاحب کے اشعار نے بھی پورا پورا قبول کیا تھا۔ جگر صاحب جب دین بیزاری اور شراب نوشی

کے ماحول سے متنفر اور دینی زندگی کی طرف راغب ہورہے تھے، یہ شعر ان کے اسی دور کی یادگار ہے۔

چلو دیکھ آئیں تماشہ جگر کا
سنا ہے وہ کافر مسلمان ہوگا

یہ شعر عوام وخواص سب میں مقبول ہوا تھا، یہ شعر کہنے کے سالہا سال بعد جبکہ ان کی زندگی قابلِ رشک حدتک دینی و اسلامی رنگ میں رنگ چکی تھی، ایک دفعہ کسی ضرورت سے میرٹھ گئے تو رکشے والا بڑے وجد آفریں لب و لہجے میں آپ ہی کے اس شعر کو گنگنا رہا تھا:

چلو دیکھ آئیں تماشہ جگر کا
سنا ہے وہ کافر مسلمان ہوگا

رکشے والا غریب کیا جانے کہ جگر ہی میرے رکشے پر تشریف رکھتے ہیں، وہ عالمِ بے خودی میں یہ شعر دہراتا رہا اور جگر صاحب زار وقطار روتے رہے۔

اصلاح کے اس انوکھے طرزِ عمل کی افادیت سے کسی صورت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر دور کے مصلحین نے اسے خوب خوب آزمایا و برتا ہوا ہے۔ مسجد نبوی میں ایک اعرابی کے پیشاب کرنے کے باوجود آقا کریم ﷺ نے اس کے ساتھ شفقت و محبت کا جو مظاہرہ فرمایا تھا، اس سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو۔ یہ عمل بے پناہ قوتِ برداشت کا متقاضی ہے، مفتی صاحب پر پروردگارِ عالم کی خاص نظرِ عنایت رہی کہ آپ نے وہ سب کچھ کر دکھایا، جن کی آپ جیسے رسول ﷺ کے سچے وارث سے توقع تھیں اور ماضی کے اسلاف کا جو طغرائے امتیاز رہے ہیں۔

آپ کی شخصیت علمی، عملی اور اخلاقی ہر لحاظ سے کامل و مکمل اور بے داغ و بے عیب ہے، جو کہ کامیابی کا اصل الاصول ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے قوم کے سامنے

پہلے اپنی ذات کو پیش فرمایا تھا اور پھر اپنی تعلیمات کو۔ معلوم ہوا کہ اصلاح و استرشاد کے عمل کی تکمیل کے لیے شخصیت کی بلند کرداری از حد ضروری ہے، وگرنہ ذرا سی کجی اس کی شخصیت کو بے وزن بنا کر عوام کی اس سے دوری اور تنفر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مفتی صاحب کے اخلاقِ عظیمہ و عاداتِ حسنہ اور ان کے اخلاص و تواضع کے سبب عوام کا ان کی طرف خوب رجوع رہا۔ آپ اپنے عظیم محسن و استاذِ گرامی قدر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی طرح ہر طرح کے دیہاتی کی دعوت کو منظور فرما کر ہر طرح کے چھوٹے بڑے دیہاتوں میں تشریف لے جایا کرتے، راستوں کی ناہمواری بعض اوقات صحت کے سقوط و تنزل کا ذریعہ بھی بن جاتی؛ مگر آپ نے اس سب سے بے پرواہ ہو کر اپنے کو ہمہ تن گویا یہاں کے مکینوں کی دینی خدمت کے لیے اور غلط چیزوں کے خاتمے کے لیے وقف فرما دیا تھا، چناں چہ جب تک صحت بحال رہی آپ نے تصنیفی و تالیفی کاموں اور متعدد تنظیموں کی سربراہی اور ان کی رکنیت کے تقاضوں کو پورا کرنے جیسے متعدد علمی، ملی اور رفاہی مشاغل کے ساتھ ہی ساتھ اس عوامی کام کو برابر جاری رکھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت و دانائی سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ آپ نے بدعات و رسوم کے خلاف بڑے حکیمانہ انداز میں کام کیا۔ ایک ایک غلط چیز کی اصلاح فرماتے اور اس میں کام یابی حاصل ہو جانے کے بعد پھر کسی دوسری بدعت کے خاتمے کی طرف متوجہ ہوتے۔ بہ یک وقت ساری بدعات کے رد کو لے کر کھڑا ہونے کے نظریے کے آپ مخالف ہیں؛ کیونکہ آپ کے خیال میں ایسا کرنے سے عوام بجائے توبہ تائب ہونے کے ضد کا شکار بن کر ان رسوم و بدعات پر مزید پختہ ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ حضرت والا تھانوی نور اللہ مرقدہ کی تعلیم اور بدعات کے رد میں ان کا طریقِ کار ہے، جس پر مفتی ہلال عثمانی مدظلہم مدت العمر عمل پیرا رہے۔

آپ کی اس مہم میں بڑی حد تک کام یابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ آپ نے کئی مواقع پر منکرات کا رد ایسے لطیف پیرایہ میں کیا، کہ صاف طور پر مبتدعین سے وہ منکرات چھوڑنے کی بات کہنے کی نوبت ہی نہ آئی اور وہ منکر بغیر کسی نکیر کے از خود معروف سے بدل گیا۔ آپ نے ایک دفعہ اس طریقِ رد پر گفتگو کرتے ہوئے ایک سبق آموز واقعہ بیان کیا تھا۔ آپ کے اس طریقۂ رد کی کامل وضاحت کے لیے اس واقعہ کو نقل کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ کچھ لوگ بہ آوازِ بلند ''یا صابر یا صابر'' پکار رہے تھے، اسی اثنا میں اس جگہ سے ایک صحیح العقیدہ بزرگ کا گزر ہوا تو انہوں نے ان کے قریب جا کر ''یا ربِّ صابر یا ربِّ صابر'' کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی اسی نعرے پر آ گئے اور اس طرح بغیر کوئی نکیر کیے صرف ''رب'' کا اضافہ کر کے وہ بزرگ ان کے ایک غلط کام و خیال سے باہر نکلنے کا ذریعہ بن گئے۔

انسانی مزاج اچانک رد و قدح کا متحمل بہت کم ہوتا ہے؛ مگر مذکور الصدر طریقہ چوں کہ اس کے مزاج سے کافی حد تک ہم آہنگ ہے، اس لیے ایسے انسان سے اور اس کی گفتگو سے مخاطب جلد مانوس ہوتا ہے اور دل و دماغ پر بھی بہت جلد متوقع اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بہ قول حضرت مفتی صاحب مدظلہم مبتدعین اور صحیح العقیدہ لوگوں کی مخلوط آبادیوں و علاقوں میں دینی خدمات انجام دینے والے اربابِ مدارس، مبلغین اور ائمہ حضرات کو حسبِ موقع اس طریق پر بھی عمل کرنا چاہیے؛ تاکہ نقضِ امن کا خطرہ بھی راہ نہ پا سکے اور بدعات و خرافات کے ازالے کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کے اعمال و اخلاق اور نظریات و خیالات بھی درست ہوتے رہیں۔ بہ ظاہر نوامیدی و مایوسی کے آثار بھلے ہی نظر آئیں، اپنی سی مخلصانہ کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں اور مقلب القلوب سے کامیابی کے سلسلے میں پرامید و دعا گو رہیں۔ نیز سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ کے مطابق کسی بھی منکر کی نکیر کے وقت وہ بات ایک

عام انداز میں عام لوگوں پر محمول کر کے کہی جائے، براہِ راست انہیں کونشانہ بنانے کی غلطی نہ کی جائے کہ اس سے بجائے قبول کے مخاطب کی جانب سے اس قول ونصیحت کے رد کا خطرہ رہتا ہے۔ ہمارے نبی ﷺ کا معمول مبارک تھا کہ ایسے مواقع پر ارشاد فرمایا کرتے ''لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے یا کہتے ہیں''۔

مفتی صاحب مدظلہم نے سیرتِ نبوی ﷺ اور اکابر علما کے مجرب طرق کو سامنے رکھ کر اور انہیں کو اسوہ بنا کر خود بھی بہت بڑے پیمانے پر ردِّ بدعات ومنکرات کا کام انجام دیا اور بٹھنڈہ جیسے جہالت زدہ مقامات پر اپنے نمائندے بھی بھیجے، جنھوں نے مفتی صاحب کے مزاج ومنشاٴ کے مطابق مستقل وہاں کا قیام اختیار کر کے مسلمانانِ پنجاب کی درست دینی رہنمائی کا فریضہ بہ حسن وخوبی سرانجام دیا اور آپ کے قائم فرمودہ مدرسہ تعمیرِ سیرت مالیر کوٹلہ نے بھی اس حوالے سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

ہر علم وفن پر بیسیوں تالیفات وتصنیفات تیار کر ڈالنے والے بہ ظاہر اس نحیف الجثہ شخص سے میدانِ عمل میں بھی ایسی ایسی خدمات ظہور پذیر ہوئی ہیں، کہ فی زمانہ جس کی مثالیں نایاب نہ سہی پر کمیاب ضرور ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

○❖○

اسلامی معاشرہ آج بھی عام انسانی معاشرے پر اثر انداز ہوسکتا ہے بشرطیکہ..........

مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح اوران میں رائج خلافِ شرع رسوم کے خاتمے کے علاوہ آپ کی یہ خدمت بھی تاریخ کا ایک روشن باب ہے کہ جب کبھی اعدائے اسلام اہلِ اسلام یا اسلامی تعلیمات پر حملہ آور ہوئے، تو آپ نے ایسے مواقع پر اسلامی تعلیمات اور اہلِ اسلام کا بھرپور دفاع فرمایا۔

غیر مسلم حضرات کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان میں ایک مختصر سا طبقہ ہے، جو مسلمانوں کو اپنا دستِ نگر دیکھ کر ہی خوش ہوتا ہے، فی زمانہ اس کی ایک بڑی خواہش یہ ہے کہ مسلمانوں کے بچے حسبِ سابق ان کی دکانوں میں ان کے ملازم اور ماتحت بن کر رہیں اور ہر طرح ان سے دب کر رہیں، اب مسلمانوں کے بچے اعلیٰ عصری تعلیم حاصل کرنے لگے ہیں اور انہیں اچھا خاصا آزادانہ روزگار بھی ملنے لگا ہے، یہ بات اس طائفے سے بالکل ہضم نہیں ہو رہی ہے اور یہ اپنی عداوت نکالنے کے لیے اور ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ بچوں کو ہر اعتبار سے پیچھے دھکیلنے کے لیے اور سرکاری وغیر سرکاری محکموں میں ان کو مل رہی ملازمتوں کے دروازے ان پر تنگ اور بند کرنے کے لیے فساد وفتنہ پھیلانے کی غرض سے نت نئے حربے استعمال کرتا ہے؛ ورنہ جہاں تک ان کی اکثریت کا تعلق ہے، تو وہ امن پسند ہے۔ اس مختصر سے طائفے کی تخریبی کاروائیوں کا جواب ہمیں اپنی طرف سے تخریبی کاروائیوں کے ذریعے نہیں دینا چاہیے؛ کیونکہ ایسا کرنے سے نقصانات وخطرات کی زد میں اکثر وبیشتر مسلمان ہی آتے ہیں، انہیں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جاتی ہیں، جائے واردات پر پولس کی بے

رحمی کا نشانہ وہی بنتے ہیں اور مقدمات بھی انہیں کے سر عائد کیے جاتے ہیں، اس کے علاوہ بھی مختلف طریقوں و تدبیروں سے مسلمانوں کا جانی و مالی استحصال کیا جاتا ہے؛ اس لیے جواب میں مشتعل نہ ہوکر اخلاق نبویہ کے ذریعے ان کے اس عمل کا جواب دیا جائے اور ان کے پاس پہنچ کر ان پر یہ واضح کیا جائے کہ اسلام ان سب چیزوں سے بری ہے، جو آپ اس کے بارے میں کہتے یا سوچتے ہیں، اسلام تو اپنا دم بھرنے والوں کو دیگر مذاہب کی مقتدر شخصیات کے احترام کی تلقین کرتا ہے اور ان کے معبودان کے بارے میں غلط الفاظ استعمال نہ کرنے کی ہدایت بھی دیتا ہے۔

مسلمانانِ ہند کی جانب سے تقسیم کے بعد کئی مواقع پر جذباتیت کا مظاہرہ کیا گیا، جس کے نقصانات جگ ظاہر ہیں، حضرت مفتی صاحب کے مطابق اگر ان مواقع پر صبر وتحمل سے کام لیا جاتا، تو تصویر کا رخ کچھ اور ہی ہوتا۔ نیز فساد کا جواب فساد سے دے کر انھوں نے جو اپنی شبیہ پیش کی، وہ اسلام کے حق میں اور خود ان کے اپنے حق میں بے حد ضرر رساں ثابت ہوئی۔ جبکہ پیغمبر ﷺ کی سیرت یہ ہے کہ آپ نے اعدائے اسلام کے ہر طرح کے زخم اور طعنے سہے اور اوائل اسلام میں اپنے مخالفین کو یک طرفہ طور پر اپنی نازیبا حرکتیں جاری رکھنے کا موقع دیے رکھا اور اپنی طرف سے وہ اخلاق ان کے سامنے پیش فرمائے، جو ان کے جوق در جوق آغوشِ اسلام میں آنے کا ذریعہ بنے۔ آج کا مسلمان بھی اپنے نبی ﷺ کی سیرت کے اس پہلو کو اپنا کر ہی کامیاب ہوسکتا ہے، یہ جوابی تخریبی کاروائیاں اس کے مصائب ومشکلات کا حل ہرگز نہیں؛ بلکہ مشکلات ومصائب میں اضافے کا باعث ہیں۔

بہ حالات موجودہ آپ برادرانِ وطن سے بہ راہِ راست ملنے جلنے اور ان کے ساتھ قربت ونزدیکی بڑھانے کو ناگزیر خیال فرماتے ہیں؛ کیونکہ اسی طرح وہ ہم سے اور ہمارے مذہبِ اسلام سے مانوس و واقف ہوسکیں گے اور یہی شکوک وشبہات اور

نفرت وعداوت کی موجودہ تاریک فضا کو محبت ومودت اور باہمی اخوت ویگانگت سے تبدیل کرنے کا ایک کامیاب راستہ ہے۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو لے کر ایک پرامید انسان ہیں، آپ کا خیال یہ ہے کہ غیر اقوام میں اعلیٰ کردار کا حامل بن کر اسلام کا تعارف کرایا جائے، تو اس کے بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کی تقاریر ہوں یا تالیفات وتصنیفات، وہ اسلام کی بہترین نمائندہ وترجمان ہیں اور پھر آپ کی نجی زندگی بھی ایسی اعلیٰ ہے کہ اسے سیرتِ نبویہ کا عکسِ جمیل کہنا بجا ہوگا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بلاتفریقِ مذہب وملت باشندگانِ پنجاب اپنے اپنے مسائل کے حل کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور کسی بھی پیچیدہ معاملے میں آپ کی رائے کو متفقہ طور پر قولِ فیصل کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ہندو مسلم فساد وانتشار کے تکلیف دہ واقعات جب بھی پیش آئے، تو ان کا حل زیادہ تر آپ ہی کی ذات کے ذریعے طے پایا۔

غیروں میں آپ کی مقبولیت ومحبوبیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ آپ نے مشکل موقعوں پر ان کے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی کا مظاہرہ فرمایا، نیز معاملات کی صفائی بھی اس کی ایک اہم وجہ رہی۔ اس سلسلے کے واقعات آپ کی حیات میں بیسیوں دفعہ پیش آئے ہوں گے، جن میں سے چند واقعات راقم السطور کے بھی علم میں ہیں۔ یہ واقعات چوں کہ حد درجہ افادیت واہمیت کے حامل ہیں اور غیر اقوام میں تبلیغِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے اپنے اندر کئی عظیم سبق لیے ہوئے ہیں؛ اس لیے ان چند واقعات کو ذکر کیا جاتا ہے:

☆ آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے، آپ لدھیانہ سے مالیرکوٹلہ کی جانب سفر پر تھے کہ اثنائے راہ آپ کی بس کے ایکسیڈنٹ کا واقعہ پیش آ گیا، جس

سے مالیرکوٹلہ کی ایک غیر مسلم خاتون کے سر پر کاری زخم لگا، کافی مقدار میں خون بہا اور زخم کی شدت کی بنا پر کچھ دیر تک موصوفہ کو وقفے وقفے سے چکّر بھی آتے رہے۔ مفتی صاحب سمیت بس میں سوار باقی حضرات بہ فضلِ باری محفوظ وسلامت رہے۔

انوار احمد خاں مرحوم سابق ایم ایل اے مالیرکوٹلہ اس واقعے کے کچھ دیر بعد اسی راستے سے مالیرکوٹلہ کی جانب جا رہے تھے، انہوں نے حضرت مفتی صاحب کو سڑک کے کنارے دیکھ کر اپنی گاڑی روکی۔ مفتی صاحب نے پیش آمدہ واقعہ سے انہیں آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ شہر کی ایک غیر مسلم خاتون کے سر میں کافی زیادہ چوٹ لگی ہے۔

انوار صاحب نے مفتی صاحب سے اپنی گاڑی میں سوار ہونے کی بات کہی، تو آپ نے ان سے بالکل صاف لفظوں میں فرمایا کہ موصوفہ کی حالت تشویش ناک حد تک نازک بنی ہوئی اور انہیں فوری طور پر طبی معاینے کی سخت ضرورت ہے؛ اس لیے میں انہیں اس حال میں چھوڑ کر آپ کے ساتھ چلنے سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کے اصرار کے پیشِ نظر انوار صاحب نے مفتی صاحب کے ساتھ اس زخم خوردہ خاتون اور اس کے شوہر کو اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ مالیرکوٹلہ پہنچ کر مفتی صاحب بہ ذات خود انہیں شہر کے قدیمی بس اسٹینڈ کے قریب کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور جب انہیں آرام ہو جانے کے بعد ڈاکٹر کی جانب سے گھر جانے کی اجازت ورخصت حاصل ہوگئی، تو انھیں ان کے گھر پہنچانے بھی ساتھ ہی گئے۔ وہ غیر مسلم میاں بیوی اس احسانِ عظیم کے عوض عمر بھر آپ کے ممنون ومشکور رہے۔ مفتی صاحب جہاں کہیں انہیں نظر پڑ جاتے، تو وہ عقیدت ومحبت کے ساتھ اپنے دھرم کے مطابق آپ کے پاؤں چھونے کی کوشش کرتے اور آپ یہ کہہ کر انہیں ایسا کرنے سے باز رہنے کی نصیحت فرماتے کہ بھائی وہ تو ایک انسانی تقاضہ تھا، جسے پورا کیا گیا تھا؛ اس لیے آپ یہ زحمت نہ اٹھایا کریں۔

☆ مالیرکوٹلہ کے ضلع سنگرور سے مظفر نگر کے لیے ایک بس چلی تھی، جو مالیرکوٹلہ

اور دیوبند ہوتے ہوئے مظفرنگر جایا کرتی تھی۔مفتی صاحب گاہ بہ گاہ اسی بس سے دیوبند تشریف لے جایا کرتے تھے۔ایک دفعہ آپ نے کنڈکٹر کو کرایہ کے طور پر پچاس روپے دیئے،جنہیں کنڈکٹر غلطی سے سو کا نوٹ سمجھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ باقی مسافروں سے کرایہ وصولی کے بعد آپ کی زائد رقم آپ کے حوالے کر دوں گا،چناں چہ حسبِ وعدہ وہ حاضر ہوا اور رقم لوٹانے لگا۔مفتی صاحب نے اس کے متعلق دریافت فرمایا،تو وہ کہنے لگا کہ میں بالکل ٹھیک کر رہا ہوں؛ کیوں کہ آپ نے مجھے سو روپے دیے تھے، جس میں سے اتنی اتنی رقم لوٹانا تو بہر حال میری ذمہ داری ہے؟مفتی صاحب اس کی یہ بات سن کر مسکرائے اور اس سے فرمایا کہ:''آپ سے بھول ہوگئی ہے میں نے سو کا نہیں؛ بلکہ پچاس ہی کا نوٹ دیا تھا'' وہ غیر مسلم یہ جواب سن کر حیران رہ گیا اور کہنے لگا:مولانا صاحب آپ پہلے شخص ہیں،جنھوں نے زائد رقم لینے سے انکار کیا ہے؛ورنہ لوگوں کا عامۃً یہ حال ہے کہ خاموشی اور بڑی خوشی کے ساتھ ایسی زائد رقم اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔

مفتی صاحب کے اس عمل سے وہ اس درجہ متأثر ہوا کہ باقاعدہ مذہبِ اسلام کی باتیں کہنے وسننے میں دل چسپی لینے لگا۔اس کے بعد سے اس کنڈکٹر کا یہ معمول بن گیا تھا کہ مفتی صاحب جب کبھی اس بس سے دیوبند جاتے،تو وہ بہ اصرار آپ کو اپنے ساتھ چائے پینے کی پیش کش کرتا اور ہر مرتبہ اسلامی محاسن کے بارے میں کچھ سننے کی خواہش ظاہر کرتا اور آپ بھی اسے دین متین کی اہم اہم باتوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے۔

☆ پٹیالہ شہر کے ایک غیر مسلم جج صاحب کی بیٹی نے بعد از قبولِ اسلام اپنے مطلوب ومعشوق اور ہم وطن کسی مسلمان سے نکاح کر لیا۔جج صاحب کی طرف سے اگرچہ اس کے خلاف کوئی بڑا ایکشن نہیں لیا گیا؛لیکن قبولِ اسلام کا یہ واقعہ چوں کہ

معاشقے کی دین تھا، اسے مذہبِ اسلام کے امتیازات و اختصاصات اور اس بے بہا دولت کے دینوی و اخروی فوائد کا مطلق علم نہ تھا؛ اس لیے تبدیلیِ مذہب کا یہ سفر محترمہ پر بڑا شاق گزرا۔ اطمینانِ قلبی اور اسلام پر ان کے شرحِ صدر کے لیے کسی عظیم علمی و دینی شخصیت سے ان کی ملاقات کو ضروری خیال کیا گیا۔

سخت سردی کے دن تھے، مفتی ہلال عثمانی مدظلہم انگیٹھی گرم کیے ہوئے دفتر دارالافتاء میں مصروفِ کار تھے۔ پٹیالہ کے یہی نوشادی شدہ میاں بیوی حاضرِ خدمت ہوئے۔ خاتون صاحبہ ایک بڑے رئیس گھرانے سے تھیں، صورتِ واقعہ سے مطلع ہوکر حضرت کے اہلِ خانہ نے ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ خاتون نے ملاقات کے شروع میں آپ سے عرض کر دیا تھا کہ انتقالِ مذہب کے اس واقعے کے بعد سے پیش آمدہ اضطراب و بے اطمینانی کے سبب اسے گزشتہ شب بالکل ہی نیند نہیں آسکی، اس لیے میں اسلام کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آپ کے یہاں آئی ہوں اور آج سارا دن آپ کی فیملی کے ساتھ رہ کر اسلامی عبادات و احکام کی انجام دہی کے طریقے سیکھنے کے علاوہ اپنے کچھ شکوک وشبہات کے رفع کرنے کی خواہش مند ہوں۔ حضرت نے بشاشتِ قلب کے ساتھ اس کی یہ فرمائش منظور فرمائی، یہ خاتون اس دن آپ کی اہلیہ اور آپ کی صاحبزادیوں سے اسلامی تعلیمات و عبادات کے بارے میں برابر دریافت کرتی رہیں، نیز ان خواتین کی نجی و اخلاقی و خانگی زندگی کا بہ نظرِ غائر مشاہدہ بھی کیا۔

مذہبی شکوک وشبہات کا مفتی صاحب نے تشفی بخش حل فرمایا۔ بہ وقتِ روانگی محترمہ نے اپنا یہ تأثر ظاہر کیا کہ آپ کے یہاں آکر مجھے بڑا سکون حاصل ہوا ہے اور یہ بھی کہا کہ وہ جلد ہی پھر کبھی آپ کی خدمت میں حاضری دے گی؛ مگر قسامِ ازل کو کچھ اور ہی منظور تھا، کچھ ہی عرصہ بعد یہ خاتون انتقال کر گئیں، درانحالیکہ مفتی صاحب اور

آپ کے اہلِ خانہ سے مل کر اسلام کی شمع اس کے دل و دماغ میں روشن ہوگئی تھی، یہ غم ناک خبر ان کے شوہر کے ذریعے آپ کو موصول ہوئی۔

معلوم ہوا کہ غیر اقوام میں متاثر ہونے اور اثر قبول کرنے کی صلاحیت و گنجائش ابھی بھی موجود ہے؛ لیکن ہماری طرف سے تھوڑی سی کمی یہ ہے کہ ہمارے معاملات اور ہمارا رویہ متأثر کن نہیں ہے۔ ہمارے اخلاق اس درجہ بلند نہیں ہیں، جو اسلام کی صحیح طور پر نمائندگی کر سکیں؛ ورنہ مفتی صاحب سمیت ہمارے اکابر و اسلاف کی تاریخ گواہ ہے کہ اخلاق و کردار کی عظمت و بلندی اور اس کے عملی مظاہر جب بھی برادرانِ وطن کے سامنے آئے، تو ہر ایسے موقع پر وہ غیر معمولی طور پر متأثر ہوئے ہیں اور کفر کے ظلمت کدے سے نکل کر اپنے قلوب کو نورِ ایمان سے منور کیا ہے۔

ایک دفعہ دورانِ گفتگو آپ نے بہت ہی قیمتی بات کہی کہ ''اس ملک میں اگر ہمارے اندازِ زندگی میں ظاہری و باطنی صفائی و پاکیزگی پیدا ہو جائے، تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ تاریخ اپنا رخ بدل دے گی''

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں فرقہ پرستانہ اور اسلام مخالف ذہنیت رکھنے والا یہ مختصر سا طائفہ جس کا ذکر آیا، اس وقت پورے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ہندو مسلم خلیج کو مزید گہرا کر دینے والی باتیں کچھ دانش گاہوں تک سے سنائی دینے لگی ہیں۔

اب ہمیں اس کے سد باب کے طور پر ان سے بہ راہِ راست ملنے، ان کے ساتھ برادرانہ مراسم قائم کرنے اور اسلام کی درست تعلیمات سے انہیں آگاہ کرنے کا کام فوری طور پر شروع کر دینا چاہیے۔

معاشرے کے سر کردہ افراد کو حد درجہ سنجیدگی کے ساتھ عصرِ حاضر کے اس حساس اور سلگتے ہوئے مسئلے کا کوئی مضبوط اور پائیدار حل تلاش کرنا چاہیے اور اپنی اپنی حد تک

اس اہم خدمت میں اپنا حصہ لگانا چاہیے، جن کا اثر ورسوخ شہر کی سطح پر ہو، انہیں چاہیے کہ وہ ہر مہینے اپنے شہر میں ایک ایسا پروگرام رکھا کریں، جس میں ہر دھرم کے لوگوں کو شرکت اور اظہارِ خیال کی دعوت دی جائے۔ مالیر کوٹلہ کے ذی علم اور تجربہ کار لوگوں کے سامنے آپ نے ایسے پروگرام کی جو تفصیلات بیان کیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی؛ ان سب کی ایک مشترکہ کمیٹی تشکیل دی جائے، جو پانچ چھ اراکین پر مشتمل ہو اور یہ اراکین ایسے ہوں، شہر بھر میں جن کا اچھا خاصا حلقۂ احباب ہو، پھر ہر مہینے کے شروع یا آخر کا اتوار طے کر لیا جائے، جس میں ''میل ملاپ'' کے عنوان سے شہر کی کسی اچھی جگہ پر جلسہ رکھا جائے، مسلم اور غیر مسلم سامعین جہاں تک بھی ہو سکے، زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع کرنے کی سعی کی جائے، اس پروگرام میں باری باری ہر دھرم کے لوگ اپنے اپنے دھرم کا تعارف پیش کریں، کس اتوار میں کون اپنے مذہب کا تعارف کرائے؟ اس کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے بھی ممکن ہے۔ مسلم اداروں اور تنظیموں کے اربابِ حل و عقد شہری، ضلعی، صوبائی اور ملکی سطح پر ایسے پروگراموں کے انعقاد کو اپنے ایجنڈے کا حصہ بنا لیں، تو زہے نصیب۔ خالص مسلمان شرکا پر مشتمل جلسوں کے مقابلے یہ مشترکہ جلسے کہیں زیادہ مفید اور نفع بخش ثابت ہوں گے۔ ان شاء اللہ

آپ اپنی اس خواہش کا بارہا اظہار فرما چکے ہیں، لوگوں کو اس پر عمل درآمد کی تلقین وترغیب کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور فرحت بخش خبر یہ ہے کہ آپ صحت یاب ہوتے ہی اس عظیم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم مصمم بھی کیے ہوئے ہیں۔

خدا کرے صحت یابی کے بعد آپ کے ہاتھوں یہ عظیم منصوبہ عمل کی دنیا میں آئے اور پھر اس کے نتائج وثمرات سب کے اس طرف رجوع کا ذریعہ بنیں۔

اسلام واہل اسلام کی جانب منسوب شکوک وشبہات کے ازالے میں عصری جامعات کے مسلم اساتذہ کا کردار

مسلم یونیورسٹی، جامعہ ہمدرد، جامعہ ملیہ اور دیگر وہ عصری ادارے، جہاں ہمارے مسلم اساتذہ بڑی تعداد میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہیں، وہ ملتِ اسلامیہ کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ برادرانِ وطن کے ساتھ ان کی ہمہ وقتی رفاقت، بے تکلفانہ ودوستانہ ماحول میں ان کی روزمرہ کی تحقیقی وعلمی مجالس اور باہم ایک دوسرے کے فکر ومزاج سے مکمل آگہی وغیرہ متعدد امور کے پیشِ نظر یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ دین متین کی درست تعلیمات کی تبلیغ واشاعت اور اسلام واہلِ اسلام کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات اور بے سروپا اوہام وتخیلات کے ازالے کا کام اس طبقے سے بہت بڑے پیمانے پر انجام پاسکتا ہے۔

پروفیسر مولانا محسن عثمانی ندوی صاحب جو ایک صحیح الفکر اور راسخ العقیدہ عالمِ دین ہیں۔عثمانی خاندان کی بزرگ اور علمی شخصیت ہونے کے ناتے مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے ساتھ آپ کا قدیم تعلق ہے۔مفتی صاحب زمانۂ صحت میں مولانا موصوف کی کتابوں سے مستفید ہوئے ہیں اور آج بھی جب ان کی مجلس میں محسن عثمانی ندوی صاحب کا ذکر چھڑ جاتا ہے،تو آپ ان کے افکار وخیالات کی پاکیزگی اور قلمی ولسانی کاوشوں کی بلند وبالا الفاظ میں سراہنا فرماتے ہیں۔

''بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسوم وکفریات کے خلاف کامیاب جہاد'' کے سلسلے میں آپ کی خدمات وافکار پر خامہ فرسائی کے دوران ''ندائے اعتدال علی گڑھ'' کے ایک شمارے میں ''مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ۔مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے'' کے زیرِ عنوان مولانا محسن عثمانی ندوی صاحب کی ایک فکر انگیز تحریر نظر سے گزری،جس میں انہوں نے بلاخوف لومۃ لائم بہت ہی مؤثر لب ولہجے میں عصری اداروں کے مسلم اساتذہ کو ان کی اہم ترین ذمہ داریوں اور ان کی انجام دہی کے طرق سے آگاہ

کیا ہے۔تحریر کے بالاستیعاب مطالعے سے اندازہ ہوا کہ عصری اداروں کے مسلم اساتذہ کی اس عظیم مہم میں حصّہ داری اور اس کی ضرورت وافادیت، نیز مایوس کن حدتک اس عظیم خدمت سے ان کی محرومی کے وجوہ واسباب کے حوالے سے عثمانی خانوادے کے یہ دونوں ہی بزرگ مکمل طور پر ہم خیال ہیں؛ اس لیے ندوی صاحب کی محولہ بالا تحریر کے بعض اقتباسات کے سہارے مفتی صاحب کے موقف کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی رقم طراز ہیں:

''ہندوستان میں مسلمان مختلف نشیب وفراز سے گزرے ہیں، انہیں بار بار مختلف نوعیت کے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اب اس زمانے کا یہ نیا چیلنج ہے کہ ان کو غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے، جن کی تہہ برادرانِ وطن کے دماغوں میں بیٹھ چکی ہے اور جن کا وائرس افکار کو زہرآلود کر چکا ہے۔ برادرانِ وطن کی غلط فہمیوں کے خارزار کو دور کرنے کے بعد بڑی حدتک مشکلات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔اس کام کے لیے تمام عصری جامعات کے مسلم اساتذہ کو اور دانشور حضرات کو اپنا رول ادا کرنا ہوگا، جو حضرات بامقصد زندگی گزارتے ہیں، وہ اپنے اس مشن کی تکمیل کو اپنے مقصد میں شامل کرلیں اور اس کی منصوبہ بندی کریں''۔

اپنے اسی دردِ دل کو ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:

''عصری جامعات کے جو مسلم اساتذہ ہیں، خواہ وہ کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، ان کے لیے لازم ہے کہ ملک کے اپنے شہر کے غیر مسلم علمی حلقوں میں وہ رول ادا کریں، جو ان کے مسلمان ہونے کا اور حالات کا

تقاضہ ہے۔سب سے پہلے بنیادی طور پر یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ اور سیاسی مشکلات اور حق تلفیوں کی اصل وجہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہیں، جو سماج میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ خلیج ہے، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حائل ہے۔غلط فہمیوں کو ڈائلاگ اور مذاکرات اور سمپوزیم کے ذریعے ختم کیا جائے اور علمی سطح پر تعصّبات کے خارزار کو ختم کر دیا جائے اور سماج کے غیر مسلم دانشوروں کو اپنا ہم نوا بنالیا جائے ،تو یہ سب سے بڑا امپاورمنٹ ہوگا جو اس ملک کے مسلمانوں کو حاصل ہوگا''۔

انہیں اس طریقِ کار کی افادیت اور نتیجہ خیزی پر کس درجہ کامل یقین ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگائیے:

''جملہ عصری اداروں کے مسلم اساتذہ کی اولین ذمہ داری علمی سطح پر ہر ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔علمی سطح پر کام کا مطلب یہ ہے کہ سیمیناروں کے ذریعے یا انگریزی میں آرٹیکل اور لٹریچر کے ذریعے۔یہ اہم کام ہے، جو عصری جامعات کے مسلم اساتذہ کو کرنا چاہیے۔یہ وہ کام ہے، جو یونیورسٹی کے اساتذہ علمائے کرام سے زیادہ بہتر انجام دے سکتے ہیں۔یہ وہ کام ہے، جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے''۔

آج کل کی جو صورتِ حال ہے اور عصری دانش گاہوں میں دینی تعلیمات کے احیا اور زریں مواقع فراہم ہونے کے باوجود اسلام کی اصل وصاف ستھری شبیہ غیر مسلم برادرانِ وطن کے سامنے رکھنے اور ان کے زنگ آلود اذہان کی صفائی کرنے اور اس عظیم دینی وملی واساسی خدمت کی انجام دہی کی خاطر نت نئے

طریقے اپنانے جیسے متعدد امور کے سلسلے میں جو لا پروائی وغفلت پائی جا رہی ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے اور افسوس ناک وکرب ناک بھی۔ عصری اداروں کے ایسے مسلم اساتذہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے محسن عثمانی صاحب نے ان الفاظ میں جھنجھوڑا ہے:

''عام طور پر مسلم اساتذہ پر علمی مردنی چھائی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بستی میں آگ لگ چکی ہے اور یہ حضرات کسی درخت یا دیوار کے سایے میں آرام کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ فکر کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ اب کسی یونیورسٹی سے جوئے حیات ابلتی نہیں ہے۔ نہ کہیں درد وسوز ہے، نہ بحر کی موجوں میں اضطراب ہے، کہیں علم کا ساز، نہ ادب کی آواز، نہ کوئی خیالِ نو، نہ جرأتِ اندیشہ نہ تعمیر وترقی کا منصوبہ، نہ عزم و ارادہ، نہ کوئی منزل نہ کوئی جادہ۔ بعض اساتذہ کی شخصیت حیوانِ ناطق کے بجائے حیوانِ کاسب کی مصداق بن گئی ہے۔ بعض اساتذہ تو معمولی درجے کے غیر علمی کاروباری نوعیت کے ترجمے کے کاموں کے لیے زندگی وقف کر دیتے ہیں اور ''کون بنتا ہے کروڑ پتی'' کی ریس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ انہیں اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا جی چاہتا ہے:

کچھ قدر اپنی تونے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

عصری اداروں کے مسلم پروفیسران اور دانشوران میں در آنے والی اس کمی کی ایک بنیادی واہم وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صحبتِ صالح کے اصول اور اس کی افادیت و ضرورت کا احساس بہت ہی کم کیا۔ پروفیسر مولانا محسن صاحب عثمانی نے اس مرض کی

تشخیص کے ساتھ ہی انہیں کسی عظیم وبافیض علمی شخصیت کے زیرِ سایہ رہنے اور اس کی ہم نشینی اختیار کرنے کا مشورہ بایں الفاظ دیا ہے:

''عصری جامعات کے اساتذہ میں شوقِ علم کیوں ختم ہو گیا ہے اور ان کا نشترِ تحقیق اب کیوں کند ہو گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے اب زندہ آئیڈیل باقی نہیں رہ گئے ہیں اور اہلِ علم اور اہلِ ادب کی صحبت میسر نہیں۔ اچھا اسکالر اور اچھا دانشور بننے کے لیے اچھے اسکالر اور اچھے دانشور کی صحبت ضروری ہے۔ علم کی دنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، علم کے ذوق کے لیے زندگی کے ساز کو ایک اچھے اسکالر کے مضرابِ حیات کی ضرورت ہوتی ہے، ایک باکمال شخص کی حیات بخش شبنم سے بہت سے اساتذہ اور طلبہ کا باغیچۂ حیات شگفتہ ہوتا ہے۔ اگر یونیورسٹی کے اساتذہ ہر وقت اسمارٹ فون پر سوشل میڈیا کے سمندر میں شناوری کرتے رہیں گے، تو نہ وہ خود صاحبِ کمال بن سکتے ہیں اور نہ اپنے طلبہ کو باکمال بنا سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے مفاسد بھی بہت ہیں اور ان کی اہمیت بھی اپنی جگہ پر ہے، علم کا کوئی شعبہ ہو، اس کے بارے میں ''گوگل'' فوراً علاء الدین کے چراغ کی طرح معلومات لے کر حاضر ہو جاتا ہے؛ لیکن اس چراغ سے استفادہ کتابوں اور کتب خانوں سے استفادے کی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے اچھے اور مثالی استاذ سے رابطہ ہمیشہ قائم رکھنا چاہیے''۔

پھر آگے ایسی عظیم شخصیات اور ان کی کتب سے استفادے کی مثال میں ڈاکٹر حمید اللہ کا نام پیش کیا ہے، جن کی شخصیت آج بھی علمی دنیا میں دین وعصر کے حسین سنگم کی حیثیت رکھتی ہے اور جن کی قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ اور اسلامی و بین

الاقوامی قوانین پر گہری نظر کا ہر طبقۂ خیال کے لوگوں کی جانب سے اعتراف واقرار کیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے مختلف ومتنوع موضوعات پر بیسیوں کتابیں اپنے پیچھے یادگار چھوڑی ہیں۔

پروفیسر ودانشور حضرات کے بارے میں مفتی ہلال عثمانی اور پروفیسر مولانا محسن عثمانی ندوی کے علاوہ اس ملک کے تقریباً تمامی محقق وجہاں دیدہ علما یہی تخیل ورائے رکھتے ہیں اور اپنے اپنے طور پر اصلاح حال کی کوششوں میں مصروف ومنہمک ہیں۔فجزاہم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیرالجزاء

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے متعدد عصری اداروں کے مسلم اساتذہ کے ساتھ قدیم روابط ہیں۔مسلم یونیورسٹی کورٹ علی گڑھ کے آپ ممبر بھی رہ چکے ہیں، نیز آپ کے قائم فرمودہ جامعہ دارالسلام کا ملک کی معروف عصری دانش گاہوں کے ساتھ الحاق بھی رہا ہے، اس لیے آپ ان مسلم اساتذہ کی دینیات میں کمزوری اور تبلیغ واشاعت اسلام میں حصّہ نہ لینے کے اصل وجوہ واسباب سے واقف بھی ہیں اور اس تکلیف دہ صورت حال کے ازالے وخاتمے کے طور پر ان تعلقات کو استعمال میں بھی لاتے رہے ہیں۔

علمائے عہدِ حاضر کا اسلامی واخلاقی فریضہ ہے کہ خود ان تک پہنچیں، ان میں دینی اسپرٹ پیدا کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں، دینِ متین کے جن احکام وتعلیمات سے متعلق ان کے ذہن شکوک وشبہات کا شکار ہوں، تو ان کا شافی وکافی حل پیش کریں۔ ہمارے ملک؛ بلکہ مغربی دنیا کے مضبوط ومستحکم ذرائعِ ابلاغ نے اسلام کی شبیہ کو داغدار کرنے کا جو ناپاک کام انجام دیا اور جس کا سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے، بدقسمتی سے ہمارے عصری اداروں کے بہت سے اساتذہ اور دیگر عصری تعلیم یافتہ نوجوان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، جس کا مکروہ نتیجہ ان کے عقائد واعمال

کے بگاڑ کی شکل میں نمودار رہوا۔راشد شاذ وغیرہ دراصل اسی مغربی سازش کا شکار اور اسی گندی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

عصری اداروں کے ہمارے مسلم پروفیسر ودانشور حضرات اسلامی تعلیمات کے حوالے سے خود ہی متذبذب ہوں اوران کے اذہان وقلوب اس بابت صاف نہ ہوں اور مزید براں یہ کہ کوئی انہیں درست رہنما بھی میسر نہ ہو،تو پھر ظاہر ہے یہ اساتذہ غیروں میں تبلیغِ دین تو بعد کی بات ہے،خود ہمارے مسلم طلبہ کی غلط تعلیم وتربیت کا ذریعہ اور دینی لحاظ سے ان کے معصوم اذہان کے انتشار کا باعث بنیں گے،جیسا کہ راشد شاذ وغیرہ کے اسلام مخالف نظریات اور طلبہ کی ان سے اثر پذیری کے واقعات بہ طور مثال سامنے ہیں۔

ان حالات میں تین اہم امور کی طرف توجہ دہی اربابِ علم وفضل کا اولین فریضہ ہے۔

(۱) حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاکیزہ قرن میں اور اسی طرح مابعد کے ادوار میں اللہ کے مخلص بندوں نے غیر مسلموں میں دعوت دین کو اپنا فرضِ منصبی گردانا اور اصلاح المسلمین اور امت دعوت میں دعوتِ دین کی خاطر اپنی عمریں وقف کردیں۔مفکرِ اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' میں مختلف ادوار کی ایسی بے مثل شخصیات کے کارہائے نمایاں ذکر کیے ہیں۔الحمد اللہ یہ تسلسل از آدم تا ایں دم برقرار ہے اوراس کارخانے کے مالک وخالق کو اس کا بقا جب تک مقصود ہے،اس وقت تک ایسے بے غرض خدام دین اور دعاۃ و مبلغین دنیا کے اطراف واکناف میں خلقِ خدا کو اپنے خالق سے جوڑنے کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔ان شاء اللہ

حضراتِ صحابہ کرام اور دیگر بزرگان وداعیانِ دین کی کامیاب دعوتی مساعی کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ پروردگار کی قدرتِ کاملہ پر کامل

ایمان وتوکل کے ساتھ اپنے مشن میں حد درجہ مخلص تھے، وہیں دوسری طرف انہوں نے اپنے دور کے مقتضیات سے بے توجہی نہیں برتی؛ بلکہ ہم عصروں وہم وطنوں کے دلی جذبات کو سمجھا اور بڑی دانائی وحکمتِ عملی کے ذریعہ یہ عظیم معرکہ سرکیا کہ دنیا آج بھی ان کے کارنامے سن کر حیران ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا میں جہاں بھی گئے، خلقِ خدا کا ان کے گرد مضبوط حلقہ قائم ہوتا گیا اور ہزار ہا بندگانِ خدا کو ان کی وساطت و برکت سے ایمان کی روشن راہ نصیب ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ اس سلسلے کے دو بڑے اہم اور ممتاز نام ہیں۔

یہ طریقِ کار کل بھی مفید تھا اور آج بھی اسی کی تعمیل میں خاطر خواہ کام یابی مضمر ہے۔

برادرانِ وطن میں دعوتِ دین کے کون سے طرق مؤثر ہوں گے؟ ملکی و بین الاقوامی سطح پر پروپیگنڈے کے زور پر پھیلائے گئے اسلام مخالف نظریات کے ازالے کے لیے وہ کون سی تدابیر اختیار کی جائیں، جو ان کا مکمل طور پر سدِّ باب کرسکیں؟ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کیوں کر ممکن ہے؟ پیغمبرِ اسلام اور ان کی مختصر سی جماعت نے تھوڑے سے عرصے میں بڑی بڑی طاقتوں کو اپنا محکوم کیسے بنا ڈالا؟ یہ اور اس جیسے کئی سوالات ہیں، جن کے جوابات کو ایسی ذی علم شخصیات کی صحبت وہم نشینی سے علی وجہ الکمال والتمام سمجھا و حاصل کیا جاسکتا ہے، جن کی عمر عزیز کا واحد شغل دعوتِ دین ہی رہا ہو۔ ہمارے ملک کا ماضی ایسی کئی ہستیاں اپنے دامن میں رکھتا ہے اور حال میں بھی اللہ کے بعض بندے حسبِ مقدور اس عظیم خدمت میں مصروف ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ ثانوی درجے میں اس راہ کے راہی حضرات کے لیے وہ کتابیں بھی حد درجہ ممد

ومعاون ثابت ہوں گی، جو عہدِ حاضر کے شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور ہمارے ملک کے نامور محدث وفقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایسے مفکر اور دوربین ودوراندیش حضرات کے قلم سے نکلی ہیں۔ مولانا رحمانی نے اپنی ''دعوتِ دین؛ مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل''، ''اسلام کو سمجھے'' اور ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے'' نامی کتابوں میں بین الاقوامی نقشے کو سامنے رکھ کر داعی کے لیے بڑی قیمتی راہیں تجویز کی ہیں اور کامیابی وفلاح یابی کی ضامن وہ نصیحتیں رقم کی ہیں، جنہیں اپنائے بغیر داعی کے لیے منزل مقصود تک پہنچنا کارے دارد ہے۔

پنجاب میں شہر لدھیانہ سے بیس بائیس کلومیٹر کی دوری پر ایک پایل نامی قصبہ ہے، یہیں کے نومسلم باشندے مولانا عبید اللہ پایلیؒ نے آج سے تقریباً ایک صدی قبل ''تحفۃ الہند'' کے نام سے ایک لاجواب کتاب لکھی تھی، جو سیکڑوں بندگانِ خدا کے آغوشِ اسلام میں آنے کا ذریعہ بنی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے بھی اسی کتاب سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کتاب میں جس معروضی ومثبت انداز میں اسلام کے حق وسچ ہونے اور کفر وشرک کے باطل و غلط ہونے کو پیش کیا گیا ہے، کم از کم وہ انداز ورنگ کسی اور کتاب میں راقم السطور کو نظر نہ آسکا۔ یہ کتاب دیوبند کے بعض کتب خانوں پر آج بھی دستیاب ہے۔

یہ وہ طریقِ دعوت ہے، جس کو عملی جامہ پہنا کر علما براہ راست غیر مسلم برادرانِ وطن میں دعوتِ دین کا کام انجام دیں اور کامیابی کے لیے اپنے پروردگار کے حضور دعا گو رہیں کہ یہ اسی کے امر پر موقوف ہے۔

(۲) حضرات علما کی خصوصی توجہات کا مستحق دوسرا اہم ترین کام یہ ہے کہ وہ شہری، ضلعی یا ملکی سطح پر ایسے تمام اشخاص وملل کی ذہن سازی فرمائیں، جن کے شب و روز کے اکثر اوقات برادران وطن کے ساتھ گزرتے ہیں، متعدد پلیٹ فارموں پر مسلم وغیر مسلم کی یکجائی کی مثالیں موجود ہیں۔ بالخصوص عصری اداروں کے مسلم اساتذہ

اسلام کی سفارت کا فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں۔انہیں اچھا سفیر اور برادرانِ وطن میں اسلام کا کامیاب ترجمان بنانے کے لیے مکمل طور پر دینی رنگ میں رنگ دینا اور احکامِ دین پر ذاتی عمل کے ساتھ غیروں میں اس کے تعارف کا جذبۂ بے تاب ان میں پیدا کر دینا یہ عہد حاضر کی ایک بڑی اہم ضرورت ہے۔اگر ایسا ہو جائے، تو یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ حضرات، علما کے مقابلے زیادہ بہتر طریقے سے برادرانِ وطن میں اسلام کی کامیاب ترجمانی کر سکتے ہیں۔جن بعض جگہوں پر ایسا ہوا ہے، وہاں پر واضح فوائد سامنے آئے ہیں۔

اس کام کے لیے وارثینِ انبیا کو خود ہی ایسے احباب کے در پر حاضری دینی ہوگی، ان کی طرف سے پہل وپیش قدمی کے امکانات، مدت ہوئی مادّہ پرستی کی لعنت نے تقریباً معدوم ہی کر ڈالے ہیں۔

جدید وقدیم کا ذکر سرے سے ختم کر دینا چاہیے۔قدیم صالح وجدید نافع کے اصول کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔مدتِ دراز سے یہ تکلیف دہ صورتِ حال باقی ہے کہ بہ حیثیتِ مجموعی دونوں ہی طبقے اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں اور ایک دوسرے سے ملنے کی انہیں کوئی فکر ہے اور نہ ہی کوئی دلچسپی؛ بلکہ بسا اوقات ایسی ملاقاتوں کو ضیاعِ وقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اب اس خلیج کو پر کرنا ہوگا اور ان کی فیشن ایبل زندگی سے متوحش ہونے کے بجائے انہیں اسی حال میں اپنے گلے لگانا ہوگا؛ تا کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ اربابِ مدارس اور علمائے دین کے دل میں ان کی قدر اور محبت موجود ہے۔اسی قربت و انسیت سے پھر آگے کے متوقع مراحل طے پاسکیں گے۔ان شاء اللہ

دینی تعلیمات سے متعلق ان سے کوئی بھی گفتگو کرتے وقت انگریزی و ہندی آمیز زبان استعمال کی جائے؛ کیوں کہ یہ طبقہ اسی طرح کی زبان کو سمجھتا ہے اور اسی کو سننا پسند بھی کرتا ہے، جبکہ عربی وفارسی کے الفاظ ومحاورات پر مشتمل مدارس کی ٹکسالی

اردو زبان ان کی طبائع پر بار ثابت ہو جاتی ہے اور وہ ہماری بات کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

(۳) تیسرے یہ کہ وہ تنظیمیں اور اشخاص و افراد جو عصری تعلیم یافتہ طبقے پر اثر انداز ہیں، جن کا اندازِ گفتگو اور طرزِ تفہیم اس طبقے کو اپیل کرتا ہے اور جنھوں نے اس طبقے پر دینی اثرات کی چھاپ چھوڑنے کی کوششیں بھی جاری رکھی ہوئی ہیں، ایسی تنظیموں اور اشخاص کی حوصلہ افزائی کی جائے اور خود ان میں اگر قابلِ اصلاح چیزیں ہوں، تو ان کی اصلاح بھی کی جائے۔

ہمارے ملک میں جن جماعتوں نے اس طبقے پر گہرا اثر ڈالا ہے، ان میں جماعتِ اسلامی ایک نمایاں نام ہے۔ ضرورت ہے کہ اس جماعت کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کیے جائیں، جن امور میں ہمارے بیچ اختلاف پایا جاتا ہے، اس کو مزید ہوا دینے کے بجائے ان کا کوئی بہتر اور معقول حل تلاش کیا جائے۔ جو چند در چند غلط فہمیاں ہمارے بیچ در آئیں ہیں، آپسی مستحکم تعلقات کے ذریعے، ان کو دور و دفع کیا جائے۔ حالاتِ حاضرہ کی سنگینی کے پیشِ نظر اب ہمیں مصالحت کے فارمولے پر ہی عمل درآمد کرنا چاہیے۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے مرشدِ اوّل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا بھی بعینہ یہی خیال تھا۔ آپؒ مسلکی و فروعی اختلافات کو سنجیدہ ماحول ہی میں حل کرنے کے قائل تھے۔

۱۲۔۱۳؍ اگست ۲۰۱۸ عیسوی کو دارالعلوم وقف دیوبند کے اربابِ انتظام نے خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ کی حیات و خدمات پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا تھا، جس میں ملک و بیرونِ ملک کے مشاہیر علمائے دیوبند نے شرکت کی اور مختلف مکاتبِ فکر کے زعما کی بھی اچھی خاصی نمائندگی رہی تھی۔

مولانا اعظم ندوی استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد(جو اس سیمینار میں شریک رہے تھے)نے اکابر علما کے تأثرات کے ضمن میں مولانا جلال الدین عمری مد ظلہم کا تأثر ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

’’مولانا جلال الدین انصر عمری امیر جماعتِ اسلامی ہند نے مولانا سے اپنے خصوصی تعلقات کی داستان بیان کی، پھر کہا کہ مولانا کی طرح کچھ آپ قریب آئیں، کچھ ہم آتے ہیں، مولانا مودودی صاحب پر علمی تنقید کریں، کہیں میں بھی ساتھ ہو جاؤں گا، کہیں معقول جواب دینے کی کوشش کروں گا؛ لیکن ہمیں اب ان موضوعات کو ڈھونے کے بجائے بنیادی اسلامی کاز پر توجہ دینے کی ضرورت ہے‘‘

اکابر کے اس درد کو سمجھنے کی ضرورت فی زمانہ کچھ زیادہ ہی ہے۔فروعی مسائل کی بابت دیگر مسالک کے ساتھ بھی اسی اصول کو روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔

برادران وطن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ تبلیغِ دین کا کام کرنے سے متعلق مفتی ہلال عثمانی مد ظلہم کی ان قیمتی آراء پر اللہ رب العزت ہمیں عمل کی توفیق بخشے۔

○❖○

قومی وبین الاقوامی کانفرنسیں اور سیمینار جن میں آپ شریک رہے

قومی وبین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں کی اہمیت وافادیت اور ان کے دیرپا ودوررس اثرات ونتائج کا اعتراف ہر طبقۂ خیال اور ہر دین وملت کے لوگوں نے کیا ہے، ملکی وعالمی سطح پر ایسے پروگراموں کے انعقاد کی روایت قدیم سے چلی آرہی ہے اور جب سے مضبوط ومستحکم ذرائع ابلاغ کی فراوانی وبہتات نے ایک طرح سے ساری دنیا کی طنابیں کھینچ ڈالی ہیں، اس وقت سے ان کی اہمیت اور انسانی اقدار کے بقا میں ان کے روشن کردار کو اور زیادہ محسوس کیا جانے لگا ہے؛ چناں چہ پچھلے تیس چالیس سالوں میں ایسے پروگرام بہ کثرت ہوئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان سیمیناروں وکانفرسوں کے توسل سے نہ صرف مسلمانوں کے؛ بلکہ عالمِ انسانیت کے مسائل کھل کر سامنے آتے ہیں، پھر کئی کئی روز کے بحث ومباحثے اور سوال وجواب کے طول طویل سلسلے کے بعد متفقہ طور پر ان مسائل کا حل نکالا جاتا ہے اور اس طرح عالمِ انسانیت کو بڑے بڑے مسائل ومصائب سے چھٹکارا نصیب ہوجاتا ہے۔ یہی بین الاقوامی سیمینار ہیں، جن سے مختلف ممالک کے اصل مسائل کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ کسی بھی دینی یا دنیاوی عنوان پر یہ پروگرام منعقد ہوں مختلف ممالک کے اہلِ علم اور اربابِ عقل وخرد اور سائنس داں حضرات کی یکجائی کی بنا پر اس مسئلے کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور یہ صرف سیمیناروں کے ذریعے ممکن ہے۔ نیز ان کے لاتعداد بیش قیمت فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ دیگر ممالک کی تہذیب وتمدن اور وہاں کے نظامِ تعلیم اور دیگر نظام ہائے حیات کو بہ چشم خود دیکھنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ مفتی صاحب مد ظلہم کا مراکش جانا ہوا، تو آپ کی خواہش وفرمائش پر میزبان حضرات نے آپ کو قدیم مراکش اور بالخصوص اس تعلیم گاہ کی سیر کرائی، جہاں امام رازی ایک زمانے

تک طالب علم رہے تھے۔آپ نے وہاں پہنچ کر اس مدرسے کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا،جس میں دین وعصر کی بہ یک وقت مکمل تعلیم دی جاتی تھی، چناں چہ اس ادارے کی کوخ سے جہاں امام رازی جیسے پائے کے علما نے جنم لیا، وہیں دوسری طرف ٹھیک اسی دور میں عالم اسلام کو ایک معتد بہ تعداد میں کامیاب سائنس داں اور حکما ودانشوران بھی یہیں سے عطا ہوئے۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم پر پروردگار کا ایک عظیم احسان یہ ہے کہ انہیں مختلف علوم و فنون کے جامع و وسیع مطالعے کے علاوہ عالمی سطح کے اسلامی و انسانی برادری کے مسائل کے حل سے ابتدا ہی سے انسیت اور گہری دلچسپی رہی ہے، پھر آپ کو من جانب اللہ زبان وقلم بہر دو زبانوں میں اپنی معروضات کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کا وہ ملکہ حاصل ہوا کہ عرب وعجم ان کی تحریر وتقریر سے یکساں مستفید ہوتے ہیں اور مطالعے کی کثرت نے آپ کو وسعتِ ذہنی اور روشن خیالی کے جس اعلیٰ درجے تک پہنچا دیا ہے، اس کی مثالیں اب خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان جیسے اوصاف کے پیشِ نظر قومی و بین الاقوامی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں متعدد دفعہ آپ کو وطنِ عزیز ہندوستان کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔

سابق صدر پاکستان جناب جنرل ضیاء الحق صاحب شہیدؒ کے عہدِ صدارت میں ''بین الاقوامی قرآن کانفرنس'' اور ''بین الاقوامی سیرت کانفرس'' کے نام سے دو بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد اسلام آباد میں عمل میں آیا۔ان دونوں کے اصل داعی ومحرک شہید ضیاء ہی تھے۔مفتی صاحب مدظلہم صدر صاحبؒ کی دعوت پر دونوں ہی عظیم کانفرنسوں میں شریک ہوئے اور سیرتِ نبوی اور قرآنی اقدار پر آپ کے مضامین کی خوب پذیرائی ہوئی۔غالباً پشاور کی ایک مسلم خاتون نے اپنے ماہنامے میں آپ کے مفصل مضمون کو بالاقساط شائع کیا تھا اور انہوں نے ہر شمارہ مفتی صاحب

کی خدمت میں ارسال بھی کیا۔ جنرل ضیاء نے اپنے اس ہندوستانی مہمان کومخصوص اصحاب کی دعوتِ طعام میں شریک کیا اور جب مفتی صاحب رخصت ہونے لگے، تو ضیاءصاحب کار تک آپ کو چھوڑنے آئے اور باضابطہ مفتی صاحب کے کار میں سوار ہونے تک اس کا دروازہ خود ہی کھول کر کچھ دیر تک کھڑے رہے۔ دونوں دفعہ پاکستان حاضری کے موقع پر ضیاء مرحوم کا آپ کے ساتھ یہی معاملہ رہا۔ یہ دراصل خاندانی عظمت کا اعتراف تھا، جو ایسے ہی مخلص وخداترس حکام سے ممکن ہے۔ بعدہ جب مفتی صاحب کو معلوم ہوا کہ ضیاء صاحب کا معاملہ شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم اور دیگر علما کے ساتھ بھی یہی ہے، تو آپ کے دل میں ان کی عقیدت و محبت پہلے سے بھی دوچند ہوگئی۔ پاکستان کے اس سفر میں آپ کے علاوہ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰنؒ سابق ناظم ندوۃ المصنفین اعظم گڈھ اور جناب سید حامد صاحبؒ سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ بھی ہندوستان سے مدعو تھے۔ اول الذکر طبقۂ علما میں محتاجِ تعارف نہیں، ان کے قلم سے بیسیوں مقبولِ عام کتابیں نکلی ہیں؛ جبکہ سماجی، سیاسی اور تعلیمی میدانوں میں ثانی الذکر کی خدمات تاریخِ ہند کا ایک روشن وتابناک باب ہیں۔

قریب قریب اسی دور کا ذکر ہے، مراکش میں خطباتِ جمعہ کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا، جس میں امام کعبہ بھی تشریف لائے تھے، جامعۃ الازہر مصر کے ذمہ داران بھی بہ طور خاص شریک ہوئے تھے اور دیگر جملہ اسلامی ممالک کی طرف سے بھی بھرپور نمائندگی ہوئی تھی۔ ہندوستان سے آپ کے علاوہ مولانا احمد مصطفیٰ الہ آبادی صاحب مدعو تھے۔ مفتی صاحب مدظلہم نے بہ شکلِ تحریر جو تجویز پیش کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ خطباتِ جمعہ کا پہلے ہی خلاصہ تقسیم کردیا جایا کرے، جس پر باقاعدگی کے ساتھ سوال و جواب ہوں اور پھر ان جوابات کو

تعلیماتِ اسلام کی سند دی جائے۔اس طرح ایک طریقے سے تعلیم بھی ہو جائے گی اور لوگوں کی دل چسپی بھی قائم رہے گی۔آپ کی اس تجویز کو بے حد سراہا اور پسند کیا گیا اور اس تجویز کو منظوری بھی دی گئی، جو یقیناً ایک ہندی عالم کے لیے بڑے فخر و اعزاز کی بات ہے۔

مختلف مذاہب کے تعارف کی غرض سے ایک بین الاقوامی کانفرنس تھائی لینڈ میں ہوئی جس میں دنیا کے کئی ممالک کے مختلف المذاہب لوگ جمع ہوئے۔ہندوستان سے اسلام اور مسلمانانِ ہند کے ترجمان کی حیثیت سے حضرت مفتی صاحب مدظلہم اور جناب ڈاکٹر ظفر محمود صاحب تشریف لے گئے تھے، تین چار روزہ تھائی لینڈ کا یہ دورہ مثبت نتائج کا حامل رہا تھا، مفتی صاحب کے صاحب زادے طارق عمیر عثمانی بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔

امریکہ کی تنظیم سلام شیلوم سسٹرہڈ کی جانب سے انڈونیشیا اور ملیشیا میں ایک بین الاقوامی کانفرنس رکھی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف انداز میں مسلم سماج کے پہلو اور ان کی پروبلمس سامنے لائی جائیں۔یہ مفتی صاحب کا پہلا ہی تجربہ تھا کہ کس طرح اس تنظیم کے لوگ ورکشاپ کے انداز میں امت مسلمہ کے مختلف مسائل کو ابھارتے اور ذہن نشین کراتے ہیں۔اس تنظیم کے سربراہ لندن کے ایک کرسچن صاحب تھے۔آپ نے ان کے سامنے اپنی یہ رائے رکھی کہ پروبلمس صرف مسلم سماج میں ہی نہیں پائی جاتی؛ بلکہ اور بھی مختلف قومیں ہیں، جو بہ مقابلہ مسلمانوں کے زیادہ پروبلمس کی شکار ہیں؛اس لیے ان کے مسائل اور پروبلمس کو بھی تنظیم کی جانب سے منعقدہ ایسی کانفرنسوں کا عنوان بنانا چاہیے،صرف مسلمانوں کے مسائل ہی کو ان کا موضوع نہ بنانا چاہیے۔

ان صاحب نے بڑی توجہ کے ساتھ آپ کی یہ بات سنی اور آپ کو یہ رائے بہ شکل

تحریر اپنی تنظیم کے آفس پہنچانے کی بات کہی۔ انڈونیشیا وملیشیا کا یہ سفر دس بارہ روز تک جاری رہا تھا۔

جہاں تک ملکی سطح کی قومی و بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں کا تعلق ہے، تو ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ چند اہم سیمیناروں و کانفرنسوں میں آپ کی شرکت کی روئداد نقل کی جاتی ہے:

جامعہ ہمدرد تغلق آباد میں بین الاقوامی قرآن کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں تقریباً تمام ملکوں کے نمائندے موجود تھے۔ آپ نے ''قرآن کریم اور نظام اقدار'' کے موضوع پر مبسوط مقالہ لکھا، بحث ومباحثے میں بھی بھرپور حصہ لیا اور تمام سوالات کے اطمینان بخش جوابات بھی پیش کیے۔ اس کانفرنس نے بڑا دلچسپ رخ اس وقت اختیار کرلیا، جب ایک صاحب نے ایک پرانی سی کتاب (جوان کے پاس اس وقت موجود تھی) کے سہارے یہ دعویٰ کرڈالا کہ ہندوستان کی جملہ مساجد کا رخ غلط ہے اور یہ کہ وہ سب صحیح سمتِ کعبہ سے ہٹی ہوئی ہیں۔ ان کی اس بات نے وقتی طور پر ہلچل سی پیدا کر دی اور سب لوگ اپنے اپنے طور پر اس کے بارے غور وفکر کرنے لگ گئے، اسی اثنا میں میرٹھ کے ایک وکیل صاحب نے ان کے اس دعوے کی پرزور اور مدلل تردید کرتے ہوئے ستارے کے ذریعے ایک فارمولہ پیش کیا اور ان معترض صاحب سمیت تمام شرکا سے بڑے ہی پر اعتماد لہجے میں کہا کہ: آپ جب چاہیں اس فارمولے کے ذریعہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام مساجد کا رخ صحیح ہے۔

غالب اکیڈمی میں دہلی کی سیرت کمیٹی کی جانب سے تعلیمی مسائل پر سیمینار رکھا گیا، جس میں خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ، سید حامد صاحبؒ اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے۔ اچھی خاصی تعداد میں پڑھے لکھے دانشور حضرات کی شرکت نے اس سیمینار کو بڑی کامیابی ومقبولیت عطا کی تھی۔

ڈاکٹر محمود صاحب نے دہلی ہی میں مختلف مذاہب سے متعلق ایک سیمینار رکھا، جس میں ہندوستان کے تقریباً تمام ہی ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کی نمائندگی رہی تھی۔ مولانا وحیدالدین خان صاحب نے اس موقع پر بڑا عمدہ خطاب کیا تھا۔ یہ سیمینار پورے دن جاری رہا تھا۔ مفتی صاحب نے صبح کی مجلس میں مختصر خطاب کیا تھا، اس لیے شام کی مجلس میں آپ کو دوبارہ دعوتِ خطاب دی گئی اور آپ کا تفصیلی خطاب ہوا۔

مولانا رضوان القاسمیؒ بانی دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی دعوت و تحریک پر آپ حیدرآباد تشریف لے گئے، جہاں پانچ روز مسلسل آپ کے خطاب ہوئے، یہ خطاب ''نبیٔ رحمت کا پیامِ رحمت'' کے نام سے حیدرآباد اور دیوبند دونوں جگہوں سے کتابی شکل میں شائع ہوئے اور علمی حلقوں میں خوب پسند کیے گئے۔ حیدرآباد میں ایک سیرت کانفرس (جس کے شرکا کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی) سے دو روز خطاب فرمایا، یہ خطاب سیرت نبوی ﷺ اور حیاتِ صحابہ کے عنوان پر تھے۔

علی گڈھ میں بھی ایسی ہی کسی مجلس سے سیرتِ نبوی ﷺ کے موضوع پر خطاب فرمایا، جسے بڑی توجہ اور اہتمام کے ساتھ سنا گیا۔ رجسٹرار نے اپنا تأثر ان بلیغ الفاظ میں نقل کیا تھا کہ: مفتی صاحب کے اس پرمغز و تحقیقی خطاب سے ہمیں ریسرچ کے کئی موضوع ہاتھ آگئے ہیں۔

جب تک صحت بحال رہی، آپ فقہ اکیڈمی کے ہر سیمینار میں شریک رہے، جن کی تعداد حد احصا سے باہر ہے۔ من جملہ ان کے ایک بڑا تاریخ ساز سیمینار ''کیا اسلامی سزاؤں کی آج بھی کوئی اہمیت ہے؟'' کے عنوان پر ہوا تھا۔ اس میں قانون داں حضرات بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ یہ سیمینار ہر لحاظ سے کامیاب و بامراد ثابت ہوا تھا۔ آپ فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں عملی حصہ لیتے، مقالہ لکھتے اور سوالات کے جوابات بھی دیتے۔ اب کافی سال ہوگئے سقوطِ صحت کی بناپر آپ شریک نہیں ہو پاتے ہیں۔

علی گڑھ میں آپ کی زیرِ صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی حیات وخدمات پر سیمینار ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے اس سیمینار کے لیے مولانا اکبر آبادیؒ پر مفصل مقالہ لکھا تھا، جو کتابی شکل میں شائع شدہ ہے۔

ماضی کے چند جرائد ورسائل

جو آپ کی زیرِ ادارت شائع ہوئے

ہفت روزہ عقائد دیوبند

مفتی صاحب مدظلہم جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت پر مامور تھے، اسی زمانے میں "ہفت روزہ عقائد" نامی یہ اخبار آپ کی زیرِ ادارت نکلا اور اس کے شروع کے شمارے عوام و خواص سب میں خوب مقبول ہوئے تھے۔ چھ چھ ہزار کی تعداد میں اس کے شمارے چھپا کرتے تھے، جو ۱۹۷۱ء و ۱۹۷۲ء کے پیشِ نظر بڑی بات تھی اور اس کے قبول عند اللہ وعند الناس ہونے کی دلیل بھی۔ اطہر عثمانی دیوبندی جو بعد میں دیوبند سے سہارنپور منتقل ہوگئے تھے، وہ اس کے اصل مالک تھے اور اس کے دائرے کو وسیع کرنے میں وصی عثمانی صاحب، اطہر عثمانی صاحب اور مولانا ندیم الواجدی صاحب کی مساعیِ جمیلہ کو خاص دخل رہا تھا۔ مفتی صاحب مدظلہم کی بیش قیمت تحریرات کے سبب قارئین کے یہاں اس کا ایک خاص مقام تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دو سال یہ اخبار آپ کی زیرِ ادارت شائع ہوا۔ سن ۱۹۷۳ عیسوی میں جب آپ دارالعلوم دیوبند سے دارالافتاء مالیر کوٹلہ پنجاب منتقل ہوگئے، تو اس موقع پر آپ نے ازخود اس کی ادارت کو خیرباد کہہ دیا اور بہ طور مدیر اپنا نام درج نہ کرنے کا مشورہ بھی اطہر عثمانی وغیرہ کے سامنے رکھ دیا؛ تاکہ کوئی بھی مختلف فیہ بات آپ کی جانب منسوب نہ ہو اور اخبار سے متعلق کسی بھی قانونی یا غیر قانونی کاروائی سے آپ مستثنیٰ قرار دیے جاسکیں، پنجاب میں اقامت پذیری کے فیصلے کے بعد آپ کے لیے ایسا ہی اقدام ناگزیر بھی تھا۔

مفتی صاحب مدظلہم کو مالیر کوٹلہ منتقل ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا، کہ یہ اخبار اطہر عثمانی صاحب کو بہ وجوہ بند کرنا پڑا۔ ممکن ہے اطہر صاحب کے ذہن میں وقتی طور پر اس کے بند کرنے کا پروگرام رہا ہو؛ مگر قضا و قدر کے تحت پھر اس کے ازسرِ نو شروع ہونے کی نوبت نہ آسکی۔

ماہنامہ مشرب دیوبند

عثمانی خانوادے کے ایک موفق بزرگ جناب مشہود اقبال عثمانی صاحبؒ تھے۔مدت العمر دینی تعلیمات کی نشر واشاعت میں مصروف کار رہے۔کتبِ دینیہ کی طباعت وکتابت سے انہیں بہ طورِ خاص لگاؤ رہا۔مکتبہ فیض القرآن دیوبند ان کے اسی ذوق وشوق کی یادگار ہے۔اس مکتبے کے ذریعے رب قدیر نے ان سے اپنے دین کی خدمت کا بڑا لائقِ رشک کام لیا۔جہاں اس مکتبے سے اعلیٰ معیار کی دینی کتب چھپتی تھیں، وہیں دوسری طرف مشہود عثمانی صاحبؒ نے مکتبے کی جانب سے اپنی زیرِ نگرانی ''مشرب'' کے نام سے ایک وقیع ماہنامے کو بھی جاری کیا ہوا تھا۔موصوف کی مستقل مزاجی اور ہر طرح کے حالات کا حکمت ودانائی کے ساتھ مقابلہ کرنے ایسی صفات کی بنا پر یہ ماہنامہ ایک طویل زمانے تک جاری رہا۔

مشہود صاحب نے اس کی ادارت کا کام مفتی ہلال عثمانی مد ظلہم کے سپرد فرما دیا تھا، جن کے قلم فیض رقم نے اوائل ہی میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور سید الطائفہ مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی ثم دہلویؒ جیسے اکابر سے سندِ اعزاز واعتماد حاصل کر لی تھی۔مفتی صاحب مد ظلہم کئی سال بہ حیثیت مدیرِ تحریر اس رسالے سے وابستہ رہے۔دینیات وعصریات پر آپ کے مضامین کو علمی حلقوں میں بہ صد شوق ورغبت پڑھا جاتا۔مولانا عثمان صاحب دیوبندیؒ شہر دیوبند کے ایک معروف عالِم دین گزرے ہیں۔مولانا موصوف کچھ عرصہ میونسپلٹی دیوبند کے چیئرمین بھی رہے۔ان کے سانحۂ رحلت کے موقع سے ان کی حیات وخدمات پر ادارہ فیض القرآن نے ایک ضخیم نمبر شائع کیا، جس میں مشاہیر اہلِ قلم کے مولانا مرحوم کی متنوع خدمات پر مشتمل مضامین شائع ہوئے۔

مفتی صاحب مد ظلہم کے مالیر کوٹلہ تشریف لانے سے چند ماہ یا سال پہلے ہی یہ ماہنامہ بند ہو گیا تھا۔

ماہنامہ تعمیرِ سیرت مالیر کوٹلہ

آپ نے اس شہر میں ''تعمیرِ سیرت'' کے نام سے ایک ادارہ قائم فرمایا تھا۔ یہ ادارہ یکے بعد دیگرے جامع مسجد اور مرحوم مستری عبدالرشید صاحب کے وسیع و عریض مکان میں کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد پھر مستقل طور پر اپنی موجودہ جگہ منتقل ہو گیا تھا۔ یہ جگہ شہر کی ایک معمر خاتون ''مرحومہ حنیفہ صاحبہ'' نے اپنے مرحوم شوہر کے ایصال ثواب کی غرض سے وقف کی تھی۔

اس ادارے کا باقاعدہ سنگِ بنیاد رکھے جانے کے موقع پر آپ کے مرشد و مربی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا تعلیم کے موضوع پر تاریخی خطاب ہوا- جو ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ ہے اور عنقریب شائع بھی ہوگا ان شاء اللہ- اور حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کے ہاتھوں اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

ادارے کے موجودہ مقام پر منتقل ہونے کے ساتھ ہی مفتی صاحب نے ادارے ہی کے نام پر ایک ماہنامہ ''تعمیرِ سیرت'' جاری فرمایا، جس کا بڑا ہدف یہ تھا کہ لوگوں کو دینی تعلیم کے حصول کی طرف راغب و آمادہ کیا جائے، چناں چہ زیادہ تر تعلیم کی اہمیت و افادیت پر ہی مفتی صاحب کے اور دیگر مشہور اکابر کے مضامین شائع ہوتے۔ اس مقصد میں ادارے کو بڑی کامیابی ملی۔ بالکل ابتدا ہی میں تین سو طلبہ داخلِ مدرسہ ہوئے، جن کا باضابطہ ایک مخصوص یونیفارم تھا، اعلیٰ درجے کی عمدہ کتب انھیں مہیا کرائی جاتی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے مدرسے کے طلبہ کا شہر میں جلوس نکالا، جس کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے اور بچوں کو دینی تعلیم دلانے سے متعلق باشندگانِ شہر میں مزید شوق و جذبہ پیدا ہوا اور اگلے سالوں میں طلبہ کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

ماہنامہ تعمیرِ سیرت کے اجراء کی دوسری غرض یہ تھی کہ ہر مہینے کے آمد و خرچ کی جملہ تفصیلات سے چندہ دہندگان کو آگاہ کیا جاتا رہے؛ تاکہ عوامی تعاون کا یہ سلسلہ

شرح وانبساط کے ساتھ جاری رہے اور کسی بھی طرح کی انگشت نمائی کا کسی کو موقع نہ مل سکے، دارالعلوم دیوبند کا بھی ابتدا میں یہی طریق کار رہا تھا۔ مدرسے کی خدمات پر مشتمل شہر کے معزز حضرات کے تاثرات اور مفتی صاحب کے قلم سے ادارے کا جامع تعارف بھی اس کا حصّہ بنتے تھے۔

شہر میں اس وقت کوئی اچھا کاتب تھا اور نہ ہی کوئی پریس تھا؛ اس لیے اس رسالے کی زیادہ تر کتابت آپ کو خود کرنی پڑتی تھی اور کچھ کام ایک معمولی قسم کے مقامی کاتب جناب سلیمان صاحب سے لیا جاتا اور شہر لدھیانہ کے چوڑا بازار میں ''رتن پریس'' نامی فقط ایک ہی لیتھو پریس تھا، وہاں سے اسے چھپوایا جاتا۔

تقریباً چار پانچ سال تک یہ رسالہ جاری رہا، پھر جب آپ نے اس ادارے سے مکمل طور پر علحدگی اختیار کر لی، تو یہ رسالہ بھی ماضی کا حصّہ بن گیا۔ رسالے کے اس دور کے فائل آپ کے پاس محفوظ ہیں۔

ماہنامہ دارالسلام مالیر کوٹلہ

اپریل ۱۹۸۸ عیسوی اس ماہنامے کا سن آغاز ہے- اور یہی راقم السطور کا سن پیدائش بھی ہے- یہ وہ ماہنامہ ہے، جو بائیس سال تک آپ کے علوم وافکار کا ترجمان بنا رہا۔ یہ رسالہ اپنا حلقۂ فکر پیدا کرنے میں مکمل طور پر کامیاب رہا تھا۔ آپ کے پاس ملک کے اطراف واکناف سے علما کرام اور دانشوران عظام کے برابر خطوط آتے رہتے تھے، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آپ کی ہر تحریر کو پوری دل چسپی وگہرائی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کا پورا پورا اثر بھی قبول کر رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنی آواز کو دوسروں تک پہنچانے اور اپنی فکر کو پھیلانے کے شوق و جذبے ہی نے آپ کو اس ماہنامے کے اجراء اور بعد کے سالوں میں پیش آمدہ

مصائب و مسائل کے سہنے کا عظیم حوصلہ بخشا، ورنہ پنجاب جیسے اس دور کے غیر علمی ماحول میں ایسے کسی کام کا تصور بھی ناممکن تھا۔

مفتی صاحب نے اس کی کتابت کی خاطر مولانا سلیم صاحب دیو بندی کو دیو بند سے مالیر کوٹلہ طلب فرمایا؛ چناں چہ مولانا موصوف نے بیس پچیس سال تک یہاں رہ کر علمی کاموں میں آپ کی قابلِ قدر معاونت کی۔ یہ رسالہ دہلی سے چھپتا تھا۔ اسے لکھنے، ترتیب دینے، چھپوانے کی غرض سے دہلی بھیجنے، بعد از طباعت وہاں سے لانے کا بندوبست کرنے، پانچ سات سو خریدار حضرات کے نام اور پتے درج کرنے اور ڈاک خانہ لے جانے کا کام آپ کو اکیلے ہی انجام دینا پڑتا تھا۔ بعدہ یہ تمام ذمہ داریاں آپ نے اپنے خدام کی جانب منتقل فرمادی تھیں، جسے انہوں نے بہ احسن وجوہ انجام دیا۔

آپ کی تنخواہ اس بار کو اٹھانے کی متحمل نہ تھی، جس کی بنا پر شروع سے آپ کو نوع بہ نوع کے امتحانات سے گزرنا پڑا۔ ہر مہینے اس کی اشاعت پر نقصان وخسارہ ہاتھ لگتا اور آپ اسے برابر برداشت فرماتے، لیکن جب وقف بورڈ نے پانچ ہزار کی گرانٹ بھی روک دی تو پھر آپ کو بہ درجۂ مجبوری اس رسالے کے بند کا تلخ فیصلہ لینا پڑا اور بہت سے حضرات کی جانب سے اس کی اشاعت کے تقاضوں کے باوجود آپ کو اپنے اسی فیصلے پر قائم رہنا پڑا۔ رسائل کی تاریخ میں شاید یہ ایک نادر ترین مثال ہے کہ آغاز ہی سے خسارے سے دوچار ہوجانے کے باوجود بائیس سال تک مسلسل چلتا رہا۔ بالیقین یہ صرف اور صرف مفتی صاحب کے خلوص اور ناموافق ونامساعد حالات میں بھی جہدِ مسلسل کو جاری رکھنے کی بہ دولت ممکن ہوسکا، جس کے لیے آپ بجا طور پر ملت اسلامیہ کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں۔

آپ تقریباً ہر سال کسی نہ کسی عنوان سے خاص نمبر بھی نکالتے رہے۔ جن میں سے مسلک دیوبند نمبر، عید نمبر اور حج نمبر بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور کے کئی

خاص نمبروں کو آپ نے کتابی شکل میں بھی شائع فرمادیا ہے۔فجزاہ اللہ عنا و عن جمیع المسلمین خیر الجزاء

دارالعلوم دیوبند کے دس بارہ سالہ دورِ تدریس کی تنخواہ کی واپسی ایک یادگاری اقدام

دارالعلوم دیوبند میں آپ نے تقریباً دس یا بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں اور اپنے والدین مرحومین کی مستجاب دعاؤں اور حضرات اساتذہ کی خصوصی توجہات کے طفیل آپ کا یہ تدریسی سفر بے حد کامیاب رہا۔علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی جیسے اساتذہ آپ کی کامیابی وترقی کے لیے تاحیات کوشاں رہے۔

علامہ ابراہیم بلیاویؒ،مولانا اعزاز علی امروہویؒ،مولانا فخرالحسن مرادآبادیؒ،حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، علامہ حسن بہاریؒ اور خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ ایسے یگانۂ روزگار افراد کی زیرِ نگرانی یہ تدریسی سفر ارتقا کی نت نئی منزلیں طے کر رہا تھا اور آپ کی تدریس کا شہرہ دارالعلوم کے حدود سے متجاوز ہوکر ملک کے طول وعرض میں سنائی دینے لگا تھا، کہ ۱۹۷۳ عیسوی میں آپ اپنے چچا سسر مولانا مفتی حمید حسن صاحب کے پیہم اصرار پر دارالعلوم سے عارضی رخصت پر مالیرکوٹلہ تشریف لے آئے۔آپ کے بعض اساتذہ مولانا فخرالحسن صاحبؒ وغیرہ نے آپ کو دارالعلوم واپسی کا اور تدریسی سلسلے سے وابستگی جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور خود آپ کی بھی اصل خواہش یہی رہی ،مگر مشیتِ ایزدی کے تحت چند در چند ایسے اتفاقات و واقعات پیش آئے کہ آپ کو مستقل یہیں رہ جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ،خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب قاسمی اور مولانا محمد نعیم

صاحب وغیرہ آپ کے اساتذہ رحمہم اللہ نے یہاں مالیرکوٹلہ آمد ورفت کے ذریعے اپنے اس مثالی شاگرد کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ برابر برقرار رکھا۔

مفتی ہلال عثمانی مدظلہم نے ۲؍جنوری ۱۹۷۳ عیسوی میں مفتیٔ پنجاب کا قلم دان سنبھالا اور ۳۱؍جولائی ۲۰۰۴ عیسوی میں آپ اس سرکاری منصب سے ریٹائرڈ ہوئے۔ بہ حیثیتِ مجموعی آپ کی کل مدت کار بتیس سال کے قریب ہے۔

دارالعلوم دیوبند، مظاہرالعلوم سہارنپور اور جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد وغیرہ ملک کے متعدد جامعات میں ایسے اساتذہ کی کافی تعداد ہر دور ہی میں رہی، جنھوں نے معاشی استحکام کے پیشِ نظر تدریسی خدمات حسبۃً للہ انجام دیں۔ آپ کو دارالعلوم سے اور اپنے اکابر واساتذۂ دارالعلوم سے ابتداء ہی سے عقیدت ومحبت کا تعلق رہا اور طبیعت چوں کہ من جانب اللہ قناعت پسند اور شانِ استغنا کی حامل پائی ہے؛ اس لیے زمانہ تنگ دستی کے قدرے خوشحالی سے تبدیل ہوتے ہی آپ کو یہ خواہش دامن گیر ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے بارہ سالہ دورِ تدریس کی تنخواہ واپس دارالعلوم میں جمع کر دی جائے۔ سن ۲۰۰۴ عیسوی میں جب آپ مفتیٔ اعظم پنجاب کے سرکاری منصب سے ریٹائرڈ ہوئے اور حکومت کی طرف سے ہر مہینے تنخواہ سے وضع کی جانی والی رقم آپ کو یک مشت حاصل ہوئی، تو آپ نے منتظمینِ دارالعلوم دیوبند کو اپنے ارادے سے آگاہ فرمایا۔ تقسیمِ دارالعلوم کے قضیۂ نامرضیہ کے موقع پر کئی اہم ریکارڈ اور دستاویز ضائع ہوگئے تھے، ان ضائع شدہ چیزوں میں بعض قدیم اساتذہ کے تنخواہ وصولی کے رجسٹر بھی شامل ہیں؛ اس لیے دارالعلوم دیوبند کی جانب سے اس دور کی عام تنخواہوں کو سامنے رکھ کر محض ظن وتخمین کے سہارے ایک مخصوص رقم ادا کرنے کی بات کہی گئی اور آپ نے اس اندازے سے بھی کچھ زیادہ ہی رقم دارالعلوم میں داخل فرمادی۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کے اس تنخواہ واپسی کے فیصلے پر بے حد خوشی ومسرت کا اظہار فرمایا تھا اور دارالعلوم دیوبند کی جانب سے آپ کی خدمت میں باضابطہ شکریہ کا خط بھی ارسال فرمایا تھا۔

ادارے اور تنظیمیں، جن کو آپ کی سربراہی یا رکنیت کا شرف حاصل ہوا

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال صاحب کی تعلیم و تربیت میں اپنے عہد کی عبقری شخصیات نے حصّہ لیا، تعلیمی استحکام شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، امام المعقولات والمنقولات حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ ایسے اساتذہ کا مرہونِ منت ہے، منازلِ سلوک حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی کے زیرِ نگرانی طے کرنے کا شرف حاصل ہوا، جبکہ قومی وملی قیادت کا کامیاب ہنر اور انتظام و انصرام کی صلاحیتیں آپ کو اپنے عم والا قدر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی بافیض صحبت سے عطا ہوئیں۔

اللہ جزائے خیر دے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ وغیرہ اس دور کے جملہ مرحوم اکابر رحمہم اللہ کو، جنھوں نے مفتی صاحب کی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی غرض سے آپ کی دارالعلوم دیوبند اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سمیت ملک کی متعدد تنظیموں سے وابستگی کی راہیں ہموار فرمائیں اور اس طرح امت مسلمہ کو آپ کی ذات سے بیش بہا دینی وقومی فوائد حاصل ہوئے۔ مذکور الصدر عنوان کے تحت آپ کی ایسی ہی خدماتِ جلیلہ کا ذکرِ خیر مقصود ہے، جو متعدد ملی تنظیموں سے وابستگی کے بہانے من جانب اللہ آپ سے لی گئیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

دسمبر ۱۹۷۳ عیسوی میں عروس البلاد ممبئی میں باضابطہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل عمل میں آئی۔ ملک کی تاریخ میں اس لحاظ

سے اس جماعت کو خاص امتیاز حاصل ہے کہ اسے اپنے سن تاسیس سے لے کر اب تک مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندہ حضرات کے وفاق پر مشتمل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اس تاریخی جماعت کو تیار کرنے اور اس کو مضبوط و مستحکم بنانے کے پیچھے امیرِ شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی قابلِ قدر کاوشیں کارفرما تھیں۔حکیم الاسلامؒ نے اس موقع پر بڑا اہم، جوشیلا اور بصیرت افروز خطاب فرمایا تھا،جس کا حکومتی سطح پر بھی پورا پورا اثر محسوس کیا گیا۔بہ اتفاق آراء حضرت حکیم الاسلامؒ اس کے پہلے صدر اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے۔حکیم الاسلام کے سانحۂ ارتحال کے بعد کرسئ صدارت پر مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جیسی جہاں دیدہ شخصیت متمکن ہوئی۔سن ۱۹۹۹ء عیسوی میں مفکر اسلام کی وفات کا جانکاہ حادثہ پیش آیا،تو تیسرے صدر کے طور پر مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کا انتخاب عمل میں آیا۔مولانا موصوفؒ بڑے کام کے انسان تھے، ان کی ملی و فقہی خدمات کا ایک زمانہ قائل ہے۔مولانا موصوف عہدۂ صدارت سنبھالنے کے چند ہی سال بعد راہیٔ آخرت ہو گئے اور یوں بورڈ ایک عظیم و مخلص خادمِ قوم و ملت شخص کی خدمات سے محروم ہو گیا۔

سن ۲۰۰۲ عیسوی میں بہ مقام حیدر آباد چوتھے صدر کے لیے قرعۂ فال مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے علمی و روحانی جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہم کے نام نکلا، چناں چہ پچھلے سولہ سترہ سال سے آپ ہی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم کے بلیغ الفاظ میں ''اپنے نام کی مناسبت سے بورڈ کے صدرِ رابع ہیں'' اور الحمدللہ آپ کی زیرِ صدارت بورڈ نے کئی عظیم اور مثالی کامیابیاں اپنے نام کی ہیں۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب دارالعلوم سے فراغت کے بعد ایک

مختصر سے عرصے کے لیے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے منسلک رہے تھے۔بعدہ آپ کو شعبۂ تدریس میں منتقل کردیا گیا تھا۔دارالافتاء میں آپ کے دادا مرحوم جیدِ وقت مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ کے فتاوی پر کام کا آغاز ہو چکا تھا، چناں چہ آپ نے ابتداء کی چند جلدوں کے فتاوی کی ترتیب وکتابت کا کام کیا، پھر یہ عظیم علمی و دینی خدمت مستقل طور پر مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کے سپرد کردی گئی تھی، جسے انہوں نے بہ خوبی انجام دیا اور آخر کی چند جلدوں (جنہیں وہ ضعف وعوارض کی بناء پر مکمل نہیں فرماسکے اور پھر جن کی ترتیب کا شرف حضرت الاستاذ مفتی محمد امین صاحب پالنپوری مدظلہم کو حاصل ہوا) کو چھوڑ کر باقی جملہ جلدیں انہیں کی شبانہ روز جہدِ مسلسل کی یہ دولت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ مدت العمر مفتی ہلال صاحب کے علمی کاموں کے قدرداں اور ان کے مشفق رہے اور انہوں نے ہی آپ کی علمی و انتظامی بھرپور صلاحیتوں کے پیش نظر، مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی تھی کہ پنجاب سے مفتی ہلال صاحب کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا رکن نامزد کیا جائے، یہ ان کے خلوص اور دلی محبت کی بات تھی کہ انہوں نے آپ کے کسی ایما وخواہش کے بغیر بورڈ کے اعلی ذمہ داران سے ان کی رکنیت کی سفارش ودرخواست کی۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ بھی مفتی ہلال صاحب سے اچھی طرح واقف تھے، دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ تدریس میں ملاقات کے کئی مواقع فراہم ہوئے تھے اور جماعتِ اسلامی کے طریقِ رداوراس کے علاوہ مختلف دینی وعصری مسائل کے حوالے سے ہونے والی گفتگو سے مولانا اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ہلال صاحب غیر معمولی شخصیت کے حامل انسان ہیں۔اللہ رب العزت نے مولانا رحمانی کو وہ نورِ بصیرت عطا

فرمایا تھا کہ ایک ہی مجلس میں اور ایک ہی نگاہ میں اپنے مخاطب میں مستور صلاحیتوں اور اس کی ذہنی وفکری پرواز کا ادراک فرمالیا کرتے تھے۔انہوں نے اس درخواست کو فوراً منظوری دیتے ہوئے آپ کو بورڈ کا رکن نامزد فرمادیا اور بہ ذریعۂ خط آپ کو بورڈ کے اس اہم فیصلے سے آگاہ بھی فرمادیا۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ (جو مردم سازی و مردم شناسی میں اپنی مثال آپ تھے اور کس شخص سے کیا اور کس طرح کام لیا جائے؟ اس کا ملکہ بھی خوب رکھتے تھے) کا معمول تھا کہ وہ جس شخص کو بورڈ کے حق میں مفید ونافع خیال فرماتے تھے، اولاً ہر ایسے شخص کو بورڈ کے جلسوں میں مہمانِ خصوصی اور مدعوئے خصوصی کی حیثیت سے بلایا کرتے تھے اور جب دیکھتے تھے کہ آنے والا بورڈ کے مقاصد وافکار سے کافی حد تک ہم آہنگ ہے اور بورڈ کے مزاج وروح کو سامنے رکھ کر اس کی صحیح طور پر ترجمانی بھی کر رہا ہے، تو پھر اسے باضابطہ بورڈ کا رکن نامزد فرمالیتے، کچھ عرصہ بعد عاملہ میں لے لیتے تھے اور پھر آخر میں اسے رکنِ تاسیسی بنالیتے تھے۔

اس طرح مرحلہ وار آپؒ اسے ترقی دیا کرتے تھے، بسا اوقات یہ مراحل طے کرنے کے لیے متعلقہ شخص کو کئی کئی سال لگ جاتے؛ تاہم جنہیں مولانا کا پہلے سے ہی اعتبار واعتماد حاصل ہو جاتا تھا، انہیں وہ جلدی جلدی ان جملہ مراحل سے گزار دیا کرتے تھے۔مفتی ہلال صاحب بھی چوں کہ انہیں مؤخر الذکر شخصیات میں شامل وداخل تھے؛ اس لیے مختصر سے عرصے ہی میں آپ کو رکنِ تاسیسی منتخب کرلیا گیا۔

بورڈ کی میٹنگیں اور اس کے اہم اجلاس دہلی، لکھنؤ، پٹنہ اور ملک کے دیگر بڑے شہروں میں منعقد ہوتے تھے۔خاص بات یہ کہ اراکینِ بورڈ کو آمد ورفت کا مکمل خرچ اپنی جیبِ خاص سے ادا کرنا ہوتا تھا۔صرف قیام وطعام بورڈ کے ذمہ ہوتا تھا۔

دیگر مؤقر اراکین کی طرح آپ ذاتی خرچ پر طول طویل سفر کرتے تھے۔ سالانہ عوامی اجلاس البتہ مستثنیٰ ضرور تھے، جن میں اراکین کے قیام وطعام اور ان کی آمد و رفت کا خرچ اجلاس کے منتظم حضرات ادا کیا کرتے تھے۔ اجلاس کے یہ منتظم حضرات زیادہ تر وہ ہوتے تھے، جو بورڈ کے کسی اہم منصب پر فائز نہ ہونے کے باوجود سارا خرچ اپنی طرف سے ادا کرنے کی پیش کش کیا کرتے اور بورڈ ان کی مخلصانہ پیش کش کو قبول کرتے ہوئے، ملک کے کسی بھی شہر میں سالانہ یا کوئی اور اہم اجلاس مقرر کر دیا کرتا تھا۔ یہ روایت بڑی حد تک ابھی بھی برقرار ہے۔

مفتی صاحب سن ۱۹۸۴یا ۱۹۸۵عیسوی میں بورڈ کے رکن منتخب ہوئے، جبکہ بورڈ کے عہدۂ صدارت پر مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کی شخصیت جلوہ جہاں آرا تھی۔ مفکرِ اسلامؒ کے دورِ صدارت ہی میں احمد خان بہ نام شاہ بانو کا وہ معروف واقعہ پیش آیا تھا، جس نے اسلامیانِ ہند کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ملک کی عدالتِ عظمی سپریم کورٹ نے بعض آیات قرآنیہ کی غلط توضیح کے سہارے اس قضیہ میں یہ غیر شرعی فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ مطلقہ کا نان ونفقہ تاحیات اس کے سابق شوہر کے ذمہ رہے گا؛ جبکہ شرعاً یہ نان ونفقہ عدت تک محدود ہے۔ بدقسمتی سے کچھ جاہل اور تعلیمات اسلام سے یکسر ناآشنا مسلمان بھی سپریم کورٹ کے فیصلے کے حامی تھے اور عدالتِ عظمی سے اس فیصلے کے صادر ہونے کے موقع پر ان کی جانب سے جشن بھی منائے گئے۔

اس فیصلے کے خلاف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ملکی سطح پر احتجاج کا پروگرام بنایا، مولانا علی میاں ندویؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ، مولانا عبدالکریم صاحب، مفتی ہلال صاحب مدظلہم اور متعدد اکابر علما نے ملک بھر کے طوفانی دورے کیے اور بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کرکے معاملے کی نزاکت و اصلیت سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ دستخطی مہم بھی خوب کام یاب رہی تھی۔ میر واعظ

مولانا فاروق صاحب کشمیری مرحوم کی دعوت پر مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا قاضی مجاہدالاسلام وغیرہ اراکینِ بورڈ پر مشتمل ایک وفد جموو کشمیر کے دورے پر گیا تھا۔ بہ وقتِ واپسی مالیر کوٹلہ پنجاب کے کلب ہال میں مفتی ہلال صاحب کی زیرِ نگرانی ایک عظیم اجلاس ہوا، جس میں مولانا منت اللہ صاحب اور دیگر اکابر کے خطاب ہوئے۔ ان پروگراموں کے ذریعہ حکومت کے سامنے یہ مطالبہ بڑے شدومد کے ساتھ رکھا گیا کہ حکومت پارلیمنٹ میں نئے بل کے ذریعے اس قانون کو منسوخ و کالعدم قرار دے، جو مذہبِ اسلام کے مخالف اور اس کی تعلیمات کے سراسر متصادم ہے۔ راجیو گاندھی اس وقت ملک کے وزیر اعظم تھے۔ مولانا علی میاں ندویؒ اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی ان سے خصوصی ملاقاتیں رہیں، ایسی ہی کسی ملاقات کے موقع پر مولانا علی میاںؒ نے راجیو گاندھی سے فرمایا تھا کہ ''راجیو جی جس طرح رسم الخط کا ایک شارٹ ہینڈ ہوتا ہے، سیاست پالیکس کا بھی ایک شارٹ ہینڈ یا شارٹ کٹ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن کا مسئلہ ہے، اس کو ان کے مخلص و مستند لوگوں سے سمجھ لیا جائے، قبل اس کے کہ وہ سیاسی پالیٹیشیز کے ہاتھوں جانے پائے اور وہ اپنے سیاسی مقاصد اور مفادات کے لیے اس کو طوالت دیں، اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے''۔

غرض مولانا کی اس فہمائش اور دیگر اکابر سے ہونے والی گفتگو سے راجیو گاندھی سمجھ گئے کہ قانونِ شریعت ہی مطلقہ کے حق میں زیادہ نفع بخش اور بہتر ہے، جبکہ عدالتِ عظمیٰ کے قانون کی حیثیت مطلقہ کو محض عارضی اور قلیل الوقتی نفع رسانی کی ہے؛ کیوں کہ اس قانون کی رو سے یہ مطلقہ اپنے سابق شوہر سے اسی وقت تک نان ونفقہ وصول کرنے کی مستحق گردانی گئی ہے، جب تک کہ وہ صحت مند وخوش حال رہے اور دوسرے یہ کہ وہ زندہ ہو۔ ظاہر ہے کہ خوش حالی اور زندگی؛ یہ دونوں ہی بے بھروسہ اور ناپائدار چیزیں ہیں۔ کتنے ایسے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں کہ شوہر کے حادثۂ رحلت کے برسہا برس بعد

تک اس کی بیوہ بہ قیدِ حیات رہتی ہے۔ایسے میں عدالتِ عظمیٰ کا یہ قانون اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینے کے مترادف ہے۔دوسری طرف قانونِ شریعت ایسی بیوہ کا تا حیات خرچ اس کے خونی رشتہ داروں کے ذمے عائد کرتا ہے اور اگر ایسا کوئی ایک بھی خونی رشتہ دار زندہ سلامت نہ ہو،تو پھر ایسی صورت میں مولانا علی میاں ندویؒ کے الفاظ میں یہ ذمہ داری صوبوں کے مسلم وقف بورڈ پر ڈالی جاسکتی ہے۔راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کی ایک میٹنگ سے دورانِ خطاب اس بل کی حمایت و وکالت کرتے ہوئے اس طرح کے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔بعض قانونی رکاوٹوں کے سبب عدالتِ عظمیٰ کے قانون کو بالکلیہ ختم کر دینا ان کے بس میں نہ تھا؛تاہم ہندی میڈیا اور اپوزیشن کے ممبرانِ پارلیمنٹ کی شدید مخالفت کے باوجود انھوں نے بھاری اکثرت کے ساتھ پارلیمنٹ سے عدالتِ عظمیٰ کے اس غیر شرعی قانون کے متوازی ایکٹ سن ۱۹۸۶ کے نام سے ایک جدید قانون پاس کرا دیا،جس کی رو سے مسلمان کو قانونِ شرع کے مطابق اس معاملے کے حل کی اجازت دی گئی اور سپریم کورٹ کے قانون (جو دفعہ ۱۲۵ سے متعارف ہے اور جو پہلے سے غیر اقوام میں نافذ العمل تھا اور ہے) کو ایک مؤثر ترمیم کے ذریعے بڑی حد تک ناکارہ بنا دیا گیا۔اس اضافہ شدہ ترمیم سے متعلق مفکر اسلامؒ رقم طراز ہیں:

”ترمیم میں یہ کہا گیا کہ صرف مطلقہ کا درخواست دینا اور دفعہ ۱۲۵ کے ذریعے فیصلہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرنا قطعاً کافی نہ ہوگا؛ بلکہ مطلقہ اور اس کے سابق شوہر: دونوں کی رضامندی ضروری ہوگی اور دونوں کی مشترکہ درخواست کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا،جس کی توثیق حلف نامے کے ذریعے کی گئی ہو اور اگر تنہا مطلقہ نے درخواست کی،تو پھر اس کا فیصلہ جدید بل کے مطابق ہی ہوگا،دفعہ ۱۲۵ ر کے تحت نہیں۔دوسری شرط یہ لگائی گئی کہ یہ درخواست اور رضامندی مقدمے کی سماعت سے پہلے ہی دن ہونی چاہیے،ورنہ قابلِ قبول نہ ہوگی“۔

اس جدید بل کی ڈرافٹنگ کا کام شہاب الدین صاحب نے انجام دیا تھا اور مفتی ہلال صاحب اور دوسرے معزز اراکین کے ملاحظے و اطمینان کے بعد وزارتِ قانون کے یہاں گیا۔ وزارتِ قانون کے لوگوں نے اس بل ایکٹ ۱۹۸۶ میں چند لفظی تغیرات کرنے کے بعد اسے پی ایم او کے سپرد کیا اور یہی قانون پاس کرنے کے لیے تجویز ہوا۔ مفتی صاحب مد ظلہم جیسے دور بیں حضرات نے اسی وقت اس خطرے کو بھانپ لیا تھا کہ وزارتِ قانون کی جانب سے جن الفاظ میں تغیر و تبدل کیا گیا ہے، وہ اس بل کو بے جان کرنے کی کوششوں کا ایک حصّہ ہے، چناں چہ راجیو جی سے اس کے بارے میں بات چیت کی گئی، تو بہ قول مفتی صاحب انہوں نے یہ جواب دیا کہ ابھی تو آپ موجودہ شکل ہی میں اسے پارلیمنٹ سے پاس ہو جانے دیجیے، بعد میں آپ کی منشاءَ و مرضی کے مطابق اس میں حذف و اضافہ بھی کر لیا جائے گا۔ اس وقت کی مخصوص فضا میں راجیو جی کے حکم کی تعمیل کے بغیر کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ گیا تھا، جس کا اشارہ قدیم مسلم جج صاحبان نے بھی دے دیا تھا؛ اس لیے اس پر بورڈ کی جانب سے رضامندی ظاہر کر دی گئی اور یہ بل پاس بھی ہو گیا۔

مفتی صاحب اس طرح آدھے ادھورے طریقے پر پارلیمنٹ سے کسی بھی قانونِ شریعت کے پاس کرانے کے مخالف تھے۔ آپ کا خیال یہ بھی تھا کہ حضرت والا تھانوی نور اللہ مرقدہ کے زیر نگرانی اس عہد کی حکومت سے پارلیمنٹ کی سطح پر ایکٹ ۱۹۳۳ کے نام سے جو قانون پاس ہوا تھا، موجودہ حکومت کے سامنے یہ مطالبہ رکھا جائے کہ وہ اسے از سر نو بحال کرے۔ یہ قانون چوں کہ پارلیمنٹ سے پاس ہوا تھا، اس لیے اس کے رد کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے اور پالیمنٹ نے، جسے اس کے رد کا اختیار حاصل ہے، تاریخی شواہد کے مطابق اسے اب تک رد ہرگز نہیں کیا ہے، ہاں البتہ اسے ٹھنڈے بستے میں ضرور ڈالے رکھا۔ اس بل میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور ان میں کسی بھی طرح کی عدمِ مداخلت کا مکمل طور پر عہد کیا گیا تھا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس بل کے پاس ہونے کے موقع پر ایک اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ اجلاس سے قبل اسی کی تیاریوں سے متعلق ''بچوں کا گھر'' دریا گنج پرانی دہلی میں ایک میٹنگ ہوئی، جس میں مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور افضل حسین صاحب سکریٹری جماعتِ اسلامی بھی تشریف رکھتے تھے۔ اس میٹنگ میں مفتی ہلال صاحب نے اپنے دل کی یہ بات صاف صاف عرض کی کہ یہ کوئی کامیابی نہیں ہے۔ آج یہ طے کیجیے کہ آئندہ بھی ہم اسی طرح آدھے ادھورے طریقے سے اپنے قوانینِ شریعت پارلیمنٹ سے پاس کراکے اسی پر قانع و مطمئن ہو جائیں گے؟ یا یہ کہ آگے ہم اس سمت میں کوئی مضبوط لائحہ عمل طے کریں گے؟ یہ کافی سخت بات تھی، جو بعض طبائع پر بڑی گراں بھی گزری تھی اور جس کا بروقت اظہار بھی ہوا تھا، مگر مولانا منت اللہ رحمانیؒ جو اپنے چھوٹوں کی آراء کو بڑی اہمیت دیا کرتے تھے، فرمانے لگے مفتی ہلال صاحب نے پتے کی بات فرمائی ہے، ان کی بات میں وزن ہے اور یہ کہ واقعی ہمیں اس لمحۂ فکریہ کے حل کی طرف سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے اور اس کا کوئی معقول حل نکالنا چاہیے۔ افضل حسین صاحب نے بھی مفتی صاحب کے خیال کی تائید کی۔

بعد کے حالات نے مفتی ہلال صاحب کے خیال کو سچ ثابت کیا۔ اس جدید بل میں مسلمانوں کے حسبِ منشأ مزید ترمیمات کا حکومتی وعدہ صرف وعدے ہی کی حد تک محدود رہا۔ ۱۹۸۶ء/ ایکٹ جدید بل عملاً تعطل کا شکار رہا۔

اس مطلقہ ایکٹ ۱۹۸۶ کے شرائط کو پورا کرنے کی طرف کوئی خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی۔ عدالتوں نے بھی اس کے مطابق فیصلے نہیں کیے۔ افسوسناک پہلو یہ بھی رہا کہ خود مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے طلاق سے متعلق مسائل کے حل کے سلسلے میں بجائے اسلامی دارالقضاء کی طرف مراجعت کے اسی پرانی دفعہ، دفعہ ۱۲۵ کے تحت اپنے

مقدمات دائر کیے اور اس طرح اپنے محسن علماء کی عظیم محنت سے فائدہ نہ اٹھا سکے، جنھوں نے بڑی تگ ودو کے بعد یہ جدید بل پارلیمنٹ سے پاس کرایا تھا۔

پرسنل لاء کے حوالے سے حکومت اور عدالتوں کا رویہ ابتدا ہی سے زیادہ تر مشکوک رہا اور ان دونوں نے کئی مواقع پر مسلم پرسنل لاء میں ناجائز مداخلت کا ارتکاب کیا۔ حکومتی سطح کے غیر شرعی قوانین کے خلاف ملک گیر احتجاجات کی سنگینی اور مستقبل پر ان کے اثرات کا حکومت کو اچھی طرح علم تھا اور دوسرے اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ طلاق پر پارلیمنٹ کے اس جدید بل سے ملک کی غیر مسلم برادری بالکل ناخوش ہے؛ اس لیے حکومت نے اس موڑ پر دو کام کیے اور دونوں کا شدید نقصان راست طور پر ملت اسلامیہ ہندیہ کو پہنچا۔ پہلا کام حکومت نے یہ کیا کہ اس نے ان احتجاجات سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی کہ پارلیمنٹ سے اس طرح قوانین پاس کرنے کے بجائے عدالتوں کے فیصلوں کے ذریعہ مسلم پرسنل لاء کو مجروح کرنا شروع کر دیا، گویا مشن باقی رہا، صرف طریقِ کار بدلا گیا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بھی جوابی کاروائی کے طور پر عدالتوں میں داخل ان مقدمات کو لڑا اور اس کے لیے بورڈ کو ایک بڑی رقم عدالتوں کی نذر کرنی پڑی۔ مفتی صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ ہمیں حکومت کے اس طرزِ عمل کا کوئی اور توڑ نکالنا چاہیے، عدالتوں میں مقدمات کا داخلہ اور ان میں جزوی کامیابی بورڈ کے حق میں مفید نہیں؛ بلکہ نقصان دہ ہے؛ کیونکہ اس طرح حکومت کو اپنے مشن کی تکمیل کا آسان راستہ فراہم ہوتا ہے اور عدالتیں بھی زیادہ تر حکومت ہی کی طرف داری میں پیش پیش رہتی ہیں، پھر اس کام کا کوئی منتہی بھی نہیں۔ کسی ایک مقدمے میں کامیابی ملتی ہے، تو دو تین اور نئے مقدمات اسلام دشمن افراد یا تنظیموں کی جانب سے عدالت میں داخل کر دیے جاتے ہیں اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بے کس اور مجبور و مقہور مسلم مطلقہ کو تعاون کی مکمل یقین دہانی کے بعد بہ حیثیتِ مدعی عدالت میں لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

دوسرا کام حکومت نے غیر مسلم برادری کو خوش کرنے اور اپنا سیاسی توازن برقرار رکھنے کی غرض سے یہ کیا کہ بابری مسجد (جس کا مسئلہ ان دنوں موضوعِ بحث بنا ہوا تھا) کا شیلا نیاس کرایا، جس کا نتیجہ مسلمانوں کے جان و مال کے ضیاع کی شکل میں سامنے آیا تھا۔

اس موقع پر بابری مسجد کی بازیابی اور اس تنازعے کے پرامن حل کے لیے ملک بھر کے نمائندہ افراد پر مشتمل ایک ایکشن کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا، جس نے جمہوری طریقے پر اپنی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا اور بابری مسجد کے سلسلے میں ملک کی عدالتِ عظمیٰ میں مقدمہ بھی دائر کیا گیا۔

بعض لوگ شروع ہی سے چاہتے تھے کہ بورڈ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے۔ دوسری طرف مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مفتی ہلال صاحب مدظلہم کی رائے جو بالکل حق بہ جانب تھی، یہ تھی کہ بورڈ کو اس کے اصل مقصدِ تاسیس مسلمانوں کے طلاق نکاح اور وراثت وغیرہ عائلی مسائل تک ہی محدود رکھا جائے۔ جہاں تک بابری مسجد تصفیے کا تعلق ہے، تو اس کے لیے ایکشن کمیٹی پہلے سے بنی ہوئی ہے۔ ہم خدامِ بورڈ اپنے اپنے طور پر اس کی مضبوطی کے لیے کوششیں جاری رکھیں گے اور عامۃ المسلمین کو بھی اس کمیٹی کا ہر طرح ساتھ دینے کی طرف راغب و آمادہ کریں گے۔ یہ ایک بہت ہی موزوں اور مناسب رائے تھی، جس کا مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے بارہا مختلف مجالس میں اظہار بھی فرمایا؛ مگر ان بزرگوں کی اس وقیع رائے اور اس پر ان کے شدید اصرار کے علی الرغم بورڈ کو بہ وجوہ یہ مقدمہ اپنے ہاتھوں لینا پڑا۔

بورڈ نے اصلاحِ معاشرہ کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا، جس سے ملت اسلامیہ ہندیہ کو بیش بہا دینی فوائد حاصل ہوئے۔ بورڈ کی کوشش تھی کہ ملک کے ہر صوبے کے لوگوں کو اس شعبے سے استفادے کے بھرپور مواقع حاصل ہوں۔ اس کے لیے بورڈ

نے ملک میں بولی جانے والی تقریباً تمام زبانوں کے ماہرین کا تعاون حاصل کیا اور کئی صوبائی وضلعی مسلم تحریکوں کو بھی اس کام پر کھڑا کیا اور ذرائعِ ابلاغ کے توسط سے ملک کی تمام موٴقر تنظیموں کے نام بورڈ کے صدرِ محترم کا یہ پیام جاری کیا کہ وہ بھی اس مہم میں بورڈ کا بھرپور ساتھ دیں؛ تاکہ اس کا دائرۂ افادیت مزید وسیع ہو اور متوقع نتائج حاصل ہوں۔ مفتی ہلال صاحب اور بورڈ کے مختلف اراکین کی کتابوں کے ملک کی مختلف زبانوں میں کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ مفتی صاحب مدظلہم کی چار کتابیں جو مسلم پرسنل لاء سے متعلق ہیں، انہیں ملک کی تیرہ چودہ زبانوں میں اور چار چار پانچ پانچ لاکھ کی تعداد میں شائع کیا گیا۔ آپ کے مختلف چھوٹے موٹے پمفلٹ جو اس شعبے کے تحت طبع کیے گئے، ان کی تعداد اس پر مستزاد ہے۔

صدورِ بورڈ کے ساتھ آپ کے ذاتی روابط

آپ نے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب اور اب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم، تینوں ہی بزرگوں کو بہت قریب سے دیکھا اور تینوں ہی صدورِ بورڈ کے ساتھ آپ کے بڑے خوش گوار و مستحکم تعلقات رہے۔ غالباً اسی باہمی اعتماد و بے تکلفی کا اثر تھا کہ آپ نے ہمیشہ اپنی بات کو بڑی قوت کے ساتھ بورڈ کی میٹنگوں میں رکھا اور آپ چوں کہ منفی طرزِ عمل اور جذباتی و سطحی فکر ونظر سے مجتنب رہے؛ اس لیے اس وقت کے جملہ اراکینِ بورڈ، جو عمر اور تجربے بہر دو لحاظ سے آپ کے اکابر تھے، آپ کی ہر بات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ تو یوں بھی آپ کے رفیق تھے، زمانۂ طالب علمی میں دونوں بزرگوں نے محض ایک سال کے فرق سے دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی تھی۔ مفتی صاحب مدظلہم نے اپنی کتاب

''میرے قابلِ احترام اساتذۂ کرام'' میں دورۂ حدیث کے سال کے ذکر کے ضمن میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ انہیں اس سال قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ کی لکھی ہوئی وہ کاپی ملی تھی، جو حضرت شیخ الاسلام کے درسِ بخاری میں انہوں نے قلم بند کی تھی اور اس طرح انہیں حضرت شیخ الاسلامؒ کے درسی افادات سے فائدہ اٹھانے اور آپؒ کے علوم و افکار سے کماحقہ مستفید ہونے کے خوب خوب مواقع ہاتھ لگے۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے ان دونوں بزرگوں کے مابین برادرانہ مراسم قائم ہو گئے تھے، پھر عملی میدان میں یہ ہوا کہ قاضی صاحبؒ نے فراغت کے چند ہی سال بعد ملک کی متعدد تنظیموں سے اپنے آپ کو وابستہ فرما لیا تھا اور فقہ اکیڈمی کے تو باقاعدہ بانی ہی آپ ہی تھے۔ دوسری طرف مفتی صاحب فراغت کے معاً بعد حکیم الاسلامؒ کے حکم وایما پر دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت پر مأمور ہوئے اور اس انہماک اور کامل یکسوئی کے ساتھ یہ سفر جاری رہا کہ کسی بھی قومی و ملی تنظیم سے وابستگی کا آپ کو خیال تک نہ گزرا، گو کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ جیسے اربابِ علم و فضل کی خدمت و صحبت کے نتیجے میں تنظیم و قیادت کی جملہ صلاحیتیں آپ میں ابتداء ہی سے موجود تھیں؛ تاہم ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانا اور اس طرح ان کا امت مسلمہ کے حق میں بارآور و نتیجہ خیز ثابت ہونا یہ بہر حال ایک جداگانہ اور حد درجہ اہمیت کا حامل امر ہے، جس سے گزرنے کا آپ کو اب تک اتفاق حاصل نا ہو سکا تھا۔ سن ۱۹۷۳ عیسوی میں جب آپ مفتیٔ اعظم پنجاب کی حیثیت سے مالیر کوٹلہ تشریف لے آئے، تو اب وقت آچکا تھا کہ آپ کی ان قائدانہ صلاحیتوں سے امت بہرہ یاب ہو اور پھر بحمداللہ آپ کا ملک کی متعدد تنظیموں سے انسلاک عمل میں لایا گیا اور اس طرح زمانۂ طالب علمی کے ان دونوں رفیقوں کو پھر سے بار بار کی یکجائی کے مواقع بھی نصیب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، فقہ اکیڈمی اور ملی کونسل وغیرہ تنظیموں کے پلیٹ فارم سے دونوں کے قائدانہ جوہر کھل کر سامنے

آئے اور آپسی تعلق میں مزید گہرائی وگیرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ بے تکلفی کے سبب دونوں بعض مواقع پر ایک دوسرے کے خیال وفکر پر کھل کر رائے زنی فرماتے اور دلائل وشواہد کی روشنی میں جو بات زیادہ باوزن ثابت ہوتی، اس کو ترجیح دی جاتی۔

ایک دفعہ حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کو اپنے عہدِ صدارت میں ایک نیا کام یہ سوجھا کہ مجلسِ نکاح ہی میں ایک ایسا تحریری نکاح نامہ جاری کر دیا جائے، جس میں بعض شرائط وقیود کے ساتھ مجبوری کے وقت عورت کو طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کا حق دیا جائے۔ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال صاحب نے یہ کہہ کر اختلافِ رائے فرمایا کہ ایسا کرنا بڑا ہی گراں اور مشکل ثابت ہوگا کہ عین مجلسِ نکاح میں انعقادِ نکاح کے یادگار وخوش کن موقع پر طلاق کا بھی ذکر ہو؛ اس لیے مناسب یہ ہے کہ ایسے صریح الفاظ کا ذکر نہ ہو اور یہی کام کچھ ایسے الفاظ ادا کر کے لیا جائے کہ ”عورت کو مخصوص حالات میں فلاں فلاں افراد یا تنظیموں سے اپنا مسئلہ حل کرانے کا کامل حق واختیار حاصل ہوگا“۔ پھر آپ نے انڈونیشیا میں رائج اسی طرح کے طریقِ کار سے اپنی بات کو مدلل فرمایا۔ فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم نے اسی رائے کی تائید فرمائی اور پھر قاضی صاحبؒ نے بھی اسی رائے کو باوزن سمجھتے ہوئے اسی کے مطابق فیصلہ جاری فرمایا، چناں چہ بورڈ نے انڈونیشیا وغیرہ ممالک کے نظائر کو سامنے رکھ کر ایک ایسا جدید نکاح نامہ جاری فرمایا، جو اس ملک کی مخصوص فضا میں کارگر ثابت نہ ہو سکا۔

مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے آپ کے تعلقات اسی وقت قائم ہو گئے تھے، جب آپ دارالعلوم دیوبند میں زیرِ تعلیم تھے اور مولانا علی میاںؒ دارالعلوم کی شوریٰ کا رکن ہونے کے ناتے گاہ بہ گاہ دارالعلوم دیوبند تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ تعلق جو تعلیمی دور میں قائم ہوا، مفکرِ اسلام کی وفات تک باقی رہا اور علمی وعملی بہر دو میدانوں میں حضرت مفتی صاحب مدظلہم کو حضرت مفکرِ اسلامؒ کی ذات سے نوع بہ نوع کے تجربات وفوائد

حاصل ہوئے۔ مفتی صاحب مد ظلہم نے مدینہ منورہ کے زمانۂ قیام کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا علی میاں کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو ان سے عقیدت کی حد تک تعلق تھا اور مفکر اسلامؒ بھی ابتدا ہی سے آپ پر مہربان رہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''یوں تو ہم مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کو اس زمانہ سے جانتے تھے، جب وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ میں شرکت کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس وقت وہ جوان تھے اور ہم لوگ طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مولانا سے ملاقات کر کے ہم طلبہ کو بڑا مزہ آیا کرتا تھا؛ کیونکہ مولانا ہمارے ساتھ بہت بے تکلفی سے پیش آیا کرتے تھے۔ قیامِ مدینہ کے زمانے میں مولانا کا حج کے لیے تشریف لانا ہوا، تو ہمیں ان کے ساتھ حج کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ منٰی میں ان کا اور ہمارا خیمہ برابر تھا، درمیان میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لیے اور نشست و برخاست کے لیے چھوڑی ہوئی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے مولانا عصر کی نماز سے پہلے اس جگہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے، ہم بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور ان کو لکھتا ہوا دیکھتے رہے، جب وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے ان سے کہا کہ آپ چائے پئیں گے؟ مولانا نے کہا کہ ہاں پلائیں، تھکن معلوم ہو رہی ہے۔ ہم باہر کے ہوٹل سے ان کے لیے چائے لے کر آئے، پرانی سی کیتلی تھی اور فنجان بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے، ابھی ہم نے چائے لاکر رکھی تھی کہ اتنے میں مولانا کے میزبان جو غالباً سعودیہ کے ہی رہنے والے تھے، بہت خوبصورت ٹرے میں نفیس قسم کے فنجان اور خوب صورت کیتلی کے ساتھ چائے لے کر آئے۔ اس چائے کے مقابلے میں ہماری

چائے بہت معمولی نظر آ رہی تھی۔مولانا نے ہمارے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر بڑی اپنائیت کے ساتھ دوسرے آنے والوں سے کہا کہ آپ لوگ چائے لیجیے، ہم تو ہلال میاں کی چائے پئیں گے۔بات معمولی سی تھی،لیکن مولانا کی شفقت اور ان کے بلند اخلاق کا نہ مٹنے والا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گئی۔کبھی لکھنوَ جانا ہوتا تھا مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کے لیے تو مولانا کے وہی دل موہ لینے والے انداز ہوتے تھے۔ برابر میں بیٹھے ہوئے کچھ نہ کچھ سامنے رکھ دینا اور بڑی محبت سے کہنا کہ بھئی یہ بھی تو کھائیے۔یہ حسنِ اخلاق اور بلند کردار اور یہ شفقت اور مروت ومحبت، اس کے نمونے اب کہاں نظر آتے ہیں''

سن ۱۹۵۴عیسوی میں مفکر اسلامؒ کا طلبائے دارالعلوم سے پہلی مرتبہ خطاب ہوا تھا۔اس خطاب کا اصل ذریعہ بھی سجّاد لائبریری سے مربوط طلبہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ آپ اور آپ کے رفیقِ قدیم حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمی اور مولانا فضل الرحمٰن سیوانی ہی بنے تھے۔مفکر اسلامؒ کا یہ خطاب ابتداء میں رسالے کی شکل میں شائع ہوا تھا،بعد میں اس خطاب کو حضرت کی کتاب ''پاجا سراغِ زندگی'' کا حصّہ بنادیا گیا۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اپنی خودنوشت سوانح ''کاروانِ زندگی'' میں اس واقعے کا تفصیلاً ذکر فرمایا ہے اور اس بیان کے کچھ اقتباسات نقل کرنے کے بعد بیان کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں تک تحریر فرمایا ہے کہ ''اگر میرا بس چلے،تو مدارسِ عربیہ کے طلبہ بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور اس کے مسلک کے مدارس کے طلبہ کے لیے فارغ ہونے سے پہلے اس کا ایک بار مطالعہ ضروری قرار دوں''۔طلبائے دارالعلوم سے اپنے پہلے خطاب کی بابت لکھتے ہیں:

''باوجود قدیم وقوی مسلکی دینی وعلمی رشتوں اور متعدد مابہ الاشتراک حقیقتوں

کے ایامِ طالب علمی کے ان چار مہینوں کے بعد سے، جو دیو بند میں مولانا مدنیؒ کے درسِ حدیث میں شرکت میں گزرے، دار العلوم دیو بند سوائے ایک دو بار کے سفروں کے (جو دار العلوم ندوہ کے طلبہ و رفقا کے ساتھ دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں کیے گئے) کوئی رابطہ نہیں رہا۔ دفعۃً اس کا ایک موقع غیبی طور پر پیش آ گیا، وہ اس طرح کہ دار العلوم میں سجاد لائبریری کے نام سے طلبہ کی ایک انجمن تھی، جس میں زیادہ تر بہاری طلبہ دل چسپی لیتے تھے، ان میں سے بعض خاص طور پر مجھ سے واقف و مانوس تھے، انہوں نے ۱۹۵۴عیسوی کے آغاز میں مجھے دیو بند آنے اور سجاد لائبریری کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ میں خطاب کرنے یا مضمون پڑھنے کی دعوت دی، اس خیال سے کہ میں انکار یا کم فرصتی کا عذر نہ کر دوں، انھوں نے مولانا مدنیؒ اور مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے (جن کا میں خاص طور پر ادب کرتا تھا) سفارشی خط لکھوایا، یہ خط مرقع میں محفوظ ہے اور بجنسہ درج کیا جاتا ہے:

جناب مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب زید مجدہ۔ بعد از سلام مسنون عرض آنکہ طلبائے دار العلوم سجاد لائبریری کی پرزور خواہش ہے کہ وہ آپ کی گراں قدر نصائح اور ہدایات سے مستفید ہوں۔ امیدوار ہوں کہ ان کی تمناؤں کو قبولیت سے نوازیں گے۔ والسلام

(ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ)

۲۰ جمادی الاول ۱۳۷۳ہجری بہ مطابق ۱۴ جنوری ۱۹۵۴عیسوی

انچہ استاذ ازل (مولانا مدنی عمت فیوضہم) گفت ہماں می گویم

محمد اعزاز علی امروہیؒ

۲۰ جمادی الاول ۷۳ ہجری

مفکرِ اسلامؒ اصلاً اپنے ان اکابرؒ کے تعمیل ارشاد میں اور کچھ طلبہ کی شدید خواہش کے پیشِ نظر اختلاجِ قلب کے مرض کے باوصف دارالعلوم تشریف لائے اور آپؒ نے ''طالبانِ علومِ نبوت کا مقام اوران کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے مبسوط خطاب فرمایا۔

تقدیری بات ہے کہ اس خطاب کے بعد ایک طویل عرصے تک مفکر اسلام کے طلبائے دارالعلوم سے کسی دوسرے خطاب کی کوئی تقریب پیدا نہ ہوسکی۔ سن ۱۹۷۲ عیسوی میں آپ نے طلبائے دارالعلوم سے دوسرا خطاب فرمایا، اس زمانے میں مفتی فضیل الرحمٰن صاحب ہلال عثمانی دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اور دراصل آپ کے اور آپ کے رفقاء مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، مولانا علاؤالدین گونڈوی، مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ اور مولانا عبدالرؤف عالی کے مشترکہ اصرار پر ہی مفکر اسلام نے اس دوسرے خطاب پر آمادگی ظاہر کی تھی؛ ورنہ پہلے سے حضرتؒ کا طلبائے دارالعلوم سے خطاب کا کوئی ارادہ تھا اور نا ہی یہ آپ کے مقصدِ سفر میں شامل تھا۔ اغلب یہ ہے کہ آپؒ کا یہ سفر شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے ہوا تھا۔ اس دوسرے خطاب کا قصّہ یہ ہوا کہ مفکرِ اسلامؒ مفتی ہلال صاحب مدظلہم کے گھر مہمان بنے۔ وہاں آپ نے اپنے مذکورالصدر رفقاء کے ساتھ آپ سے دارالحدیث دارالعلوم میں خطاب کی درخواست کی اور اس پر خاصے اصرار سے کام لیا گیا۔ مفکر اسلام مولانا علی میاں ندویؒ نے از راہِ تمسخر فرمایا کہ: آپ حضرات کو اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی؟ ان حضرات نے عرض کیا کہ: ہم ہر طرح آپ کا خطاب سننے کے لیے تیار ہیں۔ اس طرح کی مزاحیہ گفتگو کے بعد دارالحدیث میں آپ کے خطاب کا اعلان ہوا اور حضرت مفتی ہلال صاحب نے دارالعلوم کے بڑے ٹیپ ریکارڈ پر اس بیان کو محفوظ کرلیا اور پھر باضابطہ اس کو ایک رجسٹر میں نقل بھی فرمادیا۔ یہ گویا اس بیان کی ادائیگیِ قیمت تھی، جس کا خطاب سے قبل تفریحی شکل ہی میں سہی، ذکر آیا اور حضرت مفتی

صاحب مدظلہم نے آپ کی دعائیں حاصل کرنے اوراس وقیع خطاب سے حلقۂ علماو طلبہ کو زیادہ سے زیادہ استفادے کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے یہ قدم اٹھایا۔مفتی صاحب نے دیوبند سے اس کی اشاعت وطباعت کا پروگرام بھی بنالیا تھا؛لیکن جب نظر ثانی کی غرض سے لکھنؤ مولانا علی میاں ندویؒ کی خدمت میں بھیجا، تو آپ نے نظرِ ثانی اورقدرے حذف واضافے کے بعد لکھنؤ ہی کے کسی مکتبے سے رسالے کی شکل میں اس خطاب کوشائع فرمادیااوراس کے دوسونسخے حضرت مفتی ہلال صاحب کوارسال فرمائے اورفرمایا کہ اگراوربھی ضرورت ہو،تو مزید نسخے بھیج دیے جائیں گےاوریہ بھی فرمایا کہ دیوبند کے مقابلے لکھنؤ کے کتب خانوں کامعیارِطباعت زیادہ عمدہ اوربہتر ہے،اس لیے میں نے اس تقریرکویہیں سے شائع کرادیا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے اس رسالے کی ابتداء میں مفتی صاحب مدظلہم کاذکربھی فرمایا۔

حضرت مولاناؒ نے کاروانِ زندگی میں اس خطابِ ثانی کاذکربایں الفاظ کیاہے:

> ''عرصے کے بعد مجھے دوبارہ (۱۲ اگست ۱۹۷۲ عیسوی کو) طلبائے دارالعلوم سے خطاب کرنے کاموقع ملااورمیں نے ''عصرِ جدید کاچیلنج اور اس کا جواب'' کے عنوان سے ایک طویل تقریر کی،یہ تقریربھی الگ رسالے کی شکل میں شائع ہوئی اور بعد میں ''پاجا سراغِ زندگی'' کے مجموعے میں شامل کردی گئی''۔

مفکراسلامؒ نے اپنے عزیز وقریب حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی اپنے جانشین کے انداز میں تربیت فرمائی اوراللہ کاشکر ہے کہ انہیں اس میں مکمل طورپرکامیابی نصیب ہوئی۔مولانامحمد رابع صاحب مدظلہم حضرتؒ کی حیات کے آخر کے چندسالوں میں سفروحضرمیں سایے کی طرح ہمہ وقت آپؒ کے ساتھ رہے ہیں اورآپ کے حق میں یہ متفقہ شہادت ہے کہ آپ مفکراسلام ایسی عالمی شخصیت کے

وسیع تر معنوں میں جانشین ثابت ہوئے ہیں۔علمی، ملی، رفاہی، دینی، ادبی، تصنیفی اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی وغیرہ تمامتر خدمتِ اسلام و مسلمین کے شعبوں میں اپنے مصلح ومربی اور عظیم محسن ومشفق مفکر اسلامؒ کے نام ویادکو بہ احسن وجوہ زندہ اور باقی رکھے ہوئے ہیں۔مولانا علی میاں ندویؒ کی حین حیات کئی پیچیدہ امورکوآپ نے اس طرح سلجھایا کہ خود مولاناؒ کی طرف سے تحسین وتوصیف کے کلمات سے سرفراز ہوئے اور انہیں واقعات اور پھر آپ کے مکارمِ اخلاق (جو موروثی و خاندانی طور پر آپ کو عطا ہوئے) سے دوربین ودوررس نگاہوں نے سمجھ لیا تھا اور اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مولانا محمد رابع صاحب صرف خاندانی طور پر ہی نہیں؛ بلکہ اوصاف وخصائل، افکار ونظریات اور تنظیم وقیادت کی لیاقت وصلاحیت کے لحاظ سے بھی ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل انسان ہیں۔

مفتی فضیل الرحمٰن صاحب نے آپ کو پہلے رکنِ بورڈ اور پھر پچھلے پندرہ سولہ سال سے صدرِ بورڈ کی حیثیت سے دور قریب سے اور جلوت وخلوت میں اچھی طرح دیکھا ہے اور آپ انھیں معاملہ فہمی، حسنِ تدبر اور لیاقتِ قیادت کے اعتبار سے مولانا علی میاںؒ کا نمونہ خیال فرماتے ہیں۔مولانا محمد رابع صاحب وہ عظیم ومثالی قائد ہیں، جن کی فی زمانہ امتِ مسلمہ کو سخت ترین حاجت ہے۔افکار ونظریات میں سابق صدورِ بورڈ کا پورا پورا اتباع کرنے کی برکت ہے کہ بورڈ جیسا مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندوں پر مشتمل ادارہ بڑی کامیابی کے ساتھ آپ کی زیرِ قیادت کامیابیوں کی سمت میں محوِ سفر ہے۔آپ کی تحریر ہو یا تقریر ایسی معتدل، افراط وتفریط سے منزہ اور اسلام کی ایسی کامل ومکمل شارح و ترجمان ہوتی ہیں، جس کو ہر خیال وفکر کے لوگ اپنے دل وضمیر کی آواز سمجھتے ہیں۔

مفتی صاحب مدظلہم کے ساتھ انہوں نے وہی معاملہ روا رکھا، جس پر ان کے پیش روصدر بورڈ اور ان کے مصلح ومرشد مولانا علی میاں ندویؒ عامل رہے تھے، وہی

ناشتے کے وقت کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز حضرت مفتی صاحب کے سامنے رکھ دینا اور بڑی اپنائیت کے ساتھ اس کے تناول پر اصرار سے کام لینا آپ کا بھی معمول رہا۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم جب بورڈ سے متعلق یا اپنی کسی نجی وذاتی ضرورت کے تحت کوئی خط آپ کی خدمت میں ارسال فرماتے، تو وہاں سے فوراً جوابی خط آجاتا۔ اب یہ دونوں ہی بزرگ عمر کی اس منزل میں داخل ہو چکے ہیں، جہاں ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو ان کے ایک ایک لمحے کو اپنے حق میں غنیمت جاننا چاہیے۔

ان سطور کی تحریر کے وقت مفتی صاحب مدظلہم واحد شخص ہیں، جو بورڈ کے سب سے قدیم بہ قید حیات رکن ہیں۔ آپ جس دور میں رکن منتخب ہوئے تھے، اس دور کے جملہ اراکین بورڈ راہیٔ آخرت ہو گئے۔ موجودہ وقت میں بہ شمول مولانا محمد رابع صاحب مدظلہم وامیرِ شریعت مولانا ولی رحمانی صاحب مدظلہم بورڈ کے تمام ہی ذمہ داران واراکین آپ کے بعد بورڈ کے مناصب پر فائز ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کے سایۂ عاطفت کو تادیر سلامت رکھے۔

تقریباً پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے آپ ضعف و نقاہت، قوت سماعت کے افسوسناک حد تک متأثر ہو جانے اور بینائی کے قریب قریب رخصت وختم ہو جانے کے باعث بورڈ کے اجلاس اور اس کی میٹنگوں میں شریک نہیں ہو سکے ہیں؛ تاہم مقامِ شکر ہے کہ اس حال میں بھی بورڈ سمیت کسی بھی تنظیم و جماعت کی طرف سے آنے والے دعوت نامے کے جواب میں آپ اپنی آراء کسی خادم سے لکھوا کر ارسال فرما دیتے ہیں۔ ابھی ۱۵/اگست ۲۰۱۸عیسوی کو لکھنؤ میں بورڈ کی میٹنگ ہوئی تھی۔ مفتی صاحب نے اس دعوت نامے کے موصول ہونے پر جو تحریر لکھنؤ روانہ فرمائی، افادیت کے پیشِ نظر اس کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔

اس تحریر میں آپ نے دو اہم ترین امور کی جانب اراکین بورڈ کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

ایک یہ کہ پارلیمنٹ میں ہماری نمائندگی دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے؛لہٰذا حکومت کے سامنے یہ مطالبہ رکھا جائے کہ مسلمانوں کوان کی آبادی کے تناسب سے پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے اوراس کے لیے بورڈ کی زیرِ نگرانی ملک گیرتحریک چلائی جائے۔

دوسرے یہ کہ ہمارا یہ ملک جومختلف ریاستوں کا مجموعہ ہے اور جسے انڈین یونین،اسٹیٹ وفاق اور ریاستوں کا وفاق کہا جاتا ہے،حضرت مفتی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اسے بجائے ریاستوں کےفیڈرل سسٹم کے کلچرل فیڈرل سسٹم (تہذیبی وفاق) کا درجہ دیا جائے،تاکہ ملک کی ہر اکائی واقلیت اپنی تہذیب وتشخص کی حفاظت کے بارے میں مامون ومطمئن ہوسکے اور اقلیتوں پر اکثریت کی تہذیب جبراً تھوپنے یا سب کوایک ہی تہذیب وتشخص میں رنگنے جیسے نعروں ودعووں کا انسداد ہوسکے۔

آج کل سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کی تہذیب و تمدن اوران کے مذہبی تشخص وامتیاز کومحوکرنے کی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں اور فساد و انتشار کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے،جس کا کامیاب حل اسی میں مضمر ہے کہ یہاں ریاستوں کی بنیاد پرکسی بھی فیڈرل سسٹم کے بجائے کلچرل فیڈرل سسٹم کا عملاً آغاز ہو۔اس سے یہ ہوگا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کواس بات کا اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے اوقاف ودیگر سماجی ومذہبی معاملات اپنے اپنے مذہب کی روسے حل کرلیا کریں۔ظاہر ہے اگر ایسا ہوجائے توسارے مسائل کاازخود حل نکل آئے۔

اس کے لیے حکومت سے مطالبہ کیا جائے اورحکومت کواس کی تعمیل پرآمادہ کرنے کے لیے ملکی سطح پرتحریک چلائی جائے اور جابہ جا چھوٹے بڑے جلسوں کے انعقاد کے ذریعے ملک کے باشندوں پر کلچرل فیڈرل سسٹم کی اہمیت اوراس کے فوائد ومنافع کو اجاگر کیا جائے۔

مفتی صاحب کوامید ہے کہ اگر بورڈ کی زیرِ نگرانی ایسی کوئی تحریک چلائیں گے،تو

ہمیں سکھ، جینی اور عیسائی برادری سمیت کئی اقلیتوں کا پورا پورا تعاون حاصل ہوگا اور اللہ نے چاہا تو ہمیں اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی نصیب ہوگی۔

ابھی کچھ ماہ پہلے دہلی میں عاملہ کی میٹنگ ہوئی، جس میں آپ شریک نہیں ہو سکے۔ مولانا ولی رحمانی صاحب مدظلہم نے اس موقع پر آپ کو درج ذیل خط ارسال فرمایا:

محترم گرامی قدر زید مجدکم

السلام علیکم ورحمة الله وبركاته

اللہ تعالیٰ آپ کو پوری صحت دے (آمین) توقع تھی کہ دہلی اجلاس عاملہ بورڈ میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا؛ مگر شاید پیر کی تکلیف کی وجہ سے پروگرام ملتوی ہوگیا۔ ہم لوگ انتظار میں رہ گئے۔

آں جناب کے تحریر کردہ رسالے ''جب رشتہ ٹوٹتا ہے'' ''اسلام نے عورت کو کیا دیا'' اور ''پینا حرام ہے'' بورڈ سے بارہا شائع ہوئے، پھر خانقاہ رحمانی سے ان کی اشاعت ہوئی اور اب امارت شرعیہ سے ان کی تازہ تازہ اشاعت ہوئی ہے۔ آں محترم کے ریکارڈ کے لیے اس اشاعت کے نسخے بھیجے جارہے ہیں۔ الحمدللہ یہ تحریریں مقبول ہوئیں، بار بار طبع ہوئیں اور پڑھنے والے فائدہ اٹھارہے ہیں اور آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہیں۔ **فالحمد لله على ذلك**

والسلام

محمد ولی رحمانی

۷-۸-۲۰۱۸

○❖○

صدر مفتی ورکن مجلسِ مشاورت دار العلوم وقف دیوبند

مفتی صاحب مدظلہم کی مالیر کوٹلہ آمد کے بعد ہی سے یہ خواہش رہی کہ دار العلوم سے ان کی نسبت وتعلق کسی بھی عنوان سے قائم رہے، مگر یہ خواہش خواہش ہی کی حد تک رہی۔ دار الافتاء مالیر کوٹلہ سے ہمہ وقتی وابستگی اور دیگر متعدد تنظیموں سے متعلقہ امور اور کامل یکسوئی کے طالب متعدد تصنیفی کاموں کے پیش نظر آپ اپنی یہ خواہش اپنے اکابر کے سامنے ظاہر کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ سن ۲۰۱۳عیسوی میں آپ اپنے اہم تصنیفی کاموں سے ایک حد تک فارغ ہو چکے تھے۔ خاص طور پر ''تفسیر نور القرآن'' جس پر آپ نے کم وبیش بیس سال صرف کیے اور جس نے آپ کے زیادہ تر اوقات کو مشغول کیا ہوا تھا، یہ تفسیری کام بھی تکمیل کے قریب جا لگا تھا اور دار الافتاء مالیر کوٹلہ کے سرکاری منصب سے تو سن ۲۰۰۴عیسوی ہی میں ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ فراغت کے ان لمحات میں آپ کو ایک مرتبہ پھر دار العلوم سے وابستگی کا خیال پیدا ہوا اور اب چوں کہ کوئی بڑا اہم مانع بھی باقی نہیں رہ گیا تھا، اس لیے آپ نے اس مرتبہ اپنے مرشدِ ثانی حضرت اقدس مولانا محمد سالم صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ سے اپنی اس دیرینہ خواہش کا اظہار فرمایا۔ خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحبؒ نے آپ کے لیے دار الافتاء دار العلوم وقف کے صدر مفتی کی تجویز پیش فرمائی۔ مفتی صاحب کا خیال یہ تھا کہ شمائل ترمذی وغیرہ حدیث کی کسی مختصر کتاب کی تدریس ان کے ذمہ کر دی جائے گی، جس کو بہت کم وقت میں پڑھانا بھی ممکن ہو سکے گا، اس لیے آپ نے اپنے مرشد و مربی خطیب الاسلامؒ سے عرض کیا کہ حضرت ''کوئی چھوٹی موٹی خدمت میرے حوالے فرما دیں۔ صدر مفتی جیسے عظیم اور اہم منصب کا میں بالکل اہل نہیں ہوں''۔ خطیب الاسلامؒ نے فرمایا کہ آپ اس عہدے کے لیے نہایت موزوں شخص

ہیں، آپ کی خاندانی فقہی خدمات بھی عالمِ آشکار ہے اور پھر ماشاء اللہ آپ خود بھی ایک زمانے سے پنجاب کے دارالافتاء میں بہ حیثیت مفتیٔ اعظم فقہی خدمات انجام دیتے آئے ہیں اور آپ کو فقہ وفتاوی کے باب میں طویل تجربہ ہے؛ اس لیے آپ کے اس عہدے پر فائز ہونے سے یہ شعبہ مزید ترقی کرے گا۔ مولاناؒ نے اپنے انہیں تأثرات وخیالات کا اظہار اخبارات میں بھی کیا اور پھر مفتی صاحب مدظلہم کو باقاعدہ اس منصب پر مقرر کیے جانے کے موقع سے دفتر اہتمام سے یہ تحریر جاری فرمائی:

"کسی بھی ادارے کے شعبۂ تخصصات میں دارالافتاء امتیازی حیثیت کا حامل شعبہ تصور کیا جاتا ہے۔ بحمد اللہ دارالعلوم وقف دیوبند اپنی علمی وتعلیمی و دیگر متعلقہ ہمہ جہت حسن کارکردگی کی بنیاد پر آج نہ صرف اندرونِ ملک، بلکہ بین الاقوامی سطح پر ایک منفرد و باعظمت حیثیت کا حامل ادارہ تصور کیا جاتا ہے، شعبہ جات تخصصات بالعموم اور دارالافتاء بالخصوص ادارے کے امتیازات کا ایک قابلِ ذکر حصہ ہوتا ہے اور دارالعلوم وقف دیوبند کے اس شعبے کے منصبِ صدارت پر مولانا خورشید عالم صاحبؒ جیسی شخصیت فائز رہی، جن کی اس فن میں دقت نظر کے علاوہ ان کی اپنی شخصیت علمی سطح پر بہت مؤثر تھی۔ اس منصب کے مقتضیات میں علمی تبحر کے ساتھ ساتھ مصلحتِ عامہ کے نقطۂ نظر سے کبر سنی بھی وجاہت منصب میں شامل تصور کی جاتی ہے۔ مولانا خورشید عالم صاحبؒ کی وفات کے بعد سے صدارت کا منصب خالی ہے، اگر چہ دیگر جملہ علمی وتعلیمی وشعبہ جاتی امور محنت ولگن اور سلیقے کے ساتھ قابل اطمینان وقابلِ اعتماد طریقے پر مولانا مفتی محمد احسان صاحب اور مولانا مفتی محمد عارف صاحب کے ذریعے انجام دیے جارہے ہیں۔

محترم جناب مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب نے ادارے سے آئینی انتساب کی خواہش کا اظہار کیا ہے، جوکہ بایں معنی بھی قابلِ توجہ و التفات ہے کہ موصوف محترم کے خانوادے کے اکابر فن افتاء کے امتیازی وصف سے ہی متصف تھے اور دورِ قدیم سے دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ افتاء کا امتیاز تصور کیے جاتے تھے؛ لہٰذا علمی و خاندانی وجاہت کے نقطۂ نظر سے دارالافتاء کے منصبِ صدارت کے لیے موصوف محترم موزوں شخصیت ہیں؛ کیوں کہ پنجاب میں بھی موصوف محترم سے متعلق اہم ذمہ داریاں ہیں، لہٰذا ہر ماہ کے ابتدائی ۱۵ ایام ادارے کی خدمت کے لیے وقف رہیں گے، لہٰذا اس دورانیے میں تمرینِ فتاوی کا درس حضرت مفتی صاحب سے متعلق رہے گا۔ علاوہ ازیں بہ طور ''صدر مفتی دارالعلوم وقف دیوبند'' منصبی طور پر امورِ متعلقہ کی نگرانی بھی فرمائیں گے، حسبِ معمول جواباتِ استفتاء مفتیانِ دارالافتاء سے متعلق رہیں گے؛ البتہ ایام حاضری میں موصوف محترم کے توثیقی دستخط عوامی سطح پر مزید لائقِ اعتماد و موثر ذریعہ ثابت ہوں گے۔

بوجوہ بالا مورخہ ۱۵/ شوال المکرّم ۱۴۳۵ ہجری سے محترم جناب مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب کا بطور صدر مفتی دارالعلوم وقف دیوبند ''اعزازی تقرر'' منظور کیا جاتا ہے۔

محمد سالم قاسمی
مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند
۵ شوال المکرّم ۱۴۳۵ھ

مفتی صاحب مد ظلہم نے دیوبند میں واقع اپنے مکان کو درست کرایا اور ذمہ دارانِ دارالعلوم کا بھی آپ کو پورا پورا تعاون حاصل رہا۔ دارالعلوم وقف کے اساتذہ کو

دارالعلوم وقف لانے و لے جانے کے لیے کافی سالوں سے جامعہ ہٰذا ہی کی جانب سے ایک گاڑی کا انتظام کیا ہوا ہے، یہی گاڑی آپ کی آمدورفت کا ذریعہ تھی۔ خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ بہ ذاتِ خود آپ کے مکان پر تشریف لائے اور آپ کی راحت رسانی کا مکمل خیال رکھا۔ مفتی صاحب بڑے حوصلے و امنگ کے ساتھ اپنے آبائی وطن میں آئے کہ پینتالیس چھیالیس سال بعد اپنے دیوبند کے قدیم گھر میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے اور اس طرح اپنے مرشدؒ کی خدمت وصحبت سے زیادہ سے زیادہ اصلاحی و باطنی فوائد حاصل ہونے کی عظیم دولت ہاتھ لگ رہی تھی۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ ان ذاتی واصلاحی فوائد اور دارالعلوم وقف کی مفوضہ خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ دیوبند کا قیام اس لحاظ سے بھی حد درجہ اہم تھا کہ اس بہانے انھیں اپنے دارالعلوم دیوبند کے تدریسی دور کے دیوبندی شاگرد علما کی علمی و دینی مصروفیات کو بہت قریب سے دیکھنے اور خود شاگردوں کے بھی بہ وجہ قربِ مکانی آپ کی مفید وصائب آرا و مشوروں سے استفادہ کرنے کی بہت اچھی سبیل پیدا ہو رہی تھی، چناں چہ حسبِ توقع آپ کے قیام کے بعد سعادت مند شاگردوں و متعلقین کا آپ کی طرف رجوع بھی بڑھنے لگا تھا؛ مگر خدائی تقدیر ایک مرتبہ پھر انسانی تدبیر پر غالب آ کر رہی۔ مفتی صاحب کی صحت یک بہ یک اس درجہ کمزور ہوئی کہ آپ کے لیے دارالعلوم وقف کی یہ آمدورفت متعذر ہوگئی اور چوں کہ عمر کے لحاظ سے اس ضعف ونقاہت پر قابو پانا اتنا آسان بھی نہ تھا اور پھر مزید براں چند قدم چلنے پر سانس اکھڑنے کی نئی بیماری میں بھی آپ مبتلا ہو گئے تھے؛ اس لیے بادلِ ناخواستہ مالیرکوٹلہ تشریف لے آئے۔ مالیرکوٹلہ تشریف آوری کے بعد کئی مرتبہ مختلف امراض کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ آپ کو پٹیالہ وغیرہ پنجاب کے بڑے اسپتالوں میں داخل کرنا پڑا۔

دارالافتاء دارلعلوم وقف دیوبند کے موجودہ مفتیانِ کرام مفتی محمد احسان صاحب،

مفتی محمد عارف صاحب اور مفتی محمد عمران صاحب نے آپ کی موجودگی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ پیچیدہ اور اہم ترین استفتائات کے حل کے لیے آپ کی زیرِ ہدایت مخصوص فقہی کتب کا مطالعہ کیا اور ہر پہلو سے مسئلے کی تنقیح ہوجانے کے بعد آپ کے توثیقی دستخط کے ساتھ یہ استفتاء جاری ہوئے۔اب بھی یہ سلسلہ بڑی حد تک قائم ہے کہ اہم فتاویٰ آپ کی خدمت میں مالیر کوٹلہ بھیج دیے جاتے ہیں اور آپ کے اطمینان وتائیدی دستخط کے بعد ہی جاری ہوتے ہیں۔

مفتیانِ دارالعلوم وقف دیوبند نے آپ کے ساتھ عزت واحترام اور عقیدت ومحبت کا جو معاملہ روا رکھا، اس کی آپ کے دل میں خاص قدر ہے اور ان حضرات نے جس طرح دارالافتاء کا نظام سنبھالا ہوا ہے، اس سے بحمد اللہ آپ مطمئن ہیں اور دارالافتاء دارالعلوم وقف دیوبند سے آن لائن فتویٰ کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اسے آپ بے حد مفید ونافع خیال فرماتے ہیں؛ کیونکہ اس طرح مستفتی کو اپنے استفتاء کا جواب حاصل کرنے کے لیے حسبِ سابق طول طویل انتظار کی زحمت سے نہیں گزرنا پڑتا، فوراً اس کے آن لائن استفتاء کا جواب جاری کر دیا جاتا ہے، یا پھر چند ہی گھنٹوں میں یہ کام طے پاجاتا ہے، ورنہ اگلے روز تو بہر صورت اسے آن لائن اپنے سوال کا جواب موصول ہوجاتا ہے۔ایک مفتی صاحب دارالافتاء کے اوقات میں مستقل اسی خدمت پر مامور ہیں۔

مفتی صاحب مدظلہم کی حدیثی وفقہی مہارت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا اور جن حضرات کو آپ کے قلم سے حدیث وفقہ پر صادر ہونے والی کتابوں سے کچھ بھی استفادے کا موقع ملا ہے، وہ بھی برملا اس کی تصدیق وتائید فرمائیں گے کہ حضرت کی صحت اگر کچھ عرصہ بہتر رہی ہوتی تو بالیقین فتاویٰ میں نئی نئی راہیں نکلتیں، وسعت و کشادگی کے طالب مسائل میں طرقِ توسع بھی سمجھے و ذہن نشین کیے جاتے اور دارالافتاء کے وقار واعتماد اور اس کی شہرت وعظمت میں مزید نئے باب رقم ہوتے،

تاہم ایک دوسال کی آپ کی دارالافتاء سے ہمہ وقتی وابستگی بھی کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے، جس کے عظیم وانمٹ فوائد پر حلقۂ مستفیدین کو تحریراً وتقریراً روشنی ڈالنے کا راقم الحروف سے کہیں زیادہ حق ہے اور سچی بات یہ ہے کہ انھی سے اس عنوان پر تفصیلی معروضات کی توقع بھی ہے۔

سن ۲۰۱۳عیسوی میں آپ کو صدر مفتی کے اعزازی عہدے کے علاوہ مجلسِ مشاورت دارالعلوم وقف دیوبند کی رکنیت کا شرف بھی بخشا گیا۔آپ زمانۂ صحت میں بلاناغہ مجلس کی میٹنگوں میں شریک رہے اور آپ کی آراء نے کئی مواقع پر ذمہ دارانِ دارالعلوم سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

چند سالوں سے بعض بڑے مدارس کے کچھ سفراء کا یہ المناک رویہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے کہ بعض سفراء حضرات بڑے مدارس کے ساتھ قدیم تعلق، ان اداروں کی شہرت اور ان کا خادم ہونے کے ناتے خود کو ملت اسلامیہ ہندیہ کی جانب سے ملنے والی عزت وتعارف کا بایں طور غلط فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اپنے صاحبزادگان کے زیرِ اہتمام کوئی چھوٹا موٹا ادارہ قائم کر لیتے ہیں اور پھر ملک بھر میں ان صاحبزادگان کی معیت میں سفر کرتے ہیں اور بعض ذاتی ادارے بنا کر دونوں کا چندہ ایک ہی ساتھ کرتے ہیں، اس سے بڑے اداروں کا جو نقصان ہوتا ہے یا ان بڑے جامعات کے قدرداں بعض سمجھدار احباب ان کے اس طرزِ عمل سے جتنا دکھ محسوس کرتے ہیں، وہ ایک واضح چیز ہے۔حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اس پلیٹ فارم سے تمام ہی مدارسِ اسلامیہ ہندیہ کے اربابِ حل وعقد سے یہ بات صاف صاف عرض کی کہ اس سمت میں خصوصی توجہ سے کام لیا جائے اور ایسے سفراء حضرات کو حکمت ونرمی کے ساتھ اس کا پابند بنایا جائے کہ وہ صرف انھیں بڑے اداروں کے چندے تک ہی اپنے کو محدود رکھیں، کسی بھی طرح کی ذاتی منفعت کو اس کے ساتھ ہرگز راہ نہ دیں، جس سے کہ ان جامعات

کا مالی نظام متاثر ہو یا معاونین کا اعتماد مجروح ہو۔آپ کی اس بات کی بھرپور پذیرائی کی گئی اور مجلس میں موجود ملک کے متعدد نامور مدارس کے نظماء (جو مجلسِ مشاورت کا رکن ہونے کے ناتے حاضر تھے) نے اس پر عمل کیا، جس کے بہت اچھے اور مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ضرورت ہے کہ ملک کے تمام جامعات کے منتظمین آپ کی اس نصیحت کو حرزِ جاں بنائیں، جس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ مدارس کا شعبۂ مالیات ان شاء اللہ مزید مستحکم ہوگا، دوسرا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ عوام کے ان مدارس پر اعتماد میں مزید اضافہ ہوگا۔

ایک دوسری بہت ہی اہم رائے آپ نے یہ پیش کی تھی کہ ہمارے ملک کے تمام چھوٹے بڑے جامعات کے تعلیمی طور پر باہمی ربط وارتباط کی کوئی معقول شکل قائم کی جائے، اس سلسلے میں ہمیں پاکستان کے شہرۂ آفاق ادارے وفاق المدارس سے مدد لینی چاہیے اور اسی طرز کا کوئی ادارہ وجود میں لانا چاہیے۔پاکستان کے اس وفاق المدارس کے اصول وضوابط اور اس ادارے کے فوائد ومنافع کی تفصیل ویب سائٹ پر دیکھی جا سکتی ہے، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم نے بھی البلاغ کے اداریہ میں اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔مفتی ہلال صاحب نے اپنی اس رائے کو ایک مضمون کی شکل میں اپنے ماہنامے ''دارالسلام'' میں شائع فرمایا تھا، ملک کی معزز شخصیات کو اس مضمون کے خطوط بھی لکھے تھے اور نجی مجالس میں بھی اس کا زبانی سلسلہ جاری رکھا تھا؛ مگر افسوس ہے ایسا کوئی کام اب تک وجود میں نہیں آ سکا۔خدا کرے مستقبل میں کسی ایسے ادارے کا قیام ہو اور ملک کے تمام جامعات تعلیمی لحاظ سے لائقِ رشک حد تک ترقی کر سکیں اور ان کا مالی نظام ہر طرح کے خطرات سے محفوظ رہ سکے۔

جہاں تک دارالعلوم وقف کے موجودہ انتظام واہتمام کا تعلق ہے، تو موجودہ

اہتمام میں جس طرح مضبوطی کے ساتھ اصول وضوابط پر عمل کیا جارہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے آپ پرامید ہیں کہ جانشین خطیب الاسلام مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی مدظلہم کی زیرِ نگرانی ادارہ تعلیمی، دعوتی اور تعمیری ہر لحاظ سے بہتر سے بہتر ترقیات سے ہم کنار ہوگا۔ ان شاء اللہ

مولانا شکیب قاسمی جو دارالعلوم دیوبند کے ماضی قریب کے فضلاء میں سے ہیں۔ موصوف نے تعلیمی و انتظامی امور میں پچھلے چند سالوں میں اپنے دادا مرحوم خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی اور والد گرامی جانشینِ خطیب الاسلام حضرت مولانا سفیان صاحب قاسمی کی معاونت ومساعدت کا فریضہ جس خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا ہے، اسے آپ ان کے اوران کے توسط سے دارالعلوم وقف کے روشن مستقبل کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ ایک روز مولانا شکیب صاحب کی محنت و جفاکشی اوران کی ذہانت وفطانت کے واقعات سنانے کے بعد احقر سے فرمایا کہ:

''اس بچے کی ان ذہنی و انتظامی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ہم اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اس کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اور آگے کام بڑھائے۔ عزیزم مولوی شکیب سلمہ نے حجۃ الاسلام اکیڈمی سے جو سہ ماہی وحدۃ الامۃ کے نام سے عربی رسالہ جاری کیا ہے اور اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم وافکار اوران کی مثالی حیات وخدمات پر جو چند کتابیں عربی میں لائے ہیں، وہ ایک بہت بڑا کام ہے، اس سے ادارے کے بین الاقوامی سطح پر تعارف کے علاوہ ایک عظیم فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے عالم عرب حضرت نانوتویؒ کے افکار ونظریات سے آگاہ ہوسکے گا اور عالمِ عرب میں حضرت نانوتوی کے فکر کی ترویج بہت ضروری ہے۔

میں پورے شرحِ قلب کے ساتھ اپنی یہ رائے رکھتا ہوں اور اس پر یقین رکھتا

ہوں کہ دنیا کو اس وقت اس فکرِ نانوتوی یا فکرِ دیوبند کی ضرورت ہے، جس میں انتہائی درجے کا اعتدال پایا جاتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کی فکر کے اعتدال کا عالم یہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے تمام دلائل دیتے ہیں اور تمام دلائل دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ کیا ضروری ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو صحیح مسئلہ معلوم ہو گیا ہو۔ کیا پتہ ہے حق امام شافعیؒ کی طرف ہو، اس لیے ہمیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل یہ ہے وہ فکری اعتدال، جس کی اس وقت سخت ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے عالمی سطح پر ہماری طاقت ضائع بہت ہو رہی ہے اور ہمارا نوجوان خون بہ رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ جامعہ ہٰذا کو مزید ترقیات عطا فرمائے، میرِ کارواں حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی مدظلہم کے علم و عمر میں برکتیں عطا فرمائے اور مولانا شکیب صاحب کے اپنے دادا مرحوم، مفتی صاحب مدظلہم اور دیگر اکابر کی توقعات پر کھرا اور پورا اترنے کے اسباب پیدا فرمائے۔

کل ہند مجلس مشاورت

سن ۱۹۶۴ عیسوی مسلمانانِ ہند کے حق میں بڑا نامبارک و پرخطر دور ثابت ہوا تھا۔ یہی وہ سن ہے، جس میں کلکتہ، راوڑکیلا اور جمشید پور میں بڑے بھیانک ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے اور مسلمانوں کو جانی و مالی اعتبار سے سخت نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان فرقہ وارانہ فسادات کی خطرناکی و سنگینی کا صحیح طور پر اندازہ لگانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ صرف جمشید پور اور راوڑکیلا میں تین ہزار سے زائد مسلمانوں کا قتل ہوا اور مالی نقصان تو بے حد وحساب ہوا تھا۔

مسلمان یوں تو تقسیم کے بعد سے ہی حالات و حوادث کا شکار رہا ہے؛ مگر سن ۱۹۶۴ عیسوی کی اس خونی روئیداد نے پچھلے تمام معرکوں کو مات دے دی تھی اور بہ ظاہر

اسباب ایسا نظر آنے لگا تھا کہ موجودہ حالات کا اگر کوئی معقول اور مناسب حل نا تلاش کیا گیا، تو پھر خدانا خواستہ وہ دن دیکھنا پڑسکتا ہے کہ مسلمان کا اس ملک میں ملی وشخصی وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے اور وہ دوراہوں میں سے کسی ایک راہ کے انتخاب پر مجبور ہو جائے۔ ایک یہ کہ آزادی کے ساتھ احکامِ دینیہ پر عمل درآمد کے لیے کسی اور ملک کے لیے عازمِ سفر ہو یا بہ صورتِ دیگر اپنے تمام ملی و دینی تشخصات وامتیازات سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کرے۔

باخبر مسلمان ان ہولناک فسادات کے بعد سے ملکی سطح پر ڈرے وسہمے ہوئے تھے، مایوسیوں اور طرح طرح کے خطرات ومصائب کے تصور نے ان کو کچھ وقت کے لیے سرگرم زندگی سے باہر کر دیا تھا۔

ان فسادات کے وجوہ واسباب تو کئی ایک تھے؛ تاہم اس کا ایک بڑا اور افسوس ناک سبب ملکی سطح پر مسلمانوں کا سیاست کے میدان میں کسی متحدہ پلیٹ فارم سے محروم ہونا اور ان کے قیادتی قافلوں کا منتشر ومتفرق ہونا تھا۔ مسلمان اس صورتِ حال سے کافی دل برداشتہ تھے اور ملک کے اطراف واکناف سے مسلم تنظیموں کے کسی ایک پلیٹ فارم پر آ جمع ہونے کے مطالبات بھی ہونے لگے تھے، جس پر کماحقہ عمل بد قسمتی سے اب تک نا ہوسکا۔ والغیب عند اللہ

اس صورتِ حال سے کئی ملکی دینی بزرگ مغموم تھے؛ بالخصوص ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے نام لائقِ ذکر ہیں، ان بزرگوں نے مسلمانوں کو مایوسی وبے اطمینانی سے نکال کر ان میں خدا اعتمادی وخود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے اور قیادت کے اس خلا کو پر کرنے کے لیے اس وقت کے ملک بھر میں اثر ورسوخ رکھنے والے چنندہ وچیدہ افراد کو مجتمع کیا؛ چناں چہ اسی سن ۱۹۶۴ عیسوی ۸-۹ ر اگست کو لکھنؤ میں باضابطہ طور پر کل ہند مجلس مشاورت کا انعقاد عمل میں آیا اور ان بزرگوں کی کوششوں

اوران کے وسیع ذاتی تعلقات کی بہ دولت مختلف صوبائی وملکی تنظیموں کے سربراہان و قائدین کی خدمات حاصل کی گئیں۔

ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ یکے بعد دیگرے مجلس مشاورت کے صدر رہے اور مجلس کے پلیٹ فارم سے ملک کی جن جلیل القدر شخصیات نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

امیرِ شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ
مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
داعی الی اللہ مولانا منظور احمد نعمانیؒ بانی الفرقان
ڈاکٹر عبدالجلیل فریدیؒ بانی مسلم مجلس
مولانا محمد مسلم صاحبؒ ایڈیٹر ''دعوت''
مفسرِ قرآن مولانا عبدالکریم صاحبؒ پاریکھ ناگپور
مولانا یوسف صاحب اصلاحیؒ امیر جماعتِ اسلامی
مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم (صاحبِ تذکرہ)
الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ صدر مسلم لیگ
سید شہاب الدین صاحب ایم پی
ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی صاحب
شیخ ذوالفقار صاحب صدر مسلم مجلس وسابق وزیر مالیات

یہ وہ حضرات ہیں جن میں سے بعض تو مستقل مجلس کے رکن تھے اور بعض وہ بھی تھے، جو بہ ظاہر مجلس کے کسی عہدے پر فائز نہ ہونے کے باوجود مجلس کی رضا کارانہ خدمت کے لیے وقف رہے۔ مجلس کی میٹنگوں اور اس کے جلسوں میں شریک رہے

اور مجلس کے بقا و استحکام کے لیے ہمہ وقت کوشاں و سرگرداں رہے۔ مجلس کا قیام، جیسا کہ ذکر آیا، ۱۹۶۴عیسوی میں ہوا تھا۔اس دور کے لحاظ سے مجلس کے اہداف و مقاصد میں جو چیزیں شامل تھیں، ان میں سے ایک شئے یہ تھی کہ مسلمانوں کو مایوسی اور خوف وہراس سے نکالنے کا کام ملکی سطح پر کیا جائے؛ چناں چہ مجلس کے معزز اراکین نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے امن پسند غیر مسلم برادرانِ وطن کا ساتھ حاصل کیا گیا۔ مولانا علی میاں اور مولانا منظور احمد نعمانی وغیرہ اراکینِ مجلس نے اس سلسلے میں برادرانِ وطن سے بہ راہِ راست ملاقاتیں کیں، انہیں ہندوستان کی موجودہ افسوس ناک صورت حال، اس کے وجوہ و اسباب اور عدمِ اصلاح کی صورت میں ملک کے مستقبل پر مرتب ہونے والے اس کے بھیانک نتائج سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا۔ ان ذاتی ملاقاتوں کے علاوہ کئی با اثر انسانیت دوست غیر مسلم حضرات کی خدمت میں خطوط بھی ارسال کیے گئے، جن میں ان سے ملک کے موجودہ مسائل و حالات کے حل کے لیے تعاون کی مخلصانہ استدعا کی گئی۔

بہت سے غیر مسلم تو اس منظر نامے سے پہلے ہی سے نالاں تھے اور اسے ملک و اہلِ ملک کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ غالباً مجلسِ مشاورت کے قیام اور اراکینِ مجلس کی ان ملاقاتوں سے پہلے ہی مسٹر جے پرکاش نرائن نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے صدر اور متعدد سیاسی جماعتوں کے سربراہان کے نام ایک خط لکھ کر اپنے دل کا درد ظاہر کر دیا تھا، خط کا ایک اقتباس پڑھیے اور ایسے اندوہناک مواقع پر اکثریت کے انسانیت دوست برادرانِ وطن کی بے چینی اور ان کے کرب کا اندازہ کیجیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک مظالم کا تعلق ہے، میرے خیال میں کوئی حد باقی نہیں رہی، ہر نفرت انگیز اور شرمناک حرکت کی گئی، عام طور پر جو کچھ ہوا، وہی عبرت

ناک تھا؛ لیکن بعض معاملوں میں تو بے رحمی اور گراوٹ کا اندازہ کرنا محال ہے، ایسی ایسی ہیبت ناک باتیں کی گئی ہیں، جن کے بارے میں دہلی یا ملک کو قطعی علم نہیں ہے کہ کس پیمانے پر کیا ہوا''۔

اسی خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تعلیم درندگی اور مجرمانہ حرکتوں کی طرف میلان کا تدارک نہیں اور یہ بھی کہ حکومت کی انتظامی مشینری کس قدر نا کافی اور نا اہل ہے''۔

شری نابا کرشنا چودھری سابق وزیر اعلی اڑیسہ، پنڈت سندر لال اور آگم بابو نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس تحریک کو امداد بہم پہنچائی۔ اس دور میں جن صوبوں اور متعدد اضلاع کا سفر کیا گیا ان میں راوڑکیلا، جمشید پور، رانچی، میسور، نڑیاڈ، گودھرا، بڑودہ، بھروچ، سورت اور دیوبند کے نام شامل ہیں۔

ملک کے مرکزی مقامات پر مخلوط اجتماعات کا انعقاد عمل میں لایا گیا، جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ اور عیسائی عوام کو اہتمام سے مدعو کیا جاتا، ان کی حاضری کے باضابطہ اسباب فراہم کیے جاتے، ان کی آمد و رفت تک کے انتظامات بعض جگہوں پر کیے گئے، نتیجتاً غیر مسلم برادرانِ وطن کی تقریباً ہر ایسے اجلاس میں اچھی خاصی حاضری رہتی۔ ان جلسوں سے مسلم زعمائے ملت اور غیر مسلم قائدین خطاب کرتے۔ ان بیانوں میں ملک میں جاری فرقہ وارانہ فسادات کے عواقب و مہلکات اور باہمی اخوت و یگانگت کے فوائد و منافع پر تفصیلاً روشنی ڈالی جاتی اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب کے حوالے سے اس کی سابقہ خصوصیات و امتیازات کو گلے سے لگائے رکھنے کی نصیحت کی جاتی۔ بلا تفریق مذہب و ملت سامعین ان خطابات سے از حد متأثر ہوتے، اس طرح باہم قریب آنے سے بہت سے شکوے شکایتیں معدوم اور غلط فہمیاں دور ہوئیں

جو کچھ فرقہ پرست طاقتوں کی پیدا کردہ تھیں اور اس طرح کے واقعات کے پیدا کرنے میں جن کا بنیادی کردار تھا اور ایک جگہ پر تو دیکھنے والوں نے وہ یادگار لمحہ بھی دیکھا کہ مائک فیل ہو جانے پر جب کچھ مسلمان جلسہ گاہ چھوڑ کر جانے لگے، تو ان کے برابر میں بیٹھے غیر مسلم برادرانِ وطن نے یہ کہہ کر انہیں روکا کہ ''آپ جا کیوں رہے ہیں، یہاں پر کیسی اچھی اچھی باتیں سنائی جارہی ہیں'' غرض اکابر و زعماء کے اس طوفانی دورے نے اچھے اور امید افزا نتائج چھوڑے اور مسلمان، جو اس وقت کے مخصوص حالات میں مایوسی کے بدترین دور سے گزر رہے تھے، ان میں نئے سرے سے عزم و حوصلہ اور بڑے سے بڑے حالات و مصائب کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پھر سے عود آئی اور ایک طرح کے جمود و تعطل کی شکار ان کی خاموش و ویران زندگی کی جگہ یکا یک ایک نئی و متحرک زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

گجرات کے تمام تر جلسوں میں پنڈت سندر لال شریک رہے اور ان کی موجودگی نے برادرانِ وطن کے مسموم اذہان کی صفائی کا بہت ہی اچھا کام کیا، جو شاید ان کی عدمِ موجودگی میں اس پیمانے پر نہ ہوتا۔

سن ۱۹٦٦عیسوی میں مشاورت کا اجلاسِ عام دیوبند میں طے ہوا اور متعینہ تاریخ پر بہ وقتِ شب مدرسہ اصغریہ کے سامنے ایک وسیع ہال میں یہ اجلاسِ عام منعقد ہوا۔ مولانا عامر عثمانیؒ اس اجلاسِ عام کے کنوینر تھے۔ اسٹیج پر مولانا منظور احمد نعمانیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مرحوم جمیل مہدی، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم اور پنڈت سندر لال تشریف رکھتے تھے اور حسبِ توقع مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے احباب بہت بڑی تعداد میں تشریف لائے تھے۔ تلاوتِ کلام اللہ کے بعد مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم نے تاریخِ ہند اور اس میں صدیوں سے آباد مختلف المذاہب باشندگانِ ہند کی باہمی رواداری پر اپنا جامع مقالہ پیش کیا، جسے بے حد سراہا و

پسند کیا گیا۔ آپ کے بعد جمیل مہدی مرحوم نے تاریخِ ہند پر اپنا وقیع ومبسوط مقالہ پیش کیا۔ یہ اجلاس بعض افراد کی ہنگامہ آرائی کی بنا پر اپنے متعینہ وقت سے پہلے ہی اختتام پذیر ہو گیا تھا؛ ورنہ دیو بند کی مرکزیت کے سبب اس اجلاس کے اثرات ملک و بیرونِ ملک تک ممتد ہوتے۔ ماشاء الله كان و مالم يشأ لم يكن

دوسرے مجلسِ مشاورت نے حکومت کی مسلمانوں کے معاملات میں بے اعتنائی وسرد مہری دیکھتے ہوئے سن ۱۹۶۷عیسوی کے پارلیمانی الیکشن میں اس کے خلاف سخت ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ برسرِ اقتدار کانگریس حکومت کی یہ بے پروائی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مجلس مشاورت کے صدر اول جناب ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ نے کانگریس پارٹی کا قدیم لیڈر ہونے کے باوجود یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ ''مسلمانوں نے کانگریس یا کسی اور پارٹی کے نام کوئی خطِ غلامی نہیں لکھ دیا ہے'' قائدین کی زبانی اس طرح کی اعتماد و بے خوفی سے عبارت باتیں سن کر ملکی سطح پر مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور خود حکومت کو ایک دفعہ یقین ہو گیا تھا کہ اب مسلمانوں کو ہلکے میں لینا اور ان کے جذبات و احساسات کے علی الرغم اپنی اسی پرانی پالیسی پر عامل رہنا اس کے لیے خطرے کا الارم ہے۔ مسلمانانِ ہند کی جانب سے حکومت کے سامنے دس نکاتی پروگرام رکھا گیا۔ یہ دراصل دس بڑے بڑے مطالبات تھے، جن کی تکمیل کی بات حکومت سے کہی گئی اور عدمِ تکمیل کی صورت میں مسلمانوں کے اس پارٹی کی حمایت سے دست بردار ہو جانے کا اعلان کیا گیا۔ مجلسِ مشاورت نے اپنے ابتدائی سالوں میں پورے ملک میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی اور حکومت کو اپنا طرزِ عمل وفکر تبدیل کرنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجلس کے عظیم الشان کارناموں کے پیشِ نظر اسے مسلمانانِ ہند میں وہ وقعت و

مقبولیتِ عامہ نصیب ہوئی اور اس کے اراکین ونمائندوں کا ملک میں ہر جگہ اس جوش و خروش کے ساتھ استقبال ہوا، جو تقسیم ہند کے بعد وجود میں آنے والی مسلم تنظیموں میں سے شاید ہی کسی کا نصیبہ بنا ہو؛ مگر بد قسمتی سے یہ مجلس بہت جلد منتشر ہوگئی اور مسلمانانِ ہند کو ایک مرتبہ پھر نا قابلِ تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔مجلس کے وجوہِ انتشار کی داستان تفصیل طلب ہے۔مختصر یہ کہ اسے اول تو اپنے ہی کچھ نادانوں سے نقصان پہنچا، جو دوسری تنظیموں کے نمائندہ تھے اور مجلس کا یہ عوامی وزن اور اس کی ہمہ جہت ترقیات ان سے دیکھی نہیں گئیں اور انہوں نے اس کا شیرازہ منتشر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ان خارجی عوامل سے کہیں زیادہ مجلس کو خود اپنے کارکنان وخدام سے نقصان پہنچا۔سن ۱۹۶۷ عیسوی کے الیکشن میں حکومت کو کس طرح مات دی جائے یا بہ الفاظِ دیگر ایسا کون سا سبق سکھایا جائے کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے معاملے میں اپنی سابقہ غلطیاں دہرانے کی جرأت نہ کر سکے، اس سلسلے میں مجلس کے اراکین دو خیموں میں منقسم ہو گئے۔ایک فریق جن میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدیؒ پیش پیش تھے اور مولانا علی میاںؒ اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم وغیرہ بھی اجمالی طور پر ان کی اس رائے کے مؤید تھے، وہ یہ تھی کہ مجلس کو بہ راہ راست اس الیکشن میں حصہ لینا چاہیے۔جبکہ ایک دوسرا فریق جس میں جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب کا نام بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے، وہ مجلس کے الیکشن میں حصہ لینے اور کانگریس کی مخالفت کرنے کے اس اقدام کے مخالف تھا، پھر وہی ہوا جو ایسے اختلافی مواقع پر ہوتا آیا ہے اور ایسے مواقع کا لازمی و منطقی نتیجہ بھی ہے۔

سن ۱۹۶۷ عیسوی کے الیکشن میں مجلس کے کچھ ارکان نے کانگریس کی علی الاعلان حمایت کی اور دوسرے بعض اراکین نے یوپی میں باضابطہ اپنی نئی پارٹی بنا کر عوام کو اسی کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی دعوت دی اور کانگریس کی پرزور مخالفت

کی مجلس کا یہ انتشار و افتراق آنے والی حکومتوں کے حق میں مفید ہی ثابت ہوا؛ چناں چہ کانگریس کے بعد آنے والی پارٹیوں نے، خواہ وہ جنتا پارٹی ہو یا کوئی اور، مسلمانوں کے بارے میں سب کا سلوک قریب قریب یکساں ہی رہا۔ اس انتشار سے خود مجلس کا وقار و اعتماد مجروح ہوا اور بعد کے سالوں میں اس کا نام ضرور سنائی دیتا رہا مگر اس کی روح اور طاقت یکسر ندارد رہی۔

آل انڈیا ملی کونسل

آل انڈیا ملی کونسل کا خاکہ تیار کرنے والے اور اس کے بانی مبانی اپنے عہد کے جلیل القدر فقیہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ تھے۔ مدت سے ان کے ذہن میں یہ منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کے ملی وملکی مسائل کو مشترکہ طور پر حل کرنے کی کوئی معقول ومناسب شکل قائم ہو اور خاص کر وہ ملی مسائل، جن کا حل عوام سے نہیں؛ بلکہ بہ راہِ راست حکومتِ وقت سے متعلق اور اسی کے ذمہ ہو، تو ایک مضبوط و مستحکم قیادت کے ذریعے حکومت کے سامنے پرزور انداز میں ایسے مسائل کے حل کا مطالبہ رکھا جائے، تاکہ حکومت کو اس قیادت کی بات میں وزن محسوس ہو اور وہ اسے ہلکے میں نہ لے کر عوام کی متحدہ آواز سمجھے اور پھر ان مسائل کے حل کے لیے مناسب اقدامات بھی کرے۔

لکھنؤ کے کسی اجلاس میں شرکت کے موقع سے آپؒ نے مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے سامنے اپنا یہ تخیل ومنصوبہ ظاہر فرمایا۔ مفکر اسلامؒ نے ان کے اس خیال ورائے سے اتفاق ظاہر فرمایا۔ قاضی صاحبؒ نے اس کے لیے پہلا اجلاس دہلی میں طلب کرنے کا ارادہ کیا تھا؛ مگر بعد میں مولانا علی میاں ندویؒ کے مشورے پر

عمل کرتے ہوئے آپؒ نے دہلی کے بجائے ممبئی میں اس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور ۲۳-۲۴ مئی ۱۹۹۲ عیسوی کو ''اتحاد ملت کانفرس'' کے نام سے یہ اجلاس ساحل ہوٹل ممبئی میں منعقد ہوا۔ حسبِ وعدہ مولانا علی میاں ندویؒ تشریف لائے اور آپؒ نے ''ملک و ملت دونوں خطرہ میں'' کے عنوان سے اپنا وقیع مقالہ پیش کیا۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ نے آغازِ اجلاس میں مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم سے کہا کہ سب سے پہلے آپ ایسی تنظیم کی ضرورت واہمیت پر تفصیلی گفتگو کے بعد اس کے قیام کی تجویز پیش کیجیے؛ چناں چہ اس اجلاس میں پہلا بیان حضرت مفتی ہلال صاحب مدظلہم کا ہوا۔ آپ نے حضرت عمرؓ کے اثر کے ان الفاظ "لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الا بإمارة ولا إمارة الا بطاعة'' کی روشنی میں مبسوط خطاب فرمایا اور ایسی تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی، جو بہ طریقِ مذکور ملی مسائل کے حل کا فریضہ سرانجام دے۔ اس تجویز کو بالاتفاق پاس کیا گیا اور اسی اجلاس میں ''ملی کونسل'' اس کا نام رکھا گیا۔ قاضی صاحبؒ کو اس کونسل کا سکریٹری بنایا گیا اور کونسل کے لیے ارا کین وذمہ داران کے انتخاب وتعین کا انہیں کو کلی اختیار دیا گیا۔

یہ اجلاس بڑی خوش گوار فضا میں اپنے اختتام کو پہنچا اور چوں کہ ایسی کسی بھی تنظیم کا قیام اس وقت کے مخصوص حالات میں عوام الناس کے جذبات واحساسات اور ان کے خیالات وتفکرات کے عین مطابق تھا، اس لیے قاضی صاحبؒ اور ان کے رفقائے کار ڈاکٹر منظور عالم صاحب اور حضرت مفتی ہلال صاحب مدظلہم وغیرہ کے اس اقدام کو عوام کی جانب سے بے حد سراہا و پسند کیا گیا اور چند سال کے عرصے میں یہ کونسل ہندوستان کے اطراف واکناف میں مشتہر ومتعارف ہوگئی۔

اس اولین اجلاس کا وہ لمحہ بھی قابلِ ذکر ہے، جب قاضی صاحبؒ نے بیان کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی ہلال صاحب سے حضرت عمرؓ کے اس

اثر کا حوالہ دریافت کیا، جو حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے اس بیان کی اساس و بنیاد تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے (جو قاضی صاحبؒ کے دورِ طالب علمی کے بے تکلف ساتھیوں میں سے ہیں) برجستہ جواب دیا ''قاضی صاحب آپ کا کیا خیال ہے، جہاں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور دیگر بڑے بڑے زعمائے ملت تشریف رکھتے ہوں، وہاں کوئی کچی اور آدھی ادھوری بات کہہ سکتا ہے۔'' اس طرح کے ظریفانہ جملے ادا کرنے کے بعد آپ نے سنن الدارمی سے حوالہ پیش کیا، تو قاضی صاحب خوش بھی ہوئے اور برسرِ محفل آپ کی فقہی وحدیثی مہارت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

مختلف مقامات پر کونسل کے اجلاس ہوتے رہے اور شاید ہی کوئی اجلاس ہوگا، جس میں مفتی صاحب مدظلہم شریک نہ ہوئے ہوں۔ زمانۂ صحت میں پابندی کے ساتھ ہر اجلاس میں آپ کی حاضری رہتی، اجلاس اور کونسل کی اہم میٹنگوں میں زیرِ بحث ملی مسائل پر پورے شرح و بسط کے ساتھ آپ گفتگو فرماتے، متفقہ غور وخوض کے بعد ان کا حل نکالا جاتا، باضابطہ تجاویز منظور کی جاتیں اور پھر پریس کو جاری کی جاتیں۔

ایک دفعہ دہلی میں کونسل کا اجلاس تھا، اجلاس کی پہلی نشست جاری تھی اور دوسری کا وقت بھی نزدیک تھا کہ قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ اور ڈاکٹر منظور عالم صاحب ان دونوں نے مفتی ہلال صاحب سے کہا کہ شام کی مجلس میں ایک اہم تجویز پیش کرنی ہے اور اس کی اب تک ڈرافٹنگ نہیں ہوسکی ہے، تو یہ کام آپ کر لیجیے؟ مفتی صاحب مدظلہم نے یہ کام، جو اچھے خاصے وقت کا طالب تھا، محض پون گھنٹے میں ہی کر لیا اور دو صفحات پر مشتمل تجویز کا متن ان حضرات کے حوالے کر دیا۔

قاضی صاحبؒ اور ڈاکٹر صاحب مدظلہم نے اس کے ملاحظے کے بعد مسرت کا اظہار کیا اور یہ تاثر ظاہر کیا کہ تجویز کا جیسا متن ہمارے پیشِ نظر تھا اور متن کو جن جن

امور و نکات کا حامل و متضمن ہونا چاہیے تھا، ماشاء اللہ بڑی جامعیت کے ساتھ وہ سب چیزیں آپ نے قلم بند کر دیں۔ اس طرح کئی مواقع پر مشکل و دیرطلب امور کا فوری و تشفی بخش حل آپ کے ذریعے طے پایا۔ ملی مسائل پر آپ کے قلم سے نکلنے والے متعدد بیش قیمت مضامین کونسل کے ماہنامے ''ملی اتحاد'' میں شائع ہو کر عوام و خواص کے ان مسائل سے آگاہی و واقفیت کا ایک بڑا ذریعہ بنے اور ملت کے ملی و سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں ان مضامین نے بڑا اہم رول ادا کیا۔

قاضی مجاہد الاسلامؒ کے سانحۂ رحلت کے بعد ملی کونسل بے جان سی ہوگئی اور اس کی وہ سابقہ افادیت کچھ حد تک ہی سہی متاثر ہوئی، کیوں کہ وہی اس کے روحِ رواں اور اس تنظیم و تحریک کی اصل جان تھے اور جن تنظیمی صلاحیتوں سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نوازا تھا اور جو ایک قائدانہ انداز انہیں حاصل تھا، وہ بس انہیں کا حصّہ تھا۔

قاضی صاحبؒ کے انتقال کے بعد سے اب تک مولانا عبداللہ مغیثی اجراڑوی مدظلہم خلیفۂ مجاز مفکرِ اسلام مولانا علی میاں ندویؒ کونسل کے عہدۂ صدارت پر متمکن ہیں؛ جبکہ قاضی صاحبؒ کے دست و باز و سمجھے جانے والے ان کے معتمد رفیق ڈاکٹر منظور عالم صاحب اس کے سکریٹری ہیں۔ مولانا مغیثی صاحب مدظلہم اور ڈاکٹر منظور عالم صاحب کی سربراہی میں کونسل نے کئی قابلِ ذکر کارنامے انجام دیے ہیں۔

مفتی ہلال صاحب پچھلے چند سالوں سے روز افزوں انحطاطِ صحت کی بناء پر اب کونسل کے اجلاس وغیرہ میں شریک نہیں ہو پاتے ہیں، لیکن اس حد تک آپ کا کونسل سے تعلق تادمِ تحریر برقرار ہے کہ کونسل کے ماہنامے کے اہم مضامین و تجاویز کسی خادم سے پڑھوا کر سن لیتے ہیں اور کونسل کے اجلاس یا اس کی میٹنگ کے لیے اپنی رائے لکھوا کر بھیج دیتے ہیں۔

لوک عدالت سنگرور و مالیرکوٹلہ پنجاب

لوک عدالت حکومت کے ماتحت ایک ادارہ ہے، جسے پرسنل لاء اور دیگر کئی معاملات کے حل کا اختیار حاصل ہے۔اس ادارے کی خودمختاری اس حد تک ہے کہ اس کے ذریعے صادر شدہ فیصلے کو کسی دوسری صوبائی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا، اس کا فیصلہ ہی حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے اور فریقین پر اسی کی بجا آوری لازم اور ضروری ہوتی ہے۔اس سے فریقین کو بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں، ایک تو مقدمات پر خرچ ہونے والی خطیر رقم کے بوجھ سے بچ جاتے ہیں اور دوسرے یہ عدالت جلد ہی فیصلہ سنا دیتی ہے، دیگر عدالتوں کی طرح بار بار کے چکروں کا تکلیف دہ و وقت طلب سلسلہ یہاں مطلق نہیں ہوتا۔اس عدالت کے تین ممبر ہوتے ہیں، ایک کوئی مذہبی شخص، دوسرا وکیل اور تیسرا جج اور انھیں کے متفقہ مشورے سے یہاں سے فیصلے جاری ہوتے ہیں اور مسلمان اور دیگر غیر مسلم اقلیتوں کو اپنے اپنے معاملات و نزاعات کے تصفیے کے لیے اس کورٹ سے مراجعت کا یکساں حق حاصل ہے۔

مفتی صاحب مدظلہم کی مذہبی معاملات میں مہارت، تمام فرقوں میں ان کی مقبولیت اور ان کے عظیم منصب کے پیشِ نظر آپ کو اس عدالت کا ممبر نامزد کیا گیا، برسہابرس تک آپ ضلع سنگرور لوک عدالت کے بھی ممبر رہے اور مالیرکوٹلہ لوک عدالت کے بھی۔اللہ تعالیٰ نے اس پلیٹ فارم سے بھی آپ سے بڑی خدمات لیں اور بہت سے مقہور و مظلوم بندگانِ خدا کے حق میں آپ خضرِ راہ ثابت ہوئے۔

اس عدالت کا طریقِ کار یہ رہا کہ اس نے الگ الگ معاملات کے لیے الگ الگ دن مقرر کر دیے تھے، مثلاً یہ کہ فلاں روز صرف وہی معاملات فیصل ہوں گے، جن کا تعلق فیملی و گھریلو معاملات سے ہوگا اور فلاں دن وہ معاملات مسموع ہوں گے

اور وہی فائلیں لی جائیں گی، جن کا تعلق مالی معاملات بینکوں اور لون وغیرہ سے ہوگا،غرض اس طرح جملہ اقلیتوں کی رعایت کے ساتھ مختلف دنوں میں طے شدہ معاملات کا حل اوران سے متعلق فیصلے صادر کیے جاتے تھے۔

مفتی صاحب مدظلہم کواس عدالت کے ذریعے مختلف نئے نئے اورعجیب وغریب تجربات حاصل ہوئے۔مسلمانوں کے اندرونی خوف ناک قسم کے مسائل کا علم و اندازہ ہوا ، یہاں کی مسلم اکثریت چوں کہ دینی تعلیم سے کافی حدتک دور ہے اور بالخصوص آج سے تیں پینتیس سال پہلے جب آپ اس عدالت کے ممبر منتخب ہوئے تھے،اس وقت کی غیر دینی وعلمی فضا اوراس کے بھیانک نتائج کی دل خراش داستان تو رونگٹے کھڑے کردینے والی ہے،اس لیے مفتی صاحب مدظلہم کو بہ یک وقت دومحاذوں پرکام کرنا پڑا۔ایک ان میں دینی تعلیم کے عام کرنے ،انہیں اس کی اہمیت سے واقف کارکرنے اورنسلِ نو کو مدارس میں داخل کرنے پر انہیں راغب وآمادہ کرنے کا کام تھا،اس سلسلے کی آپ کی خدماتِ جلیلہ کا ذکرقدرے تفصیل کے ساتھ گزشتہ صفحات میں ''مدرسہ تعمیرِ سیرت مالیرکوٹلہ'' اور''رسوم و بدعات اورمشرکانہ رسوم وکفریات کے خلاف کامیاب جہاد''جیسے عناوین کے تحت آچکا ہے۔دوسرا کام مسلمانوں کومعاشرتی ، اخلاقی اور مالی کمزوریوں سے نجات دلانے کے لیے ہرممکن کوشش کرنا تھا اور یہ دوسرا کام زیادہ وسیع پیمانے پرآپ نے اسی پلیٹ فارم سے انجام دیا۔

اس لوک عدالت میں غیر مسلموں کے خانگی نزاعات اور دیگر مالی و اخلاقی معاملات بہت کم آتے تھے؛جبکہ مسلمانوں کے داخل ہونے والے مختلف مسائل و معاملات کی شرح ان کے مقابلے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے پرکیس کے واقعات کی کثرت سامنے آئی۔بہتوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے دینی تعلیم سے دوری کی بناپر بینک سے سودی قرض لیا ہوا ہے

اورعسرت وغربت کی وجہ سے گھروں تک کی نیلامی کی نوبت آرہی ہے۔افسوس ناک امر یہ بھی تھا کہ عورتیں ان خرابیوں سے خاص طور پر متاثر اور پریشان تھیں،مگر مردوں کو معاشرتی وخانگی نظام کو بہتر بنانے کی جانب توجہ تھی اور نہ ہی ان بھاری بھرکم سودی رقموں کی ادائیگی ہی کی انہیں کوئی خاص فکرواہتمام تھا۔دیکھا جائے تو مالی،معاشرتی اوراخلاقی ہرلحاظ سے غیرمسلم حضرات اپنوں کی بہ نسبت بہتر حالت میں تھے۔

مفتی صاحب مدظلہم نے اپنی حدتک مکمل کوشش کی کہ مسلمانانِ پنجاب کو ان مصائب سے نجات دلائی جائے؛ چناں چہ بہت سے حضرات کے گھریلو وخاندانی جھگڑے، جو عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کی راہ پر تھے،آپ کی فہمائش سے ختم ہوگئے۔بہت سے حضرات جوسود کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے،آپ نے حکومت کے اعلیٰ افسران سے ان لوگوں کی غربت کا حوالہ دیکر ان کی ساتھ رعایت کرنے اور قرض معاف کرنے کی بات کہی اور اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے مواقع پر آپ اپنی کوششوں میں کامیاب رہے۔

سرپرست ملی کونسل پنجاب

آل انڈیا ملی کونسل کی ذیلی شاخ کے طور پر ملی کونسل پنجاب کا وجودعمل میں آیا تھا۔مفتی صاحب مدظلہم،ماسٹراختر پرویز صاحب ، جناب صدیق صاحب اورکونسل کے دیگر مقامی اراکین وذمہ داران کی مساعیٔ جمیلہ کی بہ دولت یہ ملی کونسل پنجاب حددرجہ سرگرم رہی تھی۔اسلامیہ اسکول کے سامنے باضابطہ اس کا دفتر قائم کیا گیا تھا،جہاں وقفے وقفے سے ملی مسائل پر میٹنگوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔پنجاب جیسے علمی ریگستان میں ملی وسیاسی شعور بیدار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا،یہ مشکل کام اس ملی کونسل سے مربوط ومنسلک احباب نے انجام دیا۔

جب آل انڈیا ملی کونسل کا ملک میں کسی مقام پر اجلاسِ عام ہوتا تھا، تو اس کی کامیابی کے لیے یہ ذیلی ادارہ پنجاب کی سطح پر میٹنگ بلاتا تھا اور پھر یہاں سے بھی کافی لوگ شریکِ اجلاس ہوتے تھے۔

مرکز کی طرف سے اگر کسی شخصیت کی مالیرکوٹلہ تشریف آوری ہوتی تھی، تو ایسے مواقع پر کونسل کی طرف سے اجلاس رکھے جاتے تھے۔

مفتی صاحب مدظلہم اور ماسٹر اختر پرویز صاحب، یہ دونوں عاملہ کے رکن تھے اور زمانۂ صحت میں دونوں ہی بزرگ کونسل کے معاون و مددگار بنے رہے اور شاید ہی مرکزی کونسل یا اس صوبائی کونسل کا کوئی اجلاس یا میٹنگ ایسی ہوگی، جس میں ان حضرات نے شرکت نہ فرمائی ہو۔

غرض ایک طویل عرصے تک یہ صوبائی کونسل مصروفِ کار رہی، آخر یہ تنظیم بھی اختلافات کی نظر ہوگئی۔ مفتی صاحب مدظلہم کی صحت جب تک بہ حال رہی، کسی نا کسی درجہ میں اس کا سفر جاری رہا؛ مگر مفتی صاحب مدظلہم کے سقوطِ صحت کے ساتھ ہی گویا اس کونسل نے بھی اپنا وجود کھو دیا ہے۔ اب نہ آپ کے علاوہ فی الوقت یہاں سے کوئی رکن ہے، نہ دفتر باقی رہا، اور نہ اجلاس اور میٹنگوں میں شرکت کا قصہ رہا۔

سرپرست عثمانی تحقیقی و تصنیفی ادارہ دیوبند

مولانا عامر عثمانیؒ کے برادرِ صغیر جناب فاروق عثمانی صاحب کے پوتے جناب مولانا عبدالرحمٰن عثمانی صاحب اس ادارے کے منتظم ہیں۔ ادارے کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ بزرگانِ دیوبند اور ان میں بالخصوص عثمانی خاندان کی جلیل القدر شخصیات کی علمی و تحقیقی کاوشوں کو یکجا کیا جائے اور انہیں منظرِ عام پر لاکر لائقِ استفادہ بنایا جائے۔

مفتی صاحب مدظلہم کو بزرگ خاندان اور ملک کی شہرۂ آفاق شخصیت ہونے کے

ناتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی عظیم علمی و دینی ہمہ جہت خدمات کے اعتراف میں اس ادارے کا سرپرست منتخب کیا گیا۔ ادارہ ہٰذا نے اپنے سرپرستِ محترم کی زیرِ نگرانی اچھی ترقی کی ہے اور اس وقت بھی اس کی ترقی کا یہ سفر برقرار ہے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عامر عثمانیؒ، شمش نوید عثمانی اور خدا معلوم کتنے ہی بزرگ ہیں، جن پر مولانا عبدالرحمٰن عثمانی اچھا خاصا مواد یکجا کر چکے ہیں، موصوف بڑے باصلاحیت عالمِ دین ہیں اور انھوں نے تصنیف و تحقیق کا بھی بہت اچھا اور صاف ستھرا ذوق پایا ہے۔ وہ اس ادارے سے مختلف عنوانات پر خود اپنی کئی کتابیں چھاپ چکے ہیں اور متعدد اکابر کی علمی کاوشیں بھی اچھی خاصی تعداد میں منظرِ عام پر لائے ہیں۔

مولانا موصوف نے مفتی ہلال عثمانی صاحب مدظلہم کی حیات و خدمات پر بھی کافی مواد اکٹھا کیا ہوا تھا اور چند سال پہلے ''کشکولِ عثمانی'' کے نام سے شائع ہونے والی ان کی کتاب میں حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی شخصیت پر بھی ایک مقالہ شامل ہے۔

امید ہے کہ یہ ادارہ عثمانی خاندان کی مشہور و غیر مشہور تمام ہی شخصیات کو متعارف کرانے اور ان کے وقیع علمی اثاثے کو تحفظ فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ان شاء اللہ

ممبر کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مفتی صاحب مدظلہم تین سال تک مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے تھے۔ اس زمانے میں متعدد علمی و تصنیفی امور میں اشتغال کے باعث آپ یونیورسٹی کے اجلاس اور اس کی میٹنگوں میں زیادہ شریک نہیں ہو سکے؛ تاہم چند ایک مثالی کام اس پلیٹ فارم سے آپ کے ذریعے طے پائے۔

دینیات کا شعبہ اس وقت تک (B.ED) بی ایڈ کے مساوی نہ تھا، جس کی بنا

پر دینیات کے طلبہ کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بی ایڈ کی یہ ڈگری حاصل کرنے کے لیے خواہی نا خواہی مزید چند سالوں کی قربانی دینی پڑتی تھی اور بعضوں کے حالات انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے تھے اور مجبوراً انقطاعِ تعلیم کے واقعات بھی رونما ہو جاتے تھے۔ مفتی ہلال صاحب نے دینیات کی ڈگری کو بی ایڈ کے برابر درجہ دیے جانے کی آواز بڑی قوت کے ساتھ اٹھائی اور اراکین سے سنجیدگی کے ساتھ اس جانب توجہ مبذول کرنے اور طلبہ کو پیش آنے والی دقتوں کا سد باب کرنے کی بات کہی۔ نسیم صاحب نے آپ کی بات سے اتفاق کیا، اس مسئلے کے حل کی یقین دہانی کرائی اور پھر مفتی صاحب مدظلہم اور آپ کے ہم خیال رفقاء کی رائے کے مطابق دینیات کے شعبے کو بی ایڈ کے مساوی قرار دیا گیا اور بی ایڈ کے طالب علم کی طرح دینیات کے طالب علم کے حق میں بھی آگے کے مختلف کورسز میں داخلے کے راستے وا ہوئے۔ دینیات کے طلبہ کو یونیورسٹی کے اس فیصلے سے بے حد وحساب فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

دوسرا کام آپ نے اس دور میں یہ کیا کہ دینیات وغیرہ شعبوں میں علمائے کرام کے تقرر کو منظوری دلوائی اور جناب سعود عالم صاحب کو شعبۂ دینیات کا صدر بنانے میں بھی آپ کی کوششوں کا دخل رہا، اس سب سے دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء سمیت ملک کے متعدد مدارس کے فارغ التحصیل علما کا یونیورسٹی کی طرف رجوع عام ہوا؛ ورنہ پہلے یونیورسٹی کا رخ کرنے والے فارغین کا تناسب کافی کم تھا۔

ممبر پنجاب یونیورسٹی

آپ پنجاب یونیورسٹی کے بھی ممبر رہے، یہاں پر سارے کام پنجابی زبان ہی

میں طے وحل کیے جاتے ہیں۔ اس زبان سے زیادہ واقفیت وانسیت حاصل نہ ہونے کے سبب شروع ہی سے یونیورسٹی کی میٹنگوں میں شرکت وغیرہ پر آپ اپنے کو آمادہ نہ کر سکے اور آپ کا بہت ہی کم وہاں جانا ہوا۔ اسلامیانِ پنجاب کو عصری اداروں میں جن مسائل کا سامنا تھا، ان کے حل و خاتمے کے طور پر آپ نے اپنے اس تعلق کو استعمال کیا۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

فقہ اکیڈمی کوئی محتاجِ تعارف ادارہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کو پیش آمدہ جدید مسائل کے تشفی بخش حل کے حوالے سے یہ ادارہ ملکی و بین الاقوامی سطح پر خوب متعارف ہے۔ اکیڈمی نے نا صرف ہندوستان؛ بلکہ ایشیاء اور دنیا کے مختلف ممالک کے ان اربابِ علم و فضل کے توسط سے اپنے کام کو انجام دیا اور دے رہی ہے، جن کی فقہی عظمت و بصیرت کا زمانہ قائل ہے۔ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم ایسے ذی علم وفضل اکابر کی خدمات وتوجہات اکیڈمی کو ابتدا ہی سے حاصل رہیں۔

اکیڈمی اپنی خدمات کو وقتاً فوقتاً شائع کرتی رہی ہے، اکیڈمی کے سہ ماہی ترجمان ''بحث ونظر'' میں بھی اس کی جزوی کارکردگی پیش کی جاتی رہی ہے اور ابھی حال ہی میں ایک تحریر نظر سے گزری، جس میں اکیڈمی کی طرف سے اپنی تیس سالہ خدمات کو تحریری شکل میں منظرِ عام پر لانے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے، خدا کرے یہ عظیم منصوبہ جلد ہی عمل کی دنیا میں آکر عوام وخواص کے استفادے کا ذریعہ بنے۔

فقہ اکیڈمی کے محرک وبانی قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ اکیڈمی کے سنِ قیام سے لے کر تا دم واپسیں اس کے جنرل سکریٹری رہے اور ابتدائی مجلسِ سرپرستان

میں حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا اسمِ گرامی شامل ہے۔اکیڈمی نے لاتعداد فقہی مسائل پر سیمینار منعقد کیے۔اکیڈمی اپنے مشن پر آج بھی الحمدللہ بڑی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور اپنے موجودہ صدر ذی وقار حضرت الاستاذ بحرالعلوم مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی مدظلہم محدث دارالعلوم دیوبند اور جنرل سکریٹری فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم کی شبانہ روز جہدِ مسلسل کی بہ دولت ترقی کی نت نئی منزلیں طے کر رہی ہے۔یہ دونوں بزرگ علمی دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں، بالخصوص حدیثی دنیا میں اول الذکر کا نام ہی دلیل وسند کے قائم مقام ہے، تو وہیں دوسری طرف ثانی الذکر کو فقہ میں من جانب اللہ وہ درجۂ اختصاص حاصل ہے، جس کی مثالیں اب عالمی سطح پر خال خال ہی نظر آتی ہیں۔یہ بھی بالیقین مفتی ہلال عثمانی، حضرت الاستاذ مولانا اعظمی اور مولانا رحمانی کے اخلاص وللّٰہیت اور ان کے علمی مقامِ بلند کے اعتراف ہی کی بات ہے کہ آج اکیڈمی کی خدمات کا دائرہ مختلف مکاتبِ فکر تک ممتد ہے۔

مفتی ہلال عثمانی صاحب کو قاضی صاحبؒ نے بالکل آغاز ہی میں اکیڈمی کے مخصوص احباب میں شامل فرمالیا تھا۔مفتی صاحب مدظلہم کی علمی شخصیت سے اکیڈمی کے وقار واعتماد میں مزید اضافہ ہوا اور حسبِ توقع فقہی مسائل کے حل میں بھی آپ نے بڑا اہم رول ادا کیا۔

مفتی ہلال صاحب ضعف و نقاہت کے موجودہ دور سے پہلے اکیڈمی کے سیمیناروں کو اپنی حاضری سے برابر مستفید فرماتے رہے اور مقالات کی حد تک شرکت کا معمول تو بحمداللہ اب بھی برقرار ہے۔

۱۷۔۱۸۔۱۹/نومبر ۲۰۱۸ء کو فقہ اکیڈمی کے سیمینار (جسے جامعۃ الہدایہ جے پور میں منعقد ہونا تھا اور بعد میں جسے بعض موانع کی بنا پر جامعہ دارالعلوم محمدیہ میل کھیڑلا،

ضلع بھرت پور راجستھان کی جانب منتقل کردیا گیا تھا) کے لیے آپ نے ایک وقیع فقہی مقالہ قلم بند کرایا۔

سابق امیرِ شریعت و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا نظام الدین صاحبؒ اس طریقِ کار کے سخت مخالف تھے کہ فقہی مسائل کو عام اجلاسات میں مختلف ملی وملکی مسائل کے بارے میں پیش و پاس کی جانے والی تجاویز کی طرح، تجویز کی شکل میں منظوری دی جائے؛ کیوں کہ اس سے فقہی مسائل کے حل کو ایک عام معاملہ سمجھ لیا جائے گا اور خدانا خواستہ قلیل العلم والفہم لوگوں کے ہاتھوں دقتِ نظر و وفورِ علم کے طالب ومتقاضی، اس عظیم کام کے یرغمال ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ مفتی ہلال صاحب مدظلہم کا بھی بعینہ یہی خیال ہے اور آپ بھی اس کے کسی اچھے متبادل کو منظرِ عام پر لانے کے خواہاں ہیں؛ تاکہ فقہی مسائل کو سرسری طور پر منظوری دیے جانے کے اس طرزِ عمل سے نجات مل سکے اور سنجیدہ ماحول میں طویل غور وخوض اور بحث ومباحثے کے بعد ان مسائل کے حل کی کوئی راہ ہم وار ہو۔ بہر حال سابق امیرِ شریعتؒ و مفتی ہلال صاحب مدظلہم کی یہ وقیع رائے اس لیے ذکر کر دی گئی کہ یہ عہدِ حاضر و مستقبل کے اربابِ علم وفضل کے لیے نشانِ راہ اور دعوتِ فکر کا درجہ رکھتی ہے اور اسی میں بہت سے دینی مہلکات ومضرات کا سدِّ باب بھی مضمر ہے؛ ورنہ جہاں تک فقہ اکیڈمی کا تعلق ہے، وہ الحمد للہ ہمیشہ ہی ایسی عجلت بازی اور پیش آمدہ مسائل کے حل کو استخفاف کی راہ پر دھکیلنے والے طرق پر عمل درآمد سے گریزاں رہی ہے، مسائل کے حل واستخراج کے حوالے سے آخری حد تک تحقیق سے کام لیا ہے اور ایسے محتاط اکابر علما و بزرگانِ دین کی سربراہی میں اکیڈمی سے ایسی ہی دادِ تحقیق کی اسلامیانِ عالم کو توقع بھی ہے۔

○❖○

تصنیفات وتالیفات

آپ کو شروع ہی سے تصنیف و تألیف کا ذوق رہا ہے۔دارالعلوم دیوبند کے تدریسی دور کے بالکل آغاز ہی میں تفہیم المسلم شرح اردو مسلم شریف، مسوی، مصفی اور مثنوی پر کام شروع کر دیا تھا۔مختلف علوم وفنون پر ساٹھ سے زائد کتابیں آپ نے لکھیں اور علمی دنیا میں وقعت و عظمت کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔افسوس ہے کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم کو کوئی مستقل معتمد علمی معاون نہ مل سکا؛ ورنہ آپ کی تصانیف کا عدد اس سے کہیں زائد ہوتا۔آپ کی تصنیفات وتالیفات ہوں یا خطوط وخطبات، خالص علمی رنگ لیے ہوئے ہیں اور اسلوبِ بیان ایسا دل آویز اور سادہ وسہل ہے کہ عوام و خواص اور عرب وعجم یکساں مستفید ہوتے ہیں۔

آپ کی تصانیف کے مطالعے کے دوران بے ساختہ یہ احساس سطحِ ذہن پر ابھرتا ہے کہ دل ودماغ مکمل طور پر صاحبِ کتاب کا ساتھ دے رہے ہیں اور متعلقہ موضوع کی جملہ جزئیات کا کتاب میں نہ صرف یہ کہ احاطہ کیا گیا ہے؛ بلکہ اس کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔زبان وقلم پر آپ کی گرفت کا ایک زمانہ قائل ومعترف ہے۔تفہیم المسلم کی تألیف کے وقت آپ کی عمر تیسری دہائی کو بھی عبور نہیں کر سکی تھی؛ بایں ہمہ آپ کی اس تألیف کی اس وقت کے جلیل القدر علما نے سراہنا کی تھی۔دارالعلوم دیوبند و دارالعلوم وقف دیوبند کے سابق شیخ الحدیث اور اپنے عہد کے ایک نامور خطیب ومحدث حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ نے تفہیم المسلم کے بارے میں لکھا کہ ”اردو کا دامن اس طرح کی علمی خدمت کی نظیر اپنے اندر کم ہی پائے گا“۔حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ اور مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ وغیرہ متعدد اکابر علما نے اسے ایک بہت بڑا علمی کارنامہ اور نعمتِ عظمی قرار دیا۔”قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا“۔

آپ کی جملہ تصنیفات وتألیفات کا تفصیلی تعارف ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے، خوفِ طوالت کے پیشِ نظر یہاں آپ کی کتابوں کے مختصر مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) تفسیر روح القرآن

مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ نے ایک زمانے تک دارالعلوم دیوبند میں جلالین کا درس دیا تھا۔ حکیم الاسلامؒ نے بھی جلالین انھیں سے پڑھی تھی، جس کا آپ نے فتاوی دارالعلوم کے شروع میں ذکر فرمایا ہے۔ مفتی صاحبؒ نے جلالین کا اردو ترجمہ کیا تھا اور یہ ترجمہ سلیس وآسان اور جلالین کے مضامین کے فہم میں معین ومددگار تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ نے بایں الفاظ اس کی قدر وقیمت کا اعتراف فرمایا تھا:

> ''یہ ترجمہ جہاں تک بندے نے دیکھا، صحیح پایا۔ واقعی مترجم نے نہایت محنت وجانفشانی سے یہ ترجمہ کیا ہے۔ حق تعالیٰ جزائے خیر دیوے، اس ترجمہ کو قبول فرماوے'' فقط
>
> العبد
>
> محمود حسن عفی عنہ مدرس اول مدرسہ عربیہ اسلامیہ دیوبند

یہ تفسیر دو جلدوں کے کل ۱۲۶۶ صفحات پر مشتمل تھی، جس کے ایک طرف ترچھی لکھائی میں جلالین کی عربی تفسیر ہے اور اس کے سامنے دوسری طرف اس کا اردو ترجمہ ہے اور محمد عنایت خان صاحب کے زیر اہتمام مطبع ریاضِ ہند سے اس کی اشاعت ہوئی تھی۔ بعد کے زمانوں میں یہ تفسیر بالکل نایاب ہوگئی تھی۔ مفتی صاحب مدظلہم نے جب اپنے دادا مرحوم کے حالات پر ایک کتابچہ مرتب کرنے کا ارادہ کیا، تو حالات کی

ترتیب کے دوران یہ بات غالباً پہلی دفعہ آپ کے علم میں آئی کہ ان کے دادا مرحوم نے کسی زمانے میں جلالین کا اردو ترجمہ کیا تھا، چناں چہ آپ نے اس ترجمے کی تلاش و جستجو شروع کی، سب سے زیادہ امید کتب خانہ دارالعلوم سے اس کی دستیابی کی تھی ؛مگر وہاں بھی ہاتھ نہ لگ سکا۔ تلاش وجستجو کا یہ سفر پھر بھی جاری رہا اور اس کے لیے آپ نے ہر اس جگہ حاضری دی، جہاں سے اس کے حاصل ہونے کی کوئی خفیف سی بھی امید تھی، آخر یہ نسخہ آپ کو ایک ایسی جگہ ملا، جہاں سے اس کے حصول کا تصور بھی بہ ظاہر اسباب مستبعد ومحال تھا، ہوا یہ کہ ایک روز آپ کو دارالافتاء مالیر کوٹلہ کے بالکل قریب ہی میں واقع ''مائی عارفاں مسجد'' میں رکھے ہوئے قرآن کریم کے نسخوں میں اس ترجمۂ جلالین کو ڈھونڈنے کا خیال آیا اور بعد نمازِ مغرب جب آپ نے بہ نام خدا مسجد کی اس الماری کا رخ کیا، جس میں قرآن کریم کے مختلف قدیم وجدید نسخے رکھے تھے، تو غیر متوقع طور پر وہ بڑے سائز کے ترجمۂ جلالین کا نسخہ آپ کے ہاتھوں میں تھا، جس کی تلاش میں آپ ایک عرصے سے مصروف تھے، اس موقع پر آپ کو جو خوشی ہوئی ہوگی، اس کی کماحقہ ترجمانی ان کاغذ کے صفحات پر مشکل ہے۔

بہ ہر کیف: ترجمۂ جلالین کا یہ بیش قیمت خزانہ ملتے ہی آپ نے بلاتوقف اس کی از سرِ نو اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور برسہا برس کی محنتِ شاقہ کے بعد اس تفسیر کو از اول تا آخر اپنے قیمتی تفسیری حواشی سے مزین کیا اور پھر یہ تفسیر ''تفسیر روح القرآن مع جلالین'' کے نام سے سات جلدوں میں شائع ہوئی۔

اس تفسیر پر مفتی صاحب مدظلہم کے کام کی نوعیت اور اس کی افادیت واہمیت خود آپ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

''جلالین کا یہ اردو ترجمہ جو حضرت دادا صاحب نے کیا ہے، بڑا سلیس اور رواں دواں ترجمہ ہے اور ایک صدی کے قریب گزر جانے کے باوجود اس کی تازگی میں

کمی معلوم نہیں ہوتی۔اس کی اشاعت ہمارے قدیم تفسیری ورثے کی حفاظت ہی نہیں ہے؛ بلکہ تحت اللفظ ترجمے، بامحاورہ ترجمے اور ترجمانی: ان سب ضرورتوں کو یہ ترجمہ پورا کرتا ہے۔ہم نے پھر یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ قرآن مجید کے متن کے نیچے الگ الگ الفاظ کا ترجمہ اور پھر پورا بامحاورہ ترجمہ دے دیا جائے؛ تاکہ ایک مترجم قرآن کی صورت میں بھی اس سے ہر آدمی فائدہ اٹھا سکے اور اللہ کے کلام کا نکھرا نکھرا یا واضح مطلب پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔

اس کے نیچے تفسیری حواشی اور نوٹس راقم الحروف کے قلم سے ہیں۔میں نے کوشش کی ہے کہ ان حواشی میں قرآن خود جو کہتا ہے وہ بلا کم وکاست سامنے آئے۔اس کے لیے مجھے ''المنتخب فی علوم القرآن'' سے بہت مدد ملی ہے۔یہ منتخب عربی تفسیر مصر کی وزارتِ اوقاف نے علما کی ایک مجلس کے ذریعے تیار کرائی ہے۔ ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں اس کا تیرھواں ایڈیشن چھپا ہے۔اس تفسیر کی خوبی ایک طرف یہ ہے کہ تمام سابقہ اور موجودہ تفسیروں کا بہترین انتخاب اور نچوڑ ہے اور دوسری طرف یہ کسی ایک نقطۂ نظر کی ترجمانی نہیں کرتی۔یہ بڑی مشکل ہے کہ ہم حالات اور ماحول کے تقاضے کے تحت ایک نقطۂ نظر اپنا لیتے ہیں اور پھر اسی نقطۂ نظر سے تعبیر کا لباس پہناتے ہیں۔اگرچہ تقریباً بیس سال سے راقم الحروف تفسیرِ قرآن بیان کرنے میں لگا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے مختلف قدیم وجدید تفسیریں زیرِ مطالعہ رہتی ہیں؛ لیکن اس منتخب تفسیر نے میرے لیے ایک مشکل کام کو کافی حد تک آسان کر دیا''۔

(۲) تفسیر نور القرآن کامل سات جلدیں

اس کا ذکر پیچھے ایک مستقل عنوان ''تفسیر نور القرآن۔ایک عظیم ومثالی خدمت'' کے تحت آچکا ہے۔

(۳) تفہیم المسلم

دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ تدریس میں بعض شائقینِ علمِ حدیث اور طلبائے دارالعلوم کی جانب سے آپ سے مسلم شریف کی کسی جامع اردو شرح وترجمانی کا مطالبہ کیا گیا تھا، جسے آپ باوجود خواہش کے اپنے دیگر تصنیفی وتدریسی مشاغل کی بنا پر پورا نہیں کر سکے تھے، پھر یہ ہوا کہ الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ اسلامی یونیورسٹی) میں داخلے کے بہانے آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور کم وبیش دو سال آپ کا وہاں قیام رہا۔ یہ قیام آپ کے حق میں ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہوا تھا، ایک طرف بار بار روضۃ الرسول ﷺ پر صلاۃ وسلام اور مسجدِ نبوی میں نمازوں کی ادائیگی کے مواقع حاصل تھے، جس کی تمنا وآرزو ہر دلِ مؤمن رکھتا ہے۔ دوسرے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں آپ کے لیے وقت کے جلیل القدر علما و نامور محدثین شیخ شنقیطی، شیخ ناصرالدین البانی، شیخ عطیہ سالم، شیخ عبدالمحسن العباد، شیخ العبودی اور شیخ بن باز سے استفادے کے راستے وا ہوگئے تھے، جو ایک باذوق ہندی عالمِ دین کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھے۔ تیسرے آپ کو اپنے دادا مرحوم کے دست گرفتہ اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شہرۂ آفاق شاگرد صاحبِ فیض الباری حضرت مولانا سید بدرِ عالم میرٹھیؒ کی علمی صحبتیں ومجلسیں خوب خوب میسر آئیں، جو جنۃ البقیع کو مدفن بنانے کے شوق میں ایک زمانے سے مدینہ منورہ میں بابِ مجیدی کے قریب ہی واقع شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے حقیقی برادرِ صغیر مولانا سید محمود صاحبؒ کے مکان میں اقامت پذیر تھے۔

مدینہ منورہ کی پاکیزہ ونورانی فضامیں اور وقت کے رفیع المرتبت وفقید المثال اور علومِ انوری کے امین ووارث حضرت مولانا سید بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ کی شفقت و عنایت کے سایے تلے آپ نے متوکلاً علی اللہ تفہیم المسلم پر کام کا آغاز کر دیا اور مقدمۂ

مسلم کی حد تک آپ نے وہیں کام کیا۔ دارالعلوم دیوبند واپسی کے بعد آپ کے قلم سے کتاب الایمان تک کام پہنچا تھا کہ قضا و قدر کے تحت آپ مالیر کوٹلہ پنجاب چلے آئے اور یہاں کے ہجومِ مشاغل نے آپ کو تفہیم المسلم کے باقی کام کو آگے بڑھانے کی مطلق اجازت نہ دی۔ مجبوراً یہ کام مفتی صاحب مدظلہم کو اپنے حقیقی برادرِ صغیر مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ سابق نائب مفتی دارالعلوم دیوبند کے حوالے کرنا پڑا، چناں چہ کتاب الحج تک کا کام مفتی صاحب مرحوم ہی کی یادگار ہے۔ مفتی نشاط عثمانیؒ کے حادثۂ رحلت کے بعد آپ کی بڑی خواہش رہی کہ یہ کام جس طرح بھی ممکن ہو، پایۂ تکمیل تک پہنچے؛ مگر یہ عظیم علمی منصوبہ آپ کے روز افزوں ضعف و نقاہت کی بنا پر تاہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

تفہیم المسلم یہ صرف عبارت کے ترجمے یا اس کی بہ قدرِ ضرورت توضیح و تشریح پر ہی منحصر نہیں ہے؛ بلکہ اس میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید بدرِ عالم میرٹھیؒ اور حضرت مولانا سید فخر الحسن مرادآبادیؒ کے حدیثی علوم کو سمونے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ تفہیم المسلم کی ترتیب و تالیف کے دوران آپ نے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی فتح الملہم اور علامہ ابراہیم بلیاویؒ کی تقریرِ درس مسلم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مولانا میرٹھیؒ سے استفادے کا دور قیامِ مدینہ کا زمانہ تھا، جن کی زیرِ نگرانی و مشورہ اس کام کا آغاز ہی ہوا تھا۔ شیخ الاسلام کے علوم و افکار کا ایک معتد بہ حصہ تو آپ کو اس پیرانہ سالی میں بھی اس درجہ پختگی کے ساتھ محفوظ ہے کہ جس کی مثال اب ایشیاء بھر میں ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی مل سکے۔ مولانا فخر الحسن مرادآبادیؒ سے آپ نے صحیح مسلم پڑھی تھی اور تفہیم المسلم کا ایک بڑا حصہ ان کی نظر سے گزرا ہے۔ مفتی صاحب مدظلہم لکھتے ہیں:

''جب میں نے مسلم شریف پر ''تفہیم المسلم '' کے نام سے شرح کا سلسلہ شروع کیا، تو میں روزانہ حضرت الاستاذ مولانا سید فخر الحسن مرادآبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور جتنا لکھا ہوتا تھا، اس کو پڑھ کر سناتا تھا اور پھر حضرت کے مشورے سے اس میں کمی زیادتی کرتا تھا''۔

یہی تفہیم المسلم کا امتیاز و اختصاص ہے کہ اس میں حد درجہ کامیابی کے ساتھ اکابر علمائے دیوبند کے حدیثی علوم وافکار کا احصا کیا گیا ہے اور اسی لیے اسے بجا طور پر علمائے دیوبند کے علوم وافکار کی حسین ترجمان کا عنوان دیا گیا۔ اس کتاب کی عظمت وانفرادیت کا اعتراف کرنے والوں میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ اور مولانا ظفیر الدین صاحبؒ مرتب فتاوی دارالعلوم دیوبند کے علاوہ حضرت مولانا شریف حسن صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور ڈاکٹر میر ولی الدین ایم، اے، پی ایچ ڈی، (لندن) بیرسٹر لا اور سابق صدر و پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ڈاکٹر میر ولی الدین جو ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں میں خوب متعارف ہیں اور تحریر وتقریر کی دنیا میں جن کی اردو و انگریزی بہر دو زبانوں پر مہارت بھی عوام و خواص میں مسلم ہے۔ موصوف نے اس علمی کاوش کو وقت کی ایک اہم ترین ضرورت کی تکمیل قرار دیتے ہوئے وہ حقائق رقم کیے ہیں، جو اس کتاب کو دیگر کتابوں کے مقابلے ایک خاص وقعت عطا کرتے ہیں اور عام مصنفین کو اس طریق کار کی تقلید واتباع کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:

''عہد حاضر کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمان اپنے مغربی اساتذہ جنہیں مستشرقین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کے تلامذہ جنہیں مستغربین

کہا جاسکتا ہے کے زیرِ اثر رسالت ہی سے اپنا تعلق قطع کرلیا ہے اور صحتِ احادیث کا انکار کردیا ہے"۔

عہدِ حاضر کے دشمنانِ اسلام کی قرآنی علوم واحادیثِ نبویہ سے بدظنی اور دوری پیدا کردینے کی ناپاک سازشوں اور یہ سب کچھ متجددانہ رنگ ودعوے میں ہونے کی بنا پر شعوری و غیر شعوری طور پر عصری اداروں کے تعلیم یافتہ اشخاص و افراد کے ان سازشوں سے حیرت انگیز و افسوسناک حدتک متأثر ہونے کی داستانِ غم سنانے کے بعد آخر میں رقم طراز ہیں:

"مولانا ہلال عثمانی زمانۂ جدید کے طریقِ تحقیق سے خوب واقف نظر آتے ہیں اور معاندین کی ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی تشریح وتوضیح سے ان کے شکوک وشبہات کے ازالے کی کوشش فرمائی ہے، پہلی شائع شدہ جلد کا بہ امعانِ نظر مطالعہ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرسکتا ہے۔ اردو زبان سے ناواقف مسلمانوں کے لیے بعض یورپی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ جدید تہذیب کے اس ملحدانہ دور میں ہمارے علمائے کرام کا کم از کم انگریزی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے؛ تاکہ معاندینِ اسلام کی زہرفشانی سے واقف ہوکر ان کے ہفوات کی تردید کرسکیں۔ ممکن ہے کہ مؤلف ممدوح کی اس سعی ماجور کا اثر مسلمانوں کے قلوب محسوس کریں"۔

(۴) منتخب فتاوی

پچھلے تقریباً پچاس سال سے آپ کے قلم سے فتاوی نکلتے رہے۔ ان فتاوی کو نقل کرنے کا بھی شروع سے اہتمام رہا، نصف صدی پر محیط آپ کے تمام فتاوی کا صحیح طور

پر اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بدقسمتی سے آپ کے نقولِ فتاوی کے وہ رجسٹر دیمک کی نذر ہو گئے اور اس طرح علمی دنیا ایک خزانۂ عامرہ کو پانے سے محروم رہ گئی۔ مفتی صاحب مدظلہم کے فتاوی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ کی یہ تحریر کافی ہے:

''مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کا فتوی لکھنے کا تقریباً وہی اسلوب ہے، جو ان کے جدامجد مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مفتیٔ اعظم دارالعلوم کا تھا۔ یعنی زبان سادہ، بات واضح، تحریر میں گیرائی و گہرائی اور گہرائی کے ساتھ جامعیت اور مخاطب کی پوری پوری رعایت، مفتی بہ اقوال اختیار کرنا اور اہم بات یہ کہ فتوی میں ''الدین یسر'' کا لحاظ کرتے ہوئے آسان صورت اختیار کرنا۔ مفتی فضیل الرحمٰن اپنے جواب میں حوالوں کے نقل کرنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور حوالوں میں بھی عام طور پر پہلے قرآن مجید کی متعلقہ آیات پھر حدیث اور پھر قولِ فقہاء جس سے ان کا جواب ہر طرح سے مضبوط ہو جاتا ہے اور مخاطب پوری تسلی محسوس کرتا ہے۔ میں نے دیکھا حوالے میں جلد، صفحہ نمبر کے علاوہ وہ عام لوگوں کے لیے حوالوں کی عبارت کا ترجمہ بھی ساتھ دیتے ہیں۔

اب تو خیر ان کے تجربہ کی مدت بھی خاصی ہو گئی ہے جس نے ان کے فتووں میں مزید پختگی اور اعتماد پیدا کر دیا؛ تاہم ان کے فتووں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تجربہ کے علاوہ اس میں خداداد صلاحیت کا دخل کافی ہے''۔

ماہنامہ تعمیرِ سیرت، ماہنامہ دارالسلام اور ماہنامہ ندائے دارالعلوم وقف دیوبند میں شائع شدہ آپ کے فتاوی ان حقائق و امتیازات کا پورے طور پر آئینہ دار ہیں۔

اللہ جزائے خیر عطا فرمائے برادرِ مکرم مفتی عبدالملک صاحب قاسمی فاضل دارالعلوم

دیوبند کو جنھوں نے بڑی محنت ولگن کے ساتھ آپ کے قدیم فائلوں اور مذکور الصدر ماہناموں میں منتشر فتاوی کو یکجا کیا اور پھر تمام فتاوی کو قرآنی، حدیثی اور فقہی جزئیات سے مدلل ومبرہن کیا، جس سے ان فتاوی کی عظمت وافادیت دوچند ہوگئی ہے۔

منتخب فتاوی کے شروع میں ایک وقیع مقدمہ خود صاحبِ فتاوی حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے قلم سے ہے، جس میں فقہ کی عظمت واہمیت اور اس کی وسعت و آفاقیت پر بڑے شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور فقہ کے حوالے سے اپنے مطالعہ کردہ لاتعداد صفحات کے ماحاصل کو بارہ تیرہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔

(۵) اسلامی قانون
نکاح-طلاق-وراثت

ایک عرصہ سے ایسی آوازیں اٹھتی رہی ہیں کہ اسلامی قوانین کو اس طرح کے انداز میں منظرِ عام پر لایا جائے، جس سے ہر طبقۂ خیال کے لوگ بہ آسانی استفادہ کر سکیں اور جس میں بالخصوص ملکی عدالتوں میں داخل مسلم پرسنل لاء سے متعلق مقدمات کی پیروی کرنے والے وکلاء اور مسلم وغیر مسلم جج صاحبان کو پیش آمدہ تکالیف کا کامل و معقول حل پیش کیا گیا ہو۔ یہ کتاب دراصل اسی سلسلے کی ایک کامیاب ترین کوشش ہے، اس میں اسلامی قوانین میں سے فقط تین چیزوں نکاح، طلاق اور وراثت کے احکام ومسائل کو مروجہ قانونی کتابوں کے طرز پر دفعہ وار ترتیب دیا گیا ہے۔

یہ کتاب اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہوئی اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

مولانا نظام الدین صاحب اعظمیؒ سابق مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند نے بلند و بالا الفاظ میں مؤلف دام مجدہ اور ان کی اس تالیف کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

یہ کتاب چوں کہ اپنی نوعیت کی منفرد اور غالباً پہلی ہی کتاب تھی، اس لیے بہ قول مصنف زید مجدہٗ سرکردہ علمائے اسلام نے الحمدللہ اس کاوش کو سراہا، اہلِ علم ودانش کے طبقے نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اردو، انگریزی اور ہندی کے اخبارات میں اس کے اتنے چرچے ہوئے کہ شاید ہی کسی نئی اور خصوصاً مذہبی عنوان پر لکھی گئی کتاب کی ملکی اور قومی سطح کے اخبارات میں اتنی پذیرائی کی گئی ہو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی قانون کی جدید تدوین کا عام احساس پایا جاتا ہے اور یہ وقت کا ایسا تقاضہ ہے جس کو جلد سے جلد پورا کرنے کی ضرورت ہے۔

(۶) میرے قابلِ احترام اساتذۂ کرام

مفتی صاحب مدظلہم کے والد ماجد مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند ایک ولی صفت انسان تھے اور بہت سے اوصاف وخصائل کے لحاظ سے اپنے والدِ ماجد مفتی عزیزالرحمٰن عثمانیؒ مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند کی یادگار تھے، آپؒ نے اپنی اولاد کی تعلیم وترتیب کی طرف پوری پوری توجہ دی تھی اور یہ انھیں کی مساعیِ جمیلہ اور آہِ سحرگاہی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی اولاد تعلیم وتربیت کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہی ہے اور اپنی اپنی جگہ لائقِ رشک دینی خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہے۔

مفتی صاحب مدظلہم اور ان کے برادران کو والد ماجدؒ کی جانب سے بالکل ابتدا ہی میں اپنے اساتذہ کا دلی احترام کرنے کی نصیحت اس درجہ بار بار کی گئی کہ یہ چیز ان کے لوحِ دل پر نقش ہوکر رہ گئی تھی اور پورا گھرانہ بچپن ہی میں اپنے معلمین اور ان کے متعلقین کے ادب واحترام کا اس قدر پختگی کے ساتھ عادی ہوگیا تھا کہ بے احترامی کا وقوع تو بعد کی بات رہی، اس کا تصور تک بھی ناممکن سا ہوگیا تھا۔

مفتی صاحب مدظلہم اس پیرانہ سالی میں اپنے اساتذہ اوران کی اولاد وغیرہ کا ذکرِ خیر جس وارفتگی کے ساتھ کرتے ہیں اور بعض اوقات اساتذہ کی یادوں کے ذکر کے ساتھ ان کی آنکھیں جس طرح اشکبار ہوتی ہیں، یہ سب دراصل اسی بچپن کی نصیحت و تربیت کا ثمرہ ہے۔

آپ کے اساتذہ کو بھی آپ سے بے پناہ عقیدت ومحبت تھی اور ہر استاذ کی یہ مشترکہ خواہش تھی کہ آپ اپنے دادا مرحوم کے واقعی علمی وروحانی جانشین ثابت ہوں۔

مفتی صاحب مدظلہم کے اپنے اساتذہ کے ساتھ پیش آمدہ حالات وواقعات کا یہ کتاب بہترین مرقع ہے، ہر مضمون اپنی جگہ دعوتِ فکر وعمل ہے۔ عصرِ حاضر میں استاذ و شاگرد کے اس مقدس رشتے میں وہ سرگرمی باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کا یہ رشتہ طالب ہے، ایسے میں یہ مختصر سی کتاب معلمین و متعلمین کے زیرِ مطالعہ رہنی چاہیے جس کی ہر سطر اس رشتے کے استحکام پر آمادہ وراغب کرتی ہے۔

مفتی صاحب مدظلہم نے چند سال قبل اپنے اساتذہ کے حالات وخدمات پر ایک تحریری سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی پہلی قسط حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے شروع ہوئی تھی اور یہ سلسلۃ الذہب خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ کے ذکرِ خیر پر منتہی ہوا تھا، جو اس سلسلے کے اختتام کے وقت آپ کے آخری بہ قیدِ حیات استاذ محترم تھے۔

ان مضامین کو ہندو پاک میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تھا اور یہ مضامین ماہنامہ دار العلوم دیوبند، ماہنامہ ترجمانِ دیوبند، ماہنامہ القاسم جامعہ ابوہریرہؓ خالق آباد نوشہرہ پاکستان وغیرہ متعدد رسالوں میں اسی وقت شائع ہوئے تھے۔ جامعہ ابوہریرہؓ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد القیوم صاحب حقانی ان مضامین سے بہ طورِ خاص متاثر تھے اور انھوں نے انھیں مضامین سے متاثر ہوکر ''باکمال اساتذہ نمبر'' کے نام

سے ماہنامہ القاسم کا ضخیم نمبر نکالنے اور اس میں ان تمام مضامین کو جگہ دینے کا ارادہ فرمالیا تھا اور باضابطہ القاسم کے صفحات میں اس کا اعلان بھی کر دیا تھا۔

مفتی ہلال صاحب مدظلہم نے انھیں مضامین کو دو نئے مضامین ''شعبہ فارسی و ریاضی دارالعلوم دیوبند میں میرے اساتذہ'' و ''مدینہ یونیورسٹی میں میرے اساتذہ کرام'' کے اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں شائع فرما کر طلبہ وعلما پر ایک عظیم احسان فرمایا ہے۔

کتاب کے پیشِ لفظ میں مقصدِ کتاب پر آپ نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''اس رسالے کو سامنے لانے میں یہ بھی ایک جذبہ شامل رہا ہے کہ اپنے اکابر کی سیرت کو سامنے رکھ کر ہم انھیں خطوط پر قدم آگے بڑھائیں؛ اس لیے یہ ایک تاریخ بھی ہے، اس زمانے کے ماحول کی عکاسی بھی، اپنے اساتذہ کو خراجِ تحسین بھی اور آنے والی نسلوں کے لیے نصیحت کے کچھ پہلو بھی اس امید کے ساتھ کہ اپنے محترم اساتذہ کے تعلق کے طفیل میں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مغفرت سے ضرور نوازیں گے اور ہمارے عزیز ان چیزوں کو پڑھ کر اس کی اچھی باتیں اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کریں گے''۔

اس کتاب میں آپ کے جن جلیل القدر اساتذہ کا ذکر شامل ہے، ان کے اسمائے گرامی بالترتیب حسبِ ذیل ہیں:

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ
(۲) شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہویؒ
(۳) امام المعقولات والمنقولات حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ
(۴) حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندیؒ
(۵) فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ

(۶) حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندیؒ
(۷) حضرت مولانا سید میاں اختر حسین صاحب دیوبندیؒ
(۸) حضرت مولانا ظہور احمد عثمانی دیوبندیؒ
(۹) حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ
(۱۰) حضرت مولانا علامہ محمد حسن بہاریؒ
(۱۱) حضرت مولانا سید فخر الحسن مرادآبادیؒ
(۱۲) حضرت مولانا محمد جلیل صاحب علوی کیرانویؒ
(۱۳) خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ
(۱۴) حضرت مولانا فیض علی شاہ صاحب پشاوریؒ
(۱۵) شیخ عبدالمنعم النمر مصریؒ
(۱۶) شیخ عبدالعال العبقاویؒ

شعبۂ ریاضی وفارسی کے اساتذہ

(۱۷) قاری محمد احسان صاحبؒ
(۱۸) قاری علاؤالدین صاحبؒ
(۱۹) مولانا ظہیر احمد صاحب جھنجھانوی
(۲۰) مولانا رحم الٰہی صاحب راجوپوریؒ
(۲۱) حاجی عزیز حسین صاحب گنگوہیؒ
(۲۲) ماسٹر احمد حسن صاحبؒ
(۲۳) مولانا سید حسن صاحب دیوبندیؒ
(۲۴) مولانا اصلح الحسینیؒ

(۲۵) مولانا مشفع حسین صاحب دیوبندیؒ
(۲۶) مولانا شمیم صاحب دیوبندیؒ
(۲۷) مولانا فیض محمد جوالا پوریؒ

مدینہ یونیورسٹی کے آپ کے اساتذہ

(۲۸) شیخ شنقیطیؒ
(۲۹) شیخ ناصر الدین البانیؒ
(۳۰) شیخ عطیہ سالمؒ
(۳۱) شیخ عبدالمحسن العبادؒ
(۳۲) شیخ العبودیؒ
(۳۳) شیخ بن بازؒ

(۷) معمارِ انسانیت

سیرتِ نبوی ﷺ پر یہ آپ کی ایک شاہکار کتاب ہے، جس میں بڑے دل نشین انداز میں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ذکر کیا گیا ہے اور عہدِ حاضر کے حالات میں تمامتر شعبہ ہائے حیات میں سیرتِ نبویہ ہماری کیا اور کس طرح رہنمائی کرتی ہے، اس کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، جو اس کی عنداللہ و عندالناس مقبولیت کی دلیل ہے۔

(۸) دین سیکھیے

مفتی صاحب مدظلہم نے یہ بات مجھ سے زبانی بھی بیان کی تھی اور آپ نے اسی

بات کو کتاب کے پیشِ لفظ میں لکھا ہے کہ عمل صالح جس کا واحد یا جمع کی شکل میں قرآن مجید میں بار بار ذکر آیا ہے، یہ دراصل قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ہے، جس میں بہ یک وقت عبادات، معاملات، اخلاق، نظمِ مملکت، معاشرت و معیشت سب شامل ہیں۔ عمل صالح سے صرف کوئی ایک عمل مراد نہیں ہے، جیسا کہ یہ بات بعض ذہنوں میں پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد جس عمل صالح کی بار بار ترغیب و تلقین کی گئی ہے، وہ حقیقت میں تمامتر شریعتِ مطہرہ کو عملی جامہ پہنانے کی دعوت ہے اور اسی کی تعمیل میں جنت و رضوان کا خدائی وعدہ بھی ہے۔

آپ نے اسی مضمون کو حددرجہ جامعیت و تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لیے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ کام ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ آپ کی صحت کمزور ہوگئی اور آپ کے لیے اس کام کو حسبِ خواہش تکمیل تک پہنچانا قریب قریب متعذر ہو گیا تھا؛ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس کام کو آپ ہی کی بعض تصنیفات کے سہارے مکمل کرلیا گیا ہے اور دیگر مصنفین میں سے مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کی کتاب ''اعمالِ صالحہ'' اور مولانا سید بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ کی کتاب ''جواہر الحکم'' سے بھی اس کی ترتیب و تألیف میں کافی حد تک مدد لی گئی ہے، جس سے اس کتاب کی افادیت و نافعیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

(۹) حیاتِ عزیز

یہ مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ کی سوانحِ حیات ہے، جس میں مفتی صاحب مرحوم کے حالات و خدماتِ زندگی کو جزورسی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عثمانی خانوادے کے دیگر مشہور اکابر و علما کا ذکر بھی اس میں شامل ہے۔ کتاب پر شیخ الاسلام

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کی گراں قدر تقریظ اور فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہم کا طویل ومعلومات افزا پیشِ لفظ شامل ہیں۔

(۱۰) جمعہ کی تقریریں

چوبیس متفرق اصلاحی موضوعات پر آپ نے خطبات تحریر فرمائے ہیں۔آپ کا مخصوص علمی وعام فہم انداز اور دقیق سے دقیق مضامین کو آسان تر بنا کر قارئین کے سامنے پیش کرنے کا خداداد ہنر اس تالیف کا بھی خاصہ ہے۔عامۃ المسلمین کے لیے بالعموم اور ائمہ مساجد اور واعظین وخطباء کے لیے بالخصوص یہ ایک حد درجہ مفید کتاب ہے،جس میں قیمتی،نفع بخش اور معلوماتی باتوں کو ہی ذکر کرنے کا التزام کیا گیا ہے اور جذباتی وسطحی باتوں (جن کا تحقق بعض ناقص العلم مقررین کے یہاں ایک عام سی بات ہے) سے کامل اجتناب برتا گیا ہے۔ہر تقریر کے آخر میں چند سوالات ذکر کیے گئے ہیں اور باذوق قارئین کو ان کے جواب کی دعوت دی گئی ہے۔غالباً اس نوعیت کی یہ اولین کوشش ہے،جس کی سراہنا اور اس سے کماحقہ استفادہ ہی اس کی اصل حق شناسی وقدر وقیمت ہے۔

مفتی صاحب مدظلہم اپنی اس علمی کاوش کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے پیشِ لفظ میں رقم طراز ہیں:

> ’’ان تقریروں اور ان سوالات کا مقصد اسلامی معلومات کی فراہمی اور ذہنی تربیت ہے۔خطیبِ مسجد اگر چاہیں تو اس تقریر کو پڑھ کر سنا دیں یا اس تقریر کے موضوع اور مضامین کے مطابق زبانی تقریر فرما دیں اور لوگوں کو متوجہ کر دیں کہ وہ کتاب دیکھ کر سوالات پڑھ لیں اور جوابات بہ ذریعۂ ڈاک یا ای میل ناشر کے پتے پر روانہ کر دیں۔پوری کتاب کے جوابات دینے والوں کو ناشر کی طرف سے ’’معلوماتِ اسلامی‘‘ کی سند دی جائے گی‘‘۔

(۱۱) ایک مجلس کی تین طلاقیں
کیا اصلاح کی گنجائش ہے؟

اس کتاب میں طلاقِ ثلاثہ کے نتیجے میں رونماں ہونے والے سنگین خانگی مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔ مسائلِ طلاق کی توضیح و تفصیل کی حد تک تو ہمارے ملک کے متعدد علماء کبار کی طرف سے کافی کچھ لکھا گیا ہے؛ لیکن طلاقِ ثلاثہ کی وجہ سے بسا اوقات بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ جو حساس مسائل سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں، ان کے حل و اصلاح کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ ضرورت اس کتاب سے پوری ہو سکے گی ان شاء اللہ۔ عام طور پر عوام میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ تین سے کم طلاق ہے ہی نہیں اور وہ اسی غلط فہمی کی بنا پر اول وہلہ ہی میں بہ یک وقت تین طلاق دے بیٹھتے ہیں اور پھر نادم و پشیمان ہوتے ہیں اور حلالے کے نام سے جو قبیح فعل رواج پا چکا ہے، اس کا سہارا لیتے ہیں۔ اس مرض کی طرف توجہ دینے اور حلالے کی آڑ میں جاری اس قبیح عمل کی بیخ کنی کا بھی اس کتاب میں مخلصانہ مشورہ دیا گیا ہے اور اربابِ علم و فضل سے اس بابت وسعتِ فکر و نظر سے کام لینے اور فتاوی میں نئی نئی جائز راہیں نکالنے کی استدعا کی گئی ہے۔

مولانا عبدالرحیم لاجپوریؒ نے طلاق کے حوالے سے اپنے فتاوی ''فتاوی رحیمہ'' میں اچھا خاصا مواد جمع فرمایا ہے۔ اس کتاب کی جمع و ترتیب میں ان فتاوی سے بہ طورِ خاص استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانا لاجپوریؒ جب تک بہ قید حیات تھے، دونوں ہی بزرگوں کے بیچ بڑے خوش گوار مراسم قائم تھے۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی مولانا مرحوم کی وفات تک جاری رہا تھا۔ خدائے کریم مولانا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور مفتی صاحب مدظلہم کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

(۱۲) بندگی اور زندگی

یہ مفتی صاحب کی سب سے پہلی تصنیفی کاوش ہے اور اس کے ساتھ آپ کا ایک جذباتی تعلق ہے۔اس کتاب کی جمع و ترتیب میں مفتی صاحب مدظلہم کو اپنے رفیقِ محترم مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ کی بڑی معاونت حاصل ہوئی تھی۔

سن ۱۹۶۱عیسوی میں یہ کتاب پہلی بار شائع ہوئی اور پھر بعد میں اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔اس دور کے رسائل و جرائد نے کتاب اور صاحبِ کتاب کو بہت بلند الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

چند رسائل کے تبصرے پیشِ خدمت ہیں:

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

ہلال عثمانی دارالعلوم کے فاضل ہیں،علم و فضل ان کا خاندانی ورثہ ہے۔

اپنی اس کتاب میں انہوں نے عبادات اور معاملات کے متعلق اسلام کے صالح نظریات کی ترجمانی بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں کی ہے۔

عقائد و عبادات کے حصّے میں :اسلام و ایمان،مقصدِ زندگی،عبادت کی اصل غایت،عبادت کے مدارج، عبادت اور تہذیبِ اخلاق، نماز، زکوۃ، روزہ، حج اور معاملات کے حصّے میں ایک مسلمان کی روزمرّہ کی زندگی کے فرائض سے بحث کی ہے۔

کتاب دل نشیں اور پڑھنے کے لائق ہے۔ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ کتاب مقبول ہوگی۔

سید محمد ازہر شاہ قیصر

۱ر اکتوبر سن ۱۹۶۱عیسوی

مولانا عامر عثمانی مرحوم جن کے تنقیدی قلم سے بچنا خاصا مشکل کام تھا، وہ اس

کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہلال عثمانی خاندانِ عثمانی کے ایک ذی صلاحیت چشم و چراغ ہیں۔ان کی تحریر میں سلیقہ جھلکتا ہے اور انشاء خاصی جاندار ہے۔

یہ کتاب ان کے دینی مذاق و رجحان کا اچھا نمونہ ہے، اس میں انہوں نے اسلامی عبادات اور اسلامی معاشرے کے ارکان و اجزاء پر مؤثر گفتگو کی ہے۔

ہلکے پھلکے عقلی دلائل کے شمول نے مطالب کو خاصا منقح کر دیا ہے اور طرزِ تحریر عام فہم، دل چسپ اور نکھرا ہوا ہے۔

عام قارئین کو اس کے مطالعے سے دینی فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔

عامر عثمانی

ماہنامہ تجلّی دیوبند

ستمبر سن ۱۹۶۱ عیسوی

اور بھی اس کتاب پر تبصرہ کرنے والے متعدد رسائل ہیں، جن میں سے ہفت روزہ پیامِ مشرق دہلی، ماہنامہ فروغِ اسلام لاہور اور پندرہ روزہ صراط (انگریزی) دہلی کے نام خصوصیت کے ساتھ لائقِ ذکر ہیں۔

(۱۳) دین کا تصور حضرت مجدد کی نگاہ سے

مسلم عہدِ حکومت میں مکتوبات و ملفوظات کے جو مجموعے منظرِ عام پر آئے، ان میں سب سے زیادہ قبولیت مکتوباتِ امام ربانی مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ کو حاصل ہوئی تھی اور آج بھی صدیاں گزر جانے کے باوجود علم و حکمت اور تصوف و معرفت کا یہ خزینہ اہلِ علم و تصوف کے یہاں متاعِ گراں مایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مجددؒ کے مکتوبات کے کل تین دفتر ہیں، جن کے نام بالترتیب حسبِ ذیل ہیں:

دفتر اوّل: دُرُّ المعرفت
دفتر دوم: نور الخلائق
دفتر سوم: معرفۃ الحقائق

ان دفتروں میں فقہ و تفسیر اور سماجی و اصلاحی مضامین سے لے کر سیاست و فلسفہ تک کے تمام علوم و مباحث جمع ہیں اور اندازِ تحریر ایسا جاذب و دل کش ہے کہ ہر طبقۂ خیال کے لوگ ہر دور میں ان سے یکساں طور پر مستفید ہوئے ہیں اور مفتی صاحب کے مطابق مجدد صاحب کی شخصیت کی طرح ان کے خطوط کا یہ عظیم الشان ذخیرہ بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔

حضرت مجددؒ کی حیات ہی میں ان خطوط کی نقلیں ہندوستان اور دیگر کئی ملکوں میں پھیل گئی تھیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے اور ہر جگہ شوق کے ہاتھوں وصول کیے گئے۔ حدیث و تفسیر کی متعدد کتابوں میں ان مکتوبات اور صاحبِ مکتوبات کا حوالہ دیا گیا۔ علامہ سید محمود آلوسیؒ نے اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کے اقتباسات نقل کرنے کا جو غیر معمولی اہتمام فرمایا ہے، اس سے علمی برادری خوب واقف ہے۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ نے حضرت مجددؒ کے منتخب مکتوبات کی روشنی میں سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا اور آپ کے یہ مضامین بالاقساط ماہنامہ ''القاسم'' اور ماہنامہ ''الرشید'' میں چھپے تھے۔ یہ کل حسبِ ذیل چار مضامین تھے:

(۱) شریعت متکفل جمیع سعادات ہے
(۲) مبدأ و معاد
(۳) مکارمِ اخلاق
(۴) چہل حدیث

جہاں تک ان مضامین کی اہمیت و افادیت کی بات ہے تو مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم کا اسمِ گرامی ہی اس کے لیے کافی ہے۔ مفتی صاحب مد ظلہم لکھتے ہیں:

''موصوف نے حضرت مجدد صاحبؒ کے منتخب مکتوبات اردو کے قالب میں اس طرح ڈھالے ہیں کہ اصل مضمون کی لطافت بھی باقی رہے اور ترجمہ، ترجمہ نہ ہو کر اصل کا ذائقہ دے۔ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود امامِ ربانی فارسی کے بجائے اردو زبان میں تحریر فرماتے، تو یہی زبان ہوتی۔ سلاست و روانی میں کہیں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ حضرت مفتی علامؒ نے جا بہ جا ان پر تشریحات کا اضافہ ''احقر کہتا ہے'' کے الفاظ سے فرمایا ہے، جس نے ان مکتوبات کا رنگ کچھ اور نکھار دیا ہے''۔

مفتی صاحب مد ظلہم نے ان تمام مضامین کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، عنوانات قائم کیے، آیات و احادیث کے مکمل حوالے درج کیے ہیں اور عربی و فارسی کی عبارتوں کا آسان ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس طرح اب ان مضامین سے استفادہ بے حد سہل ہو گیا ہے۔ یہ صرف آبا و اجداد کے علمی اثاثے کی حفاظت ہی نہیں ہے؛ بلکہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ پر آپ کا ایک عظیم احسان بھی ہے۔

(۱۴) بیاناتِ عثمانی

مفتی صاحب مد ظلہم کو اپنے آبا و اجداد میں سے سب سے زیادہ مناسبت اپنے دادا مرحوم کے علاتی بھائی اور اپنی نانی مرحومہ زینب معصوم کے حقیقی ماموں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے ہے۔ علامہ اپنے خاندان میں آج بھی ''پھول ابا'' سے جانے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب مد ظلہم کی پیدائش پر ان کے کان میں اذان و اقامت اور تحنیک کے مراحل علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ذریعے طے ہوئے۔ نیز آپ کا یہ نام

''فضیل الرحمٰن'' بھی حضرت علاّمہ ہی کا رکھا ہوا ہے۔تحریر وتقریر کی دنیا میں علامہ کے نام وکام سے شاید ہی کوئی بے خبر ہو۔آپ کا تحریری وتقریری ذوق وشوق بھی اسی باہمی مناسبت کا مظہر ہے۔

مالیر کوٹلہ میں رائج بدعات وخرافات کے سدِّ باب کی غرض سے جہاں آپ نے دیگر اصلاحی خدمات انجام دیں، وہیں دوسری طرف عوامی تقاریر کا سلسلہ جاری کیا، جو الحمدللہ ان بدعات کے خاتمے میں بڑا ممد ومعاون ثابت ہوا۔

پیش لفظ میں آپ نے ایک بڑی قیمتی بات تحریر کی ہے۔لکھتے ہیں:

تقریر ہو یا تحریر، صرف الفاظ کی جادوگری کا نام نہیں ہے۔ان کو جو چیز جاندار بناتی ہے، وہ ہے اخلاص، جب خلوصِ دل سے کوئی بات کہی یا لکھی جاتی ہے، تو اس کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

''از دل خیزد بر دل ریزد''

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

(علامہ اقبالؒ)

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب قاسمی اور برادرم مفتی عبدالملک صاحب قاسمی کو کہ اول الذکر نے ان تقاریر کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کرنے اور پھر انھیں رجسٹر میں نقل کرنے کا کام کیا؛ جبکہ ثانی الذکر نے ان مضامین کی کمپوزنگ اور ان کی جمع وترتیب کی خدمت انجام دی۔

(۱۵) اسلام کے چار تربیتی پروگرام

مفتی صاحب مدظلہم نے کئی سال پہلے رمضان، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ اور حج بیت

اللہ کے نام سے چار الگ الگ رسائل لکھے تھے،جنھیں ہندو پاک میں مؤلف کی امید سے کہیں زیادہ حسنِ قبول عطا ہوا تھا۔ہندوپاک میں ان کی باربار اشاعت ہوئی۔یہ کتاب انھیں چاروں رسائل کا مجموعہ ہے،جس میں ان چاروں اسلامی عبادتوں کے باہمی ربط اور انسانی ماحول ومعاشرے پران عبادات کے مرتب ہونے والے صالح اثرات ونتائج کو بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۶)تصویر قرآن وحدیث کی روشنی میں

عہدِ حاضر میں پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کی بڑھتی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔باطل فرقے و فتنے بھی اسی میڈیا کی راہ سے اپنے کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں،قادیانیت جس کی ایک زندہ وجاوید مثال ہے۔ چند سال قبل دارالعلوم دیوبند کی جانب سے مسجدِ رشید میں ایک ملکی سطح کی کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا،جس کا عنوان غالباً ''تحفظِ سنت کانفرنس'' تھا۔اس عظیم الشان اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وکیلِ احناف حضرت مولانا طاہر حسین صاحب گیاوی دامت برکاتہم نے ایک بات بہ طور مشورہ یہ کہی تھی کہ باطل جن راستوں سے پھیل رہا ہے،ہمیں بھی جواز کے دائرے میں رہ کر انھیں راستوں سے اس کا تعاقب کرنا چاہیے؛ کیونکہ بہ حالاتِ موجودہ اس پر عمل کیے بغیر ان فرقوں وفتنوں کا نتیجہ خیز تعاقب بڑا ہی مشکل امر ہے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم نے قرآن کریم اور کتبِ احادیث میں سے صحیح بخاری،صحیح مسلم،مشکوٰۃ المصابیح،سننِ ترمذی،مسند احمد،ابوداؤد،سننِ ابن ماجہ، سنن النسائی،جمع الفوائد،مسند الطیاسی اور ڈاکٹر جوادعلی کی کتاب المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام کی روشنی میں تصویر کے جواز وعدمِ جواز کے اس حساس اور وقت

کے سلگتے مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور دونوں طرف کے دلائل کو ذکر کیا ہے۔ وجوہ جواز وعدمِ جواز کا بیان بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب درج ذیل تین ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) وہ مجسمے جن میں الوہیت کا تصور پایا جاتا ہے

(۲) وہ تصویریں جن میں الوہیت کا تصور نہیں ہے

(۳) موجودہ دور میں تصویر کا استعمال

پیش لفظ میں حضراتِ اکابر علما سے اس مسئلے پر غور وفکر کرنے کی استدعا کرنے کے بعد اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اپنے قابلِ احترام علمائے کرام اور اربابِ فقہ وفتاوی کی خدمت میں یہ تحریر بہ طور سوال و استفتاء پیش ہے۔ ان کی مثبت یا منفی رائے کو شامل کر کے ہی اس تحریر کو مکمل سمجھا جائے گا''۔

موجودہ دور میں تصویر کا استعمال'' کے تحت آپ کی تحریر اس پوری کتاب کا حاصل ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے اس پوری ہی تحریر کو من وعن نقل کیا جاتا ہے:

> ''آج کے دور میں تصویر اور خاص طور پر متحرک تصویروں سے بہت سے کام لیے جا رہے ہیں مثلاً معلومات، آراء، افکار و مسائل کو بہترین صورت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کام بڑے پیمانے پر لیا جا رہا ہے۔ تصویروں کے ذریعے تعلیم کا کام بھی اس دور میں کافی آسان ہو گیا ہے۔ انسان کی شناخت کا معاملہ ہو یا طالب علم کا مسئلہ۔ تصویر نے سنی سنائی بات کو معاینے کا روپ دے دیا ہے۔ طب کی تعلیم میں ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ انسان کے اندر کی جسم کی تصویر اتارتے ہیں، جس سے مرض کی تشخیص میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

آج کے دور میں تصویر ایسے ہتھیار کی طرح ہے جس سے اچھا کام بھی لیا جاتا ہے اور برا بھی۔ بیشک شیطان نے بھی تصویر سے بھرپور خدمت لی ہے اور لے رہا ہے۔ جنسی بے رہ روی پھیلانے میں آج تصویر کا ایک بڑا کردار ہے؛ لیکن یہ کردار ایسا ہی ہے جیسے سرکشی پیدا کرنے میں دولت اور صحت کا کردار ہوتا ہے۔ جیسے شیطان خدا کی ان نعمتوں سے غلط کام لیتا ہے اور مردِ مومن ان نعمتوں کو پروردگار کی عبادت اور شکر گزاری کے لیے کام میں لاتا ہے۔ تلوار ظالم کے سر پر بھی چلتی ہے اور مظلوم کا سر بھی کاٹتی ہے، قصور تلوار کا نہیں، ہاتھوں کا ہے؛ اس لیے ہم یہ کہیں گے کہ کسی دینی یا اخلاقی خرابی کا جہاں اندیشہ ہو، وہاں تصویر ممنوع ہوگی اور اگر اس سے کوئی اچھا کام لیا جائے، تو اس سے کام لینے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔

قرآن وحدیث اور صحابہ کرامؓ کے فہم وطریق کی روشنی میں غور کرنے کے بعد جو باتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) وہ تصاویر وتماثیل جن میں الوہیت کا تصور پایا جاتا ہے یعنی اہلِ شرک ان کو اپنا معبود سمجھتے ہیں، چاہے وہ جاندار ہوں یا بے جان۔ اسلام ان کو قطعی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، خواہ وہ ہاتھ کی بنی ہوئی ہوں یا کیمرے سے کھینچی گئی ہوں، ان کا بنانا، رکھنا بیچنا، خریدنا قطعی حرام وناجائز ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث سے تفصیل آچکی۔

(۲) جان دار کی وہ تصویریں جن میں الوہیت کا تصور نہیں ہے، ان میں اگرچہ وہ شدت نہیں ہے، مگر ان کو اگر عزت واحترام کی جگہ لگایا جائے تو اندیشہ ہے کہ یہ احترام عبادت تک پہنچ سکتا ہے۔ شرک کی ابتداء اسی طریقہ پر ہوئی ہے، اس لیے ان کو احترام کی جگہ لگانا ناجائز ہوگا۔ رحمت

کے فرشتے بھی اس لیے اس جگہ نہیں آتے؛ کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہے۔ ان کو ڈیکوریشن اور سجاوٹ کے طور پر بھی لگانا ناجائز ہوگا۔ جیسا کہ اور حدیثوں میں آچکا ہے کہ ایسی تصویریں اگر پامال ہوں احترام کی جگہ نہ ہوں، تو گوارا کرلیا گیا ہے۔

(۳) ایسی تصویریں جن سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہوتا ہے، مثلاً عریاں تصویریں، ان کی بھی ممانعت ہوگی۔

(۴) وہ تصویریں جن سے کوئی علمی یا طبی یا انتظامی یا جنگی یا اخلاقی فائدہ، ہو مثلاً اصلاحی اور علمی پروگرام، اسکولوں، فیکٹریوں میں سیکورٹی کے لیے کیمرے، ان کی اجازت ہوگی۔

اب رہا اندیشہ کہ لوگ اس گنجائش سے غلط فائدہ اٹھاسکتے ہیں، تو یہ اندیشہ ہر چیز میں ہوسکتا ہے۔ اسلحہ کا صحیح اور غلط استعمال: دونوں ہوسکتا ہے، غلط استعمال کے اندیشے سے ہتھیار بنانے بند نہیں کیے جاسکتے۔

مناسب ہوگا کہ اہلِ علم وفکر اس پر غور فرما کر شریعت کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔

تصویر کے مسئلے میں مسئلے کی اصل علت شرک ہے؛ اس لیے جن تصویروں میں یہ علت پائی جاتی ہے، ان کی کوئی گنجائش کسی طرح بھی نہیں ہے؛ البتہ وہ تصویریں جن میں شرک تو نہیں ہے، مگر شرک کا اندیشہ ہے، اگر وہ عزت واحترام کی جگہ پر ہوں، ان کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی کہ اس میں شرک نا سہی، مگر شرک کا اندیشہ ہے اور جہاں اندیشہ ہو اور خطرہ ہو، اس راستے سے روکا جاتا ہے۔

اسی طرح وہ مخرب اخلاق تصویریں، جن سے بداخلاقی پھیلنے کا اندیشہ

ہے، مثلاً عریاں تصویریں، ان سے بھی بداخلاقی سے بچانے کے لیے روکا جائے گا؛ کیوں کہ اخلاق وکردار کی حفاظت اسلام کی ذمہ داری ہے۔

اب معاملہ رہ جاتا ہے ان ساکن اور متحرک تصویروں، کا جن میں کوئی نہ کوئی علمی اصلاحی یا اخلاقی فائدہ ہے یا وہ انسانی صحت، مرض کی تشخیص، علاج معالجے کے لیے استعمال ہوتی ہیں، ان تصویروں کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ اس میں وہ علت نہیں ہے جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان کی اجازت پر غور کرنا چاہیے۔

جہاں تجدد ایک نامناسب روش ہے، وہاں تجمد اور جمود بھی قابلِ ستائش نہیں ہے۔

آئین نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

(علامہ اقبال)

واللہ اعلم بالصواب فان کان ماقلت حقا فمن اللہ وان کان ماقلت خطأ فھو منی واستغفر اللہ من شر نفسی والحمدللہ اولا وآخرا۔"

☆ اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے بیسویں فقہی سیمینار منعقدہ ۵-۶-۷/ مارچ ۲۰۱۱ء کے موقع پر تصویر سے متعلق ایک تجویز منظور کی گئی تھی، جس میں حددرجہ جامعیت و اختصار کے ساتھ تصویر کے جائز و ناجائز مواقع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دس نکات پر مشتمل اس تجویز کا متن حسبِ ذیل ہے:

فلم سازی، کارٹون اور ڈرامہ

(۱) غیر ذی روح اشیاء مثلاً تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کی عکس بندی جائز ہے۔

(۲) تفریحی مقاصد کے لیے ذی روح کی عکس بندی جائز نہیں ہے۔

(۳) تعلیمی، اصلاحی اور دعوتی مقاصد کے لیے عکس بندی اور اس سے استفادے کی گنجائش ہے، خواہ اس میں ضمناً ذی روح کا عکس آ گیا ہو۔

(۴) ایسی عکس بندی جن میں کسی عورت کی تصویر ہو یا انبیاء وصحابہ کی تمثیل ہو یا دیگر کوئی شرعی منکر ہو، بنانا اوران کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

(۵) ایسے کارٹون جن میں خدوخال واضح ہوں، وہ تصویر میں شمار ہوکر ناجائز ہیں۔

(۶) ایسا کارٹون بنانا جس سے کسی کی اہانت مقصود ہو جائز نہیں ہے، اگر چہ اس میں خدوخال واضح نہ ہوں۔

(۷) ایسے کارٹون جو عریانیت پر مشتمل ہوں یا برائی کی ترغیب دے رہے ہوں، وہ بھی جائز نہیں ہیں۔

(۸) تربیتی مقصد سے بچوں کے لیے ایسے کارٹون بنانا جن میں خدوخال واضح نہ ہوں اور بچوں کے لیے نفسیاتی، اخلاقی اور لسانی نقطۂ نظر سے مفید ہوں، جائز ہیں۔

(۹) کارٹون سازی کی جو شکلیں جائز ہیں، ان کو ذریعۂ آمدنی بنانے اور اس مقصد کے لیے ملازمت کرنے کی گنجائش ہے۔

(۱۰) اچھے کاموں کی ترغیب اور معاشرے کے مفاسد پر تنقید کے لیے مکالمات اسٹیج کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ اس میں موسیقی یا کسی کی کردارکشی یا مردوزن کا اختلاط یا انبیاء وملائکہ اور صحابہ کی تمثیل نہ ہو، نیز غیر شرعی اور غیر اخلاقی امور سے پاک ہو۔

☆......منصف حیدرآباد کے شمارے یکم اپریل ۲۰۱۶ء مطابق ۲۲ر جمادی الثانی ۱۴۳۷ھ میں ''تعلیمی اغراض کے لیے بنائی گئی مصور CD کی فروخت'' کے زیر عنوان ایک صاحب کا سوال اور فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم کا جواب شائع ہوا

تھا۔ مفتی صاحب مدظلہم نے ''تصویر کتاب وحدیث کی روشنی میں'' نامی کتابچہ بہ طور سوال واستفتاء کے قلم بند کیا تھا اور آپ نے ایک دفعہ دورانِ گفتگو احقر سے فرمایا تھا کہ وہ تصویر کے جواز وعدم جواز کے سلسلے میں شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم کی رائے کو اپنی رائے کے مقابلے فائق وبرتر گردانتے ہیں اور انھیں حضرات کی رائے کی ترجیح کے قائل ہیں؛ اس لیے اب آخر میں سائل کا سوال اور مولانا رحمانی دامت برکاتہم کی جوابی تحریر، دونوں کو ذکر کیا جاتا ہے:

سوال: آج کل اسکول میں پروجیکٹر کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے لیے مصورسی ڈیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ تصویریں نباتات کی بھی ہوتی ہیں اور حیوانات کی بھی اور کبھی کبھی انسان کی بھی، کیا ایسی سی ڈیاں جو تعلیمی اغراض کے لیے تیار کی گئی ہیں، بیچی جاسکتی ہیں؟ (شمیم احمد، ملے پلی)

جواب: ایسی تصویریں جو کپڑے یا کاغذ پر نقش ہوں اور جاندار کی ہوں، ناجائز ہیں؛ لیکن جان دار کی ڈیجیٹل تصویریں جن میں تصویر میں جماؤ نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ متحرک ہوتی ہیں اور اگر اسکرین پر موجود نہ ہوں، تو خود سی ڈی میں اس تصویر کو دیکھا نہیں جاسکتا، ایسی تصویروں کے بارے میں موجودہ دور کے اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے، برصغیر کے ممتاز فقیہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے بہ شمول بہت سے علمائے ہند وپاک اور بیشتر علماء عرب اس کے جائز ہونے کے قائل ہیں، ان کی رائے میں یہ عکس کی طرح ہے، جس میں ٹھہراؤ نہیں ہے، اس قول کے مطابق تعلیمی اغراض کے لیے جاندار کی تصویروں کی گنجائش ہے، بشرطیکہ غیر اخلاقی جذبات کو ابھارنے والی نہ ہوں اور جن چیزوں کو اسکرین سے باہر دیکھنا جائز ہے، اسکرین پر بھی ان کو دیکھا جاسکتا ہے، اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ جان دار کی تصویر کے بجائے الفاظ سے ان باتوں کو سمجھایا جائے، یا ایسی تصویر ہو جس میں سر کا حصہ کٹا ہوا ہو؛ تاہم چوں

کہ آج کل تعلیمی مقاصد کے لیے ان وسائل کا استعمال بہت زیادہ ہونے لگا ہے اور یہ امکان ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مستقبل قریب میں کتابوں کے بجائے ایسے ہی وسائل سے تعلیم دی جائے گی، اس لیے گنجائش کی جو آخری حد ہے وہ یہاں ذکر کردی گئی ہے۔

فقط واللہ اعلم

(خالد سیف اللہ رحمانی)

(۱۷) تحریکِ قادیانیت: ایک فتنہ، ایک سازش

فتنۂ قادیانیت کی اصل حقیقت کو اس کتاب میں شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مفصل مضمون ماہنامہ دارالسلام کی خصوصی اشاعت کے طور پر شائع ہوا تھا۔ بعدہ اس کو کتابی شکل میں چھاپا گیا۔

(۱۸) قرآن مجید اور گرو گرنتھ صاحب۔ مشترک تعلیمات

اس کتاب کی منفرد و عظیم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مذہب اسلام اور سکھ دھرم کی تعلیمات کو تقابلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے بڑے مثبت اور سنجیدہ انداز میں اس کتاب کو لکھا ہے اور بلا کسی نقد وتبصرے کے دونوں مذاہب کی بنیادی و اہم تعلیمات کو بے کم و کاست پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ کتاب کی دوسری نمایاں خوبی یہ ہے کہ سکھ مذہب کے محاسن کے ذکر میں بھی فراخ دلی سے کام لیا گیا ہے، جو دلوں کو ملتفت ومتوجہ کرنے کا ایک نسخۂ کیمیا ہے۔

یہ کتاب دراصل مفتی صاحب مدظلہم کا ایک مبسوط مقالہ ہے، جو آپ نے حیدرآباد کے ایک بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار کے لیے لکھا تھا۔ یہ مقالہ ماہنامہ دارالسلام کی خصوصی اشاعت کے طور پر بھی شائع کیا گیا تھا۔

(۱۹) ملت اسلامیہ کے لیے دعوتِ فکر

اس کتاب میں ''تحریک قادیانیت ایک فتنہ ایک سازش''، ''قرآن مجید اور گرو گرنتھ صاحب مشترک تعلیمات'' اور ''تصویر...قرآن وحدیث کی روشنی میں'' یہ تینوں کتابچے کچھ مفید اضافوں اور جزوی ترمیم کے ساتھ یکجا کر دیے گئے ہیں۔

''تصویر قرآن وحدیث کی روشنی میں'' اس کے آخر میں فقہ اکیڈمی کی تجویز کو جگہ دی گئی ہے، جو مصنف زید مجدہ کے فکر وخیال کی بڑی حد تک مؤید وترجمان ہے۔

''قرآن مجید اور گرو گرنتھ صاحب...مشترک تعلیمات'' کی ابتدا میں حرفِ حکایت کے عنوان سے ایک پرمغز تحریر شامل کی گئی ہے، جسے اس کتاب کی روح قرار دینا بالکل بجا ہوگا۔ دو صفحے کی اس تحریر میں کتاب اور مصنفِ کتاب پر بڑا جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

''تحریک قادیانیت: ایک فتنہ ایک سازش''...اس کتاب میں ''قادیانیت اور مسجد اقصیٰ'' کے نام سے ایک مستقل مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ نیز قادیانیوں کے کفر پر عالمِ اسلام کے علما کے فتاویٰ اور خاص طور پر ان کے کفر پر جو قرارداد رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے پلیٹ فارم سے جاری کی گئی تھی، اس کا اصل متن اور اس کا ترجمہ: یہ سب اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

(۲۰) اسلام، اسلامی فکر اور مکتبۂ فکر دیوبند

اس کتاب میں تین الگ الگ عنوانات پر انتہائی متانت وسنجیدگی کے ساتھ تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرِ ورق پر مرقوم وہ تین عنوانات یہ ہیں:

(۱) قرآن وسنت کی روشنی میں اسلام اور اسلام کے متوازن اور صحیح فکر کی ترجمانی

(۲) مسلک ومشربِ دیوبند کا فکری، عملی اعتدال اور جامعیت
(۳) وحدتِ ملی کی مستحکم راہوں کی نشان دہی

کتاب اپنی نافعیت و اسلوبِ بیان کے لحاظ سے ہر مسلک و مشرب؛ بلکہ غیر مذاہب کے اردو داں حضرات کے لیے بھی یکساں مفید ہے۔ اس کتاب کی وسیع پیمانے پر نشر واشاعت عہدِ حاضر کی ایک واقعی ضرورت ہے، جو بہ یک وقت اسلام سے متعلق کیے جانے والے اعتراضات وشبہات کا تشفی بخش جواب بھی ہے اور مختلف اسلامی فرقوں کو بھی اتحاد واتفاق کی مستحکم راہیں اور طرق دکھاتی ہے۔

چند در چند غلط فہمیوں کی بنا پر دیوبندی مکتبِ فکر پر جو الزامات و اتہامات دیگر مسالک ومکاتبِ فکر کے لوگوں کی جانب سے عائد کیے جاتے ہیں، غیر جانب دارانہ انداز میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور کسی پر نقد کیے بغیر قرآن وحدیث کی روشنی میں مسلکِ دیوبند کی حقانیت وصداقت اور اس کی وسعتِ فکر ونظر کو ذکر کیا گیا ہے۔ حسبِ توقع سنجیدہ طبقے میں اس کتاب نے اچھے نتائج حاصل کیے ہیں اور شکوک وشبہات کے ازالے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

کتاب کے مقدمے میں مصنف زید مجدہ لکھتے ہیں:

> ''اس تحریر کا محرک ''ملی وحدت اور اتحاد کا جذبہ'' ہے۔ راقم کا احساس یہ ہے کہ اتحادِ ملت کا خواب اگر شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے، تو اسی مسلک کی صورت میں ہوسکتا ہے۔
>
> اتحاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ اپنے اپنے مسلک، اپنے اپنے مشرب اور اپنے اپنے مکتبِ فکر کو چھوڑ کر ''دیوبندی'' ہونے کا اعلان کردیں؛ بلکہ اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ ملت کے لوگ یہ سمجھ لیں کہ دیوبندیت ان میں سے کسی کے بھی خلاف نہیں ہے؛ بلکہ اس ذوق ومشرب میں ہر ایک کے

لیے پوری پوری گنجائش اور رعایت موجود ہے یا کم سے کم اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ دیو بندی وہابی ہیں یا بدعتی ہیں۔ ہمارا معیار کتاب وسنت ہے۔ کتاب وسنت کی تعبیر وتفہیم کے لیے اسوۂ رسول ﷺ اور طریقۂ صحابہ ہے۔ صحابہ کرام کے بعد تابعین، تبعِ تابعین، ائمہ مجتہدین، بزرگانِ دین، اولیائے امت میں سے ہر ایک کے مرتبے اور مقام کے مطابق استفادہ کرتے ہوئے کتاب وسنت کے قریب اور زیادہ قریب پہنچ جاتا ہے......... ملت موت وحیات کے جن مسائل سے دوچار ہے، ان میں مسلک ومشرب کی بحثیں مفید نہیں ہوسکتیں اور نہ یہ تحریر بحث کے لیے ہے؛ بلکہ غلط فہمیوں کا پردہ چاک کر کے ملت کو مجتمع کرنے کی ایک حقیر سی کوشش ہے اور درخواست یہ ہے کہ اس تحریر کا مطالعہ اسی جذبے اور نظریے سے کیا جائے''۔

اللہ تعالیٰ مصنفِ کتاب کو دارین کی سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے، انہوں نے اس کتاب کے ذریعے پوری ملت پر احسان کیا ہے۔

(۲۱) درسِ اسلام

اس تصنیف میں انتہائی آسان زبان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، جس سے اوسط درجے کے تعلیم یافتہ مسلمان بچے بھی بہ آسانی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دوسرے اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف کس طرح کرایا جائے؟ غلط فہمیوں و بدگمانیوں کا پردہ کس طرح چاک کیا جائے؟ اور دوریاں ختم کر کے انھیں کس طرح قریب لایا جائے؟۔

اس پہلو سے کم ہی کتابیں لکھی گئیں ہیں اور جو لکھی گئی ہیں، وہ بھی اعتراضات کی

جواب دہی یا اسلام کے دفاع تک محدود ہیں۔مثبت انداز میں برادرانِ وطن کے دل و دماغ تک پہنچنے کی کوشش بہت کم کی گئی ہے، جبکہ ان تک اسلام کی تبلیغ ہمارا فرضِ منصبی ہے اور عہد حاضر کے مخصوص حالات کا مقتضی بھی۔ضرورت ہے کہ اس طرح کی کتب سے استفادہ کیا جائے اور غیر مسلموں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا جامع تعارف کرانے کی بابت مخلصانہ غور کیا جائے اور تا بہ مقدور اس پر عمل کی سعی کی جائے، جس میں فلاحِ دارین کے علاوہ دنیا کے اس بت کدے میں اعدائے اسلام سے ہماری صیانت و حفاظت کا راز بھی مضمر ہے۔قرآن کریم کی آیت "**یاایها الرسول بلغ ماانزل الیك من ربك وان لم تفعل فمابلغت رسالته والله یعصمك من الناس ان الله لا یهدی القوم الکافرین**" میں اسی ذمہ داری کو حد درجہ تاکید کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور ایسا کرنے کی صورت میں خدائی عصمت وحفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

مفتی صاحب مدظلہم نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ:

"دعوت وتبلیغ کے کام کو ہم نے اصلاحِ مسلمین تک محدود رکھا ہے یا دفاعِ اسلام تک حالاں کہ ہماری ذمہ داریاں اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔اگر ہم نے اس ملک میں داعی اور مدعو کے مقام کو پہچانا ہوتا، تو شاید آج اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی اور وہ بہت سے مسائل کھڑے نہ ہوتے، جن سے آج ہم دوچار ہو رہے ہیں۔آج بھی ہمارے مسائل کا حل اگر ہے، تو یہی کہ ہم اپنے آپ کو داعی سمجھ کر ایک ڈاکٹر اور طبیب کی طرح دلسوزی کے ساتھ ان عقائد وفکر کے مریضوں کا علاج کریں۔جس دن ہم دینے والے بن گئے اور ہمارے پاس دینے کے لیے یہ منفرد نظامِ اعتقاد ہی ہے، وہ دن اس ملک کی تاریخ کا سب سے مبارک اور ہمارے لیے کامیابی کا دن ہوگا"۔

(۲۲) سیدھا راستہ

دار السلام کے اہداف ومقاصد میں دین کی دعوت وتبلیغ کے مشن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دار السلام میں اکثر برادرانِ وطن تشریف لاتے رہتے ہیں اور آپ کو بھی ایسے کئی اجتماعات میں بار بار شرکت کے مواقع ملتے رہے ہیں، جن کے شرکا مسلمان کم اور غیر مسلم زیادہ ہوتے تھے۔ اس طرح آپ کو بہت قریب سے ان کی نفسیات، ان کے فکر وفہم اور ان کے سوچنے کے انداز کو سمجھنے ومحسوس کرنے کا اتفاق حاصل ہوا۔

یہ کتاب بھی غیر مسلم برادرانِ وطن ہی کے ذہن کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی ہے اور اس میں بڑے مثبت ومؤثر لہجے میں صراطِ مستقیم کی نشان دہی کی گئی ہے۔

(۲۳) آیئے نماز پڑھیں

درسِ اسلام کے نام سے آپ نے تحریری سلسلہ شروع کیا تھا، یہ کتاب بھی اسی کا حصہ ہے، جس میں احکام نماز کے بیان کے ساتھ، اس کی حکمتوں اور نظامِ دین میں اس کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔

(۲۴) نشانِ بندگی نماز

اس کتاب میں نماز اور اس نظامِ زندگی کے باہمی ربط کو بہت اچھوتے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نماز ہی زندگی وبندگی کا حاصل وخلاصہ ہے اور سائنس کے حوالے سے بہت سی وہ چیزیں ضمناً آگئی ہیں، جن تک عام اذہان کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح آج

کی سائنس تعلیمات وشعائرِ اسلام کی حقانیت کی دلیل و برہان ہے اور یہ کہ سائنس جتنا ترقی کرتی جارہی ہے، اسلام اور شعائر و احکامِ اسلام نماز وغیرہ کی حقانیت و صداقت اسی تناسب سے عام ہوتی جارہی ہے۔ کتاب اس لائق ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچایا جائے اور ملک و بیرونِ ملک کی مختلف زبانوں میں اس کو منتقل کیا جائے۔

غیر مسلموں میں اسلام اور شعائرِ اسلام نماز وغیرہ کا کماحقہ تعارف کرانے میں اسی نوعیت کی کتابیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم۔

(۲۵) اسلام انسانیت کی امانت

درسِ اسلام سے متعلق آپ کی جملہ کتابوں کو اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتابیں ہند و پاک میں بڑے پیمانے پر شائع ہوئی تھیں اور ہر جگہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی تھیں۔

اس کتاب ''اسلام انسانیت کی امانت'' میں نمازِ جمعہ سے متعلق آپ کا ایک رسالہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ کتابیں اپنی موجودہ شکل میں زیادہ مفید اور نفع بخش ثابت ہوں گی۔ انشاءاللہ

مفتی صاحب زید مجدہ یہ بات بہت اہتمام کے ساتھ بیان کیا کرتے ہیں کہ قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کے لیے یہی دین کافی ہے۔ یہ دراصل انسانیت کے لیے اللہ کی امانت ہے، حق یہ ہے کہ یہ سوغات ان لوگوں تک پہنچادی جائے، جن تک یہ امانت نہیں پہنچی ہے۔

(۲۶) اسلامی عقیدے

یہ کتاب مکاتب میں زیرِ تعلیم نرسری جماعت کے طلبہ کے لیے ہے۔

کتاب اگرچہ حد درجہ آسان اور عام فہم زبان اور طلبہ کی ذہنی وفکری سطح کی مکمل رعایت کے ساتھ لکھی گئی ہے؛ تاہم نرسری کے طلبہ کے لیے ازخود اسے پڑھنا ظاہر ہے ناممکن ہے؛ اس لیے مکاتب کے اساتذہ سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اسے آسان زبان میں سمجھادیں اور ہر سبق زبانی یاد کرادیں۔

یہ ایک بہت مفید نصابی کورس ہے، جن مکاتب یا عصری جامعات میں اسے شاملِ نصاب کیا گیا ہے وہاں پر اس کے بہت اچھے اور مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

(۲۷) تعلیم القرآن

اس نام سے دو یا تین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس تحریری سلسلے میں چند اہم امور پر توجہ دی گئی ہے۔ ایک تو اس میں مخارج وصفات کی رعایت کے ساتھ حروف کی ادائیگی کا طریقہ بیان کیا گیا ہے، جس سے کہ حروف شناسی کی منزل ہی میں ایک مبتدی طالب علم میں حروف کی صحیح ادائیگی کا ذوق وشوق پیدا ہو۔ دوسرے ہر حرف کے ساتھ اسی لفظ سے شروع ہونے والا کوئی عربی لفظ اور اس کا معنی ذکر کر دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی اس شئے کی تصویر بھی دے دی گئی ہے؛ تاکہ معنی وتصویر کی وساطت سے اس عربی لفظ کو یاد کرنا بچے کے لیے آسان ہو اور اس طرح وہ عربی کے کئی الفاظ اور ان کے معانی قاعدے کے اختتام تک یاد کر سکے۔ تیسرے لکھنے کی مشق وتمرین کے لیے ایک کاپی بھی دی گئی ہے؛ تاکہ شروع ہی سے لکھنے کا بھی اسے عادی بنایا جا سکے۔

مکاتبِ اسلامیہ اور مسلم عصری اداروں کو اس سلسلے سے وسیع پیمانے پر فائدہ اٹھانا

چاہیے۔ الحمدُ للہ بعض جگہوں پر اس کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے اور یہ اس سلسلے کی مقبولیت ہی کی دلیل ہے کہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۲۸) اسلام از آدم

یہ کتاب درسِ اسلام کے سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر لکھی گئی تھی، جس کا ذکر پیچھے گزرا۔

(۲۹) تاریخی حقائق

یہ چند عبرت آموز حقائق و واقعات ہیں، جو مصنف زید مجدہ کے الفاظ میں اس ملت خوابیدہ کو دعوتِ بیداری دیتے ہیں، جو کبھی تشنگانِ علوم کے لیے سیرابی کا سرچشمہ تھی۔ وہ قوم جس سے غیروں نے اندازِ جہاں بانی سیکھا تھا، آج اپنی بے عملی اور جمود کی بناپر اسیرِ پستی و غلامی ہے۔

(۳۰) دختر کشی کی لعنت اور اس کا حل

اصلاحِ معاشرہ کمیٹی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک میٹنگ میں یہ طے کیا تھا کہ ایسا لٹریچر تیار کیا جائے، جس میں ہندوستان کے بعض خطوں میں جاری انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ عمل ''عورتوں کے بطن ہی میں بچیوں کے قتل'' کے مفاسد و مضرات کو ذکر کیا جائے۔ عورتوں کی عظمت و رفعت کے حوالے سے مذہبِ اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح الفاظ میں ذکر کیا جائے اور مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کر کے ہندو سماج کو اس لعنتی عمل کے سدباب کے لیے راغب و آمادہ کیا جائے؛ تاکہ صرف مسلم معاشرے تک ہی محدود نہ رہ کر یہ کام ملکی معاشرے کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کرے۔

اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے کی مفتی صاحب مدظلہم سے گزارش کی گئی اور آپ نے بہت کم وقت میں یہ گراں قدر رسالہ قلم بند فرمایا۔

(۳۱) شادی مبارک

یہ رسالہ بھی بورڈ ہی کی تحریک پر لکھا گیا تھا، نکاح سے متعلق یہ ایک جامع تحریر ہے، جس میں حسبِ توقع آپ کے قلم سے متعدد اہم باتیں مختصر مختصر جملوں کی شکل میں معرضِ تحریر میں آ گئی ہیں۔

(۳۲) جب رشتہ ٹوٹتا ہے

اس کتاب کا بنیادی مضمون طلاق سے متعلق ہے۔ طلاق کے نقصانات ذکر کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو اس سے حتی الامکان باز رہنے کی تلقین و نصیحت کی گئی ہے؛ لیکن جہاں نباہ کے سارے راستے مسدود نظر آئیں اور ازدواجی زندگی کے شرعی حقوق واحکام کی پامالی کا خطرہ متوقع و متیقن ہو، تو پھر ایسی صورت میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی نظر میں طلاق دینے کا جو محمود و مسنون طریقہ ہے، اس کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

(۳۳) اسلام نے عورت کو کیا دیا؟

اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ، اس رسالے کا موضوع ہے۔

(۳۴) پینا حرام ہے... پلانا حرام ہے

یہ رسالہ شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں سے متعلق ہے۔ کتاب کے شروع میں امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کی گراں قدر تحریر شامل ہے۔

(۳۵) اصلاحِ معاشرہ کے چند اہم گوشے

اصلاحِ معاشرہ کمیٹی آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے مرکزی کنوینر، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے موجودہ جنرل سکریٹری اور خانقاہ رحمانی مونگیر بہار کے سجادہ نشین حضرت مولانا ولی رحمانی صاحب مدظلہم کی درخواست پر آپ نے اصلاحِ معاشرہ سے متعلق چند رسائل تحریر فرمائے تھے، یہ کتاب انھیں رسائل کا مجموعہ ہے۔

کتاب پر مصنفِ کتاب کا قیمتی و معلوماتی پیش لفظ ہے، جس میں اصلاحِ معاشرہ کی اہمیت و ضرورت کو مصنف زید مجدہ نے بہت ہی عمدہ پیرایے میں ذکر کیا ہے، جس کا اندازہ لگانے کے لیے اس کا درج ذیل ایک اقتباس ہی کافی ہے، لکھتے ہیں:

''ہر درخت ہر جگہ پھل نہیں دیتے، کسی درخت کو ٹھنڈی آب و ہوا کی ضرورت پڑتی ہے، وہ وہیں پنپتے ہیں۔ سیب کے لیے کشمیر اور ہماچل کی سرد آب و ہوا کی ضرورت پڑتی ہے۔ آم کا پھل گرم علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں وہ اپنا ذائقہ دکھاتا ہے۔ غرض مناسب آب و ہوا ہر طرح کی پیداوار کے لیے ایک لازمی حصّہ ہے۔

یہی معاملہ نیکیوں کا بھی ہے۔ نیکی کی نشو و نما، اس کے پروان چڑھنے اور ترقی کے لیے ایک مناسب آب و ہوا، ماحول اور فضا کی ضرورت ہے؛ اس لیے اگر معاشرہ اچھا نہ ہو، تو نیکیوں کو پنپنے کا موقع نہیں ملتا۔ برے معاشرے میں برائیاں سر اٹھاتی ہیں، خوب پھلتی پھولتی ہیں، گناہ کرنا آسان ہو جاتا ہے اور نیکی پر چلنا مشکل، جبکہ صاف ستھرے معاشرے میں نیکی کرنا آسان ہوتا ہے اور بدی کرنا مشکل''۔

ایک دوسری جگہ حضرات علمائے کرام سے ان الفاظ میں مخاطب ہیں:

''سیکولرازم کے نام پر مملکتوں کے جو نظام قبولیت حاصل کر رہے ہیں، ان میں اخلاقیات کا باب نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان حکومتوں کی گراوٹ کی انتہا ہے کہ ہمارے ملک کی عدالت ''ہم جنسی'' کو قانونی شکل دے کر ایک فیصلہ کرتی ہے، تو ہماری سیکولر جمہوری حکومت، اس کے خلاف اپیل کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

ان حالات میں یہ کام مسلم علما کی ایک بڑی ذمہ داری بن گئی ہے کہ وہ اپنی بساط کی حد تک معاشرے کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں، نیکیوں کے فروغ دینے کی جدوجہد کریں اور اپنی زبان اور طرزِ عمل سے منکرات کو روکنے کی کوشش کریں''۔

اس کتاب میں شامل رسائل (شادی مبارک، جب رشتہ ٹوٹتا ہے، دختر کشی کی لعنت اور اس کا حل، اسلام نے عورت کو کیا دیا اور پینا حرام ہے... پلانا حرام ہے) اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، مراٹھی، ملیالم، تیلگو، بنگالی اور کنٹر زبان میں ترجمہ ہوکر بورڈ کے پلیٹ فارم سے بڑی تعداد میں شائع ہوئے۔

(۳۶) مسلم پرسنل لاء اور یکساں سول کوڈ

مفتی صاحب مدظلہم نے مسلم پرسنل لا اور یکساں سول کوڈ کے عنوان سے مضامین لکھے تھے اور اسی موضوع پر آپ کا ایک مفصل انٹر یو انڈین ایکس پریس ۲۱رمئی ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ان سب مضامین کا حاصل پرسنل لا کی معقولیت اور یکساں سول کوڈ کی معقولیت ہے۔ مصنف زید مجدہ کو یقین کی حد تک اپنی اس بات پر اصرار و اعتماد ہے کہ یکساں سول کوڈ کبھی بھی مسلم پرسنل لا کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ کتاب آپ کے انھیں مضامین اور انٹر یو کا مجموعہ ہے۔

(۳۷) فقیہ اعظم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ

(۳۸) وہ بندۂ مولیٰ صفات

(۳۹) مولانا سعید احمد اکبر آبادی

دادا مرحوم، والد ماجد مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا اکبر آبادیؒ پر آپ نے مفصل مضامین لکھے تھے، جو اولاً علحدہ رسائل کی شکل میں شائع ہوئے تھے اور بعد میں ان رسائل کو آپ کی دیگر تالیفات کا حصہ بنا دیا گیا۔

(۴۰) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

ایک شخصیت، ایک عہد، ایک تاریخ

حکیم الاسلامؒ کی شخصیت پر لکھے گئے مقالات و کتب میں اس کتاب کا ایک منفرد مقام ہے۔ اس میں حکیم الاسلامؒ کے بہت سے وہ نقوشِ زندگی اور حالاتِ طیبہ ذکر کیے گئے ہیں، جن کا علم رکھنے والے کم ہی لوگ ہیں، اس کتاب کی وساطت سے بہت سی نادر و نایاب معلومات سینے سے سفینے پر منتقل ہوگئی ہیں۔

یاد رہے کہ حکیم الاسلامؒ آپ کے مرشدِ اول تھے اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ آپ کی عملی و فکری زندگی نے سب سے زیادہ انھی کے فیضِ صحبت سے جلا پائی تھی۔ عقیدت و محبت کے اوجِ کمال پر فائز ہونے کے باوصف مصنف کے قلم نے اعتدال کا دامن تھامے رکھا ہے۔ مضامین و مندرجات کی اہمیت وافادیت کے علاوہ کتاب اپنے اسلوب و انداز کے اعتبار سے بھی اس درجہ دل کش ہے کہ قاری کو مکمل پڑھے بغیر سیری نہیں ہوتی۔

(۴۱) مجموعہ میزان الصرف بحاشیہ اردو و اضافاتِ جدیدہ

(۴۲)تعلیل الصرف

(۴۳)مبادی الصرف

(۴۴)المطالعۃ العزیزۃ

(۴۵)تعلیم الصرف

(۴۶)معلم الصرف

(۴۷)تبویب الصرف

(۴۸) معلم النحو

ان میں سے ایک آدھ کتاب کے علاوہ باقی کتابیں سوال وجواب کے انداز میں ہیں اور ابتدائی عربی درجات میں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں کو طلبہ کے ناپختہ ذہن سے قریب کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ یہ کتابیں آپ کے قلم سے دارالعلوم دیوبند کے تدریسی عہد میں نکلیں اور خوب پسند کی گئیں۔ یہ کتابیں میزان الصرف، منشعب، پنج گنج اور نحو میر جیسی کتابوں کا نعم البدل ہیں اور عصر حاضر میں فارسی زبان کے تئیں عدم دلچسپی کے ماحول میں اردو زبان میں ہونے کے باوجود ان کی افادیت اصل فارسی کتب سے بڑھ کر ہے۔ دوسرے یہ کہ ان میں قواعد کی تفہیم وتشریح کے لیے کئی مثالیں ذکر کی گئی ہیں، جبکہ اصل فارسی وعربی کتب میں کم مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے اور پھر سوال و جواب کے انداز نے نفسِ مضمون کی تفہیم کو بڑی حد تک آسان بنا دیا ہے۔

سلسلۂ عربی نصابِ جدید کے زیرِ عنوان آپ نے یہ کتابیں لکھیں۔ اکابر علما نے اس سلسلے کو پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا تھا اور اسے وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی جانب ایک مثبت اور نفع بخش قدم قرار دیا تھا۔

زمانۂ طالب علمی کے آپ کے رفیق اور اپنے عہد کے شہرۂ آفاق ادیب مولانا

وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانویؒ سابق استاذِ ادب عربی و مدیر مجلّہ عربی ''دعوۃ الحق'' دارالعلوم دیوبند نے مبادی الصرف کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے اس سلسلے کی جملہ کتب کی بابت ان کا تاثر سمجھنا چاہیے۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ رقم طراز ہیں:

ہندوستان کے مدارسِ عربیہ میں عام طور پر طبائع سہولت پسندی کی جانب مائل ہو رہی ہیں، دقیق اور مشکل نصابِ تعلیم سے جو تحقیق اور تدقیق مطلوب تھی، اسے اردو شروح وحواشی نے یکسر ختم کر دیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ یا تو قدیم نصابِ تعلیم کو سابقہ اسلوب اور ٹھوس علمی استعداد کے ساتھ پڑھا اور پڑھایا جائے یا پھر اس کی جگہ رعایتِ زمانہ اور سہولتِ طبائع کا خیال کرتے ہوئے نئی کتابیں تیار کی جائیں، جو مدارس عربیہ کے لیے بھی مفید ہوں اور دیگر شائقینِ عربی کے لیے بھی دل کشی کا باعث ہوں۔

اس سلسلے میں فاضل دوست مولانا ہلال صاحب عثمانی مدرس دارالعلوم دیوبند لائق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور مبادی الصرف لکھ کر اس سلسلے کا آغاز کر دیا ہے۔

یہ کتاب فی الحقیقت میزان الصرف فارسی کا نعم البدل ہے، زبان آسان، پیرایۂ بیان دل نشیں ہونے کے علاوہ فن صرف کی خشکی کارآمد مثالوں کے ذریعے دور کر دی گئی ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب موجودہ دور میں فارسی میزان الصرف کے بجائے زیادہ مفید ثابت ہوگی اور مدارسِ عربیہ کے نصاب میں اسے مناسب جگہ دے کر مؤلف کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

وحید الزماں

۲ر صفر ۱۳۸۸ ہجری

مولانا کیرانویؒ کے علاوہ اس سلسلے کی سراہنا کرنے والے متعدد اربابِ علم وفضل

میں آپ کے اساذ محترم حضرت مولانا محمد رحم الٰہی صاحبؒ سابق مدرس دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دارالعلوم دیوبند کے نام بھی شامل ہیں۔

(۴۹)مسوی

(۵۰)مصفی

(۵۱)مثنوی

دارالعلوم دیوبند کے تدریسی دور کے بالکل آغاز ہی میں آپ نے ان تینوں کتابوں پر تحقیق و تعلیق کا کام کیا۔علامہ ابراہیم بلیاویؒ اس کام کے دوران آپ کے بہ طورِخاص مشیر رہے اور کئی مواقع پر علمی مشکلات کا حل علامہ بلیاویؒ ہی کے ذریعے طے پایا۔

(۵۲)نصائحِ فارسی (حلِّ لغات)

(۵۳)مصادرِ فارسی

ابوالفرح مولانا حبیب اللہ سلطانپوریؒ سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ فارسی دانی کے حوالے سے ملک گیر شہرت رکھتے تھے۔انہوں نے معینِ فارسی، دروسِ فارسی اور نصائحِ فارسی کے نام سے فارسی کا ایک جدید کورس تیار کیا تھا اور اور یہ فارسی نصابِ جدید خوب مقبول ہوا تھا۔

مفتی ہلال صاحب مدظلہم نے نصائحِ فارسی حل لغات اور مصادرِ فارسی کے نام سے اس مفید کورس میں دو مزید نئی فارسی کتب کا اضافہ کیا اور ان دونوں کو اپنے ذاتی مکتبہ کتب خانہ محمودیہ دیوبند سے شائع کیا۔

مصادرِ فارسی میں مختلف مصادر کے ذریعے قواعدِ فارسی کی تمرین کا اہتمام کیا گیا ہے اور نصائح فارسی پر حلِّ لغات کا کام کیا گیا ہے، جس سے اصل کتاب کی اہمیت و افادیت دوچند ہوگئی ہے۔

(۵۴) بوستاں اردو حاشیہ

یہ اردو حاشیہ فیصل پبلیکیشنز دیوبند کے منتظمین کی فرمائش پر لکھا گیا، نیز گلستاں اردو حاشیے کے محرک بھی اسی مکتبے کے مالکان ہوئے۔

(۵۵) گلستاں اردو حاشیہ

کتاب کے شروع میں آپ کے قلم سے پیشِ لفظ ہے، جس میں شیخ شرف الدین سعدی شیرازی کی حیات و خدمات کا مختصر مگر جامع تذکرہ کیا گیا ہے۔ پیشِ لفظ کے آخر میں آپ لکھتے ہیں:

> ''میں نے گلستاں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید حسن دیوبندیؒ سے پڑھی تھی، جس درس گاہ میں یہ کتاب پڑھی تھی، اسی درس گاہ میں دس بارہ سال تک پڑھائی بھی۔ اس کتاب سے ایک والہانہ وابستگی رہی اور اس کا اسلوب و انداز میرے لیے ہمیشہ باعثِ کشش رہا۔
> مجھے خوشی ہے کہ اس کا اردو حاشیہ لکھ کر ایک ادنیٰ سی خدمت کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے''۔

(۵۶) رہنمائے فارسی

مفتی اعظم پاکستان و صاحبِ تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ

کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحبؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند نے فارسی قواعد کا ایک ابتدائی رسالہ ''رسالہ نادر شرح صفوۃ المصادر'' کے نام سے مرتب فرمایا تھا، یہ کتاب ''رہنمائے فارسی'' سوال و جواب کے انداز میں اسی رسالے کی تسہیل اور کامیاب ترجمانی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر رہنمائے فارسی یہ رسالہ نادر ہی کی جدید شکل ہے، جس میں ضروری اور مفید اضافوں کے ساتھ فارسی قواعد کو عام فہم زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔

(۵۷) خطبات ومقالاتِ عثمانی

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے خطبات پر مشتمل یہ کتاب پہلے پہل خطباتِ عثمانی کے نام سے چھپی تھی۔ خطبات کے علاوہ آپؒ کے کچھ نہایت اہم مضامین بھی تھے جنھیں مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے اپنے ذاتی مکتبے سے ''مقالات'' کے نام سے شائع کیا تھا۔

مفتی فضیل الرحمٰن صاحب زیدمجدہ نے اس کتاب میں ان تمام خطبات و مقالات کو جمع فرما دیا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ عثمانیؒ کے کچھ مقالات آپ کے پاس ایسے بھی تھے، جو ہندوستان میں شاید کبھی نہیں چھپے تھے اور بالکل نایاب سے ہوگئے تھے، آپ نے وہ مضامین بھی اس کتاب میں شامل کر دیے ہیں، اب یہ علمی ذخیرہ ''خطبات ومقالاتِ عثمانی'' کے نام سے بہت جلد منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

(۵۸) قوانین الارث فی الاسلام

آپ کی ایک اہم کتاب ''اسلامی قانون'' ہے، اس میں ایک مستقل باب وراثت کے احکام ومسائل سے متعلق ہے۔ ''قوانین الارث فی الاسلام'' اسی باب کا عربی ترجمہ ہے۔

(۵۹) سر آمد روزگارے ایں فقیرے

یہ آپ کی خودنوشت سوانح عمری ہے، جس میں آپ نے اپنی حیات کے اہم واقعات کو قلم بند کرایا ہے۔ اس کتاب کو آپ کے معاون ماسٹر عبدالوحید صاحب نے املا کیا ہے۔

مفتی صاحب مدظلہم کے حکم و ایما پر اس سوانح کی پروف ریڈنگ کا شرف عاجز راقم الحروف کو حاصل ہوا۔ یہ کتاب ابھی مسودے کی شکل میں ہے اور پینسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ کچھ اضافہ جات کے ساتھ اس کی اشاعت کا جلد ہی فیصلہ کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

(۶۰) بالقلم (مجموعۂ مضامین)

مختلف عنوانات وموضوعات پر لکھے گئے آپ کے مضامین کی دو جلدیں ''بالقلم'' کے نام سے ان شاء اللہ جلد ہی شائع ہوں گی۔ ان تمام مضامین کو حسبِ موضوع جگہ دی گئی ہے، یہ مضامین جو آپ کے دارالعلوم دیوبند کے تدریسی دور سے لے کر اب تک ملک و بیرونِ ملک کے متعدد رسائل و جرائد میں چھپے تھے، پہلی بار کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ مفتی صاحب مدظلہم کی آخری بڑی آرزوؤں میں سے ایک آرزو ''خطبات و مقالاتِ عثمانی'' اور ''بالقلم'' کی طباعت و اشاعت بھی ہے۔ خدا کرے آپ کی حیات ہی میں یہ انمول علمی خزینہ شائع ہوکر افادۂ عام کا ذریعہ بنے۔

(۶۱) الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ یونیورسٹی)

آپ تقریباً دو سال تک جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی میں طالب علم رہے

تھے۔اس کتابچے میں آپ نے جامعہ اسلامیہ کی تاریخ اور اپنے وہاں کے اساتذہ کے حالات وخدمات کوذکر کیا ہے،نیز مدینہ منورہ کے زمانۂ قیام میں جدہ ریڈیو پر آپ نے تقاریر کی تھیں،ان میں سے ایک تقریر جامعہ اسلامیہ سے متعلق تھی،اسے بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔یہ کتابچہ سب سے پہلے جامعہ ہی کی جانب سے شائع کیا گیا تھا اور مدینہ منورہ میں مقیم ایشیاء کے اردوداں طبقے میں اس کا خاطر خواہ استقبال ہوا تھا۔

(٦٢) نبیِّ رحمت کا پیامِ رحمت

مولانا رضوان القاسمیؒ نے اپنے قائم فرمودہ ادارے دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے زیرِ اہتمام سیرۃ النبی ﷺ پر خطبات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔جس کے لیے انہوں نے سب سے پہلے سال مولانا عبداللہ عباس صاحب ندویؒ معتمدِ تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دعوت دی اور مولانا موصوف کے سیرتِ نبوی ﷺ پر سات خطبات ہوئے اور پھر یہ خطبات ''پیغمبرِ اخلاق وانسانیت'' کے نام سے شائع بھی ہوئے۔دوسرے سال مولانا مرحوم نے مفتی فضیل الرحمٰن ہلال صاحب مدظلہم سے بہ حیثیت مہمانِ خصوصی سیرت النبی ﷺ کے اجلاس میں تشریف لانے اور ملکی و بین الاقوامی سطح کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ''نبیِّ رحمت کا پیامِ رحمت'' کے عنوان سے پانچ روزہ خطبات پیش کرنے کی گزارش کی تھی،جسے آپ نے شرفِ قبول بخشا اور پھر عوام وخواص کے ایک بڑے مجمع سے آپ کے بڑے ہی اہم اور پرمغز متواتر پانچ خطاب ہوئے،جن میں سے پانچ تقاریر اندرا پریہ درشنی ہال،باغ عامہ،نامپلی میں ہوئیں؛جبکہ آخری خطاب دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں ہوا۔

خطبات کے عنوانات درج ذیل ہیں:

پہلا خطبہ:-نبیِّ رحمت ﷺ......عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت

دوسرا خطبہ:-نبیؐ رحمت ﷺ......کیا ان کے بغیر انسانیت منزلِ نجات پاسکتی ہے
تیسرا خطبہ:-نبیؐ رحمت ﷺ کی تعلیم وتربیت میں توازن اور حسنِ اعتدال
چوتھا خطبہ:-نبیؐ رحمت ﷺ کے پیام میں دلسوزی، دردمندی، عالمِ انسانیت کی ہم دردی
پانچواں خطبہ:-نبیؐ رحمت ﷺ کا پیام، کامل اور دائمی پیام

خطبات اور صاحبِ خطبات کو مولانا رضوان القاسمیؒ نے بہت بلند الفاظ میں سراہا ہے اور ان کی توقع کے مطابق ''پیغمبرِ اخلاق وانسانیت'' کی طرح مفتی صاحب مدظلہم کے مجموعۂ خطبات ''نبیؐ رحمت کا پیامِ رحمت'' کو بھی علمی دنیا میں خوب پذیرائی ملی اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

○❖○

معمولات ومشاغل

زمانۂ طالب علمی کے یادگاری واقعات اورعہدِ بچپن وجوانی کے آپ کے چند اہم معمولات

مفتی صاحب مدظلہم اور ان کے برادرِ صغیر مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ سابق نائب مفتی دارالعلوم دیوبند کو خاندانی روایت کے مطابق صغرِ سنی ہی میں بہ غرضِ تعلیم محلّے کے مکتب میں داخل کیا گیا، اس وقت آپ کی عمر پانچ چھ سال رہی ہوگی۔ تعلیم کی بسم اللہ مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے خلیفۂ ارشد اور مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ کے شیخ و مرشد حضرت الحاج عارف باللہ قاری اسحاق صاحب میرٹھیؒ کے ہاتھوں ہوئی۔

جس مکتب میں آپ کی اور آپ کے برادرِ مرحوم کی تعلیم کا آغاز ہوا، یہ مکتب تیلیوں کے محلّہ میں واقع تھا اور جناب ضیاء الحق صاحب خان بہادر کی جگہ پر ان کے حسبِ ایما بنا ہوا تھا۔ استاذ قاری محمد احسان صاحبؒ تھے۔ یہاں آپ نے قرآن کریم کا کچھ حصّہ پڑھا اور اردو کی ''آسان نماز'' نامی کتاب پڑھی۔ بعدہ آپ دونوں بھائیوں کو دارالعلوم دیوبند کے درجۂ ناظرہ قرآن میں داخل کرایا گیا۔ دارالعلوم میں قاری علاؤالدین صاحبؒ ناظرہ قرآن کے استاذ رہے۔ کچھ حصّہ ناظرہ قرآن کا آپ نے اپنے والدِ ماجدؒ سے بھی پڑھا۔

ناظرہ قرآن کی تکمیل کے بعد آپ کو حفظِ قرآن کی درس گاہ میں منتقل کیا گیا۔ حفظ شروع کرنے کے بعد سے آپ وقفے وقفے سے بیمار رہنے لگے، تو قاری اسحاق صاحب میرٹھیؒ کے یہ کہنے پر کہ ''بچہ زیادہ کمزور ہے، حفظِ قرآن کے بجائے اس کو اردو، فارسی وعربی کی تعلیم پر لگا دیا جائے'' حفظِ قرآن کے سلسلے کو موقوف کرکے شعبۂ اردو دینیات میں بٹھایا گیا۔ اردو کی تیسری یا چوتھی جماعت کے سال والدِ ماجد نے فارسی تعلیم دلوانے کا ارادہ فرمایا۔

اس دور میں فارسی کی تعلیم کے لیے پانچ سالہ نصاب تھا۔ یہ بڑا ہی اہم اور قابلِ قدر نصاب تھا، جس سے اردو، فارسی اور ریاضی وغیرہ علوم میں طالب علم کی استعداد کافی پختہ ہوجایا کرتی تھی اور عربی زبان میں مہارتِ تامہ کی راہیں ہموار ہوجایا کرتی تھیں۔ مفتی صاحب مدظلہم چوں کہ اپنے والد صاحب اور اپنے دیگر اساتذہ کے یہاں زیرِ تعلیم رہ کر اردو، ریاضی اور فارسی زبان پہلے ہی سے کافی حد تک سیکھ چکے تھے؛ اس لیے آپ کے فارسی کے تیسرے یا چوتھے سال کی جماعت میں داخلے کو منظوری دی گئی اور دو یا ڈھائی سال کے عرصے میں آپ دارالعلوم کے فارسی کے نصابِ تعلیم سے فارغ ہوگئے۔

دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا خورشید عالم صاحب عثمانیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند اور مولانا حسیب صدیقی دیوبندیؒ منیجر مسلم فنڈ دیوبند ابتدا سے انتہا تک آپ کے درسی ساتھی رہے۔ فارسی کے ساتھیوں میں مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے مرحوم رضی عثمانی صاحب اور قاری کامل صاحب کے صاحبزادگان حافظ محمد فاضل صاحب، حافظ بدرالاسلام صاحب، جناب اخلاق صاحب اور فضل کریم صاحب کے نام شامل ہیں۔ مولانا عبدالرزاق صاحب مدظلہم امیرِ شریعت بھوپال، مہتمم جامعہ اسلامیہ تاج المساجد بھوپال اور نائب صدر جمعیۃ علمائے ہند، ہدایہ کے رفقاء میں ہیں، ہدایہ ان حضرات نے مولانا اختر حسین صاحب دیوبندیؒ کے پاس پڑھی تھی۔ ایک جگہ آپ لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ تھی، ہدایہ میں میرے ہم سبق مولانا عبدالرزاق خاں صاحب بھوپالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے جو کہ اب الحمدللہ بھوپال کے امیرِ شریعت، وہاں کے مفتیٔ اعظم اور جمعیۃ العلماء ہند بھوپال کے صدر ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو حضرت مولانا سید میاں اختر

حسین صاحب کے درس کے واقعات شروع ہو گئے ایک سے دوسرا، دوسرے سے تیسرا، سلسلہ جڑتا گیا، حضرت میاں صاحب کی باتیں ہوتی رہیں اور پتہ نہیں کس وقت رات کی چادر آدھے سے زیادہ سرک گئی۔

ذکر جب چھڑ جاتا ہے ان کا
زباں ہوتی نہیں دو دو پہر بند

یہ طالب علمی کی باتیں ایسی لذیذ حکایتیں ہوتی ہیں کہ جب ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو سلسلہ طویل ہو جاتا ہے۔ گھڑی پر نظر پڑی تو رات آدھے سے زیادہ گزر چکی تھی، ہم دونوں نے کہا کہ اب تو تہجد کی چند رکعتیں پڑھ کر حضرت الاستاذ کو ایصالِ ثواب کا تحفہ پیش کر دیا جائے۔ یہ ہمارے محسن تھے، جن کے احسانوں سے ہم ہمیشہ گراں بار رہیں گے، جن کی جوتیوں کے صدقے میں پروردگار نے عزت کی دولت دی ہے، دین کی خدمت کا کچھ نہ کچھ جذبہ دیا ہے، جن کی تربیت کی وجہ سے آج ہمیں یہ فکر ملی ہے کہ ہم کسی کو کچھ فائدہ پہنچا سکیں۔ دراصل یہ وہ چراغ تھے، جن سے ہزاروں چراغ روشن ہوئے، جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے''۔

دورۂ حدیث کے سال کے آپ کے ساتھیوں میں مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ اور عارف باللہ حضرت مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری مدظلہم شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے نام بھی شامل ہیں۔

مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ، مولانا خورشید عالم صاحب عثمانی دیوبندیؒ، حضرت مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری مدظلہم اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم، یہ سبھی حضرات کتبِ درسیہ کے تکرار کے معاملے میں ہم سبق طلبہ کے درمیان ہمیشہ ہی معروف رہے۔ مفتی صاحب مدظلہم درس گاہ میں بھی تکرار کے لیے بیٹھا کرتے تھے

اور رات کے وقت تکرار کا عمل اکثر و بیشتر مولانا خورشید عالم صاحبؒ کے گھر پر انجام پاتا تھا۔

اپنے استاذ حضرت مولانا ظہور عالم صاحب عثمانیؒ کی شخصیت پر اپنی تاثراتی تحریر میں ایک جگہ آپ تکرار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تینوں (مولانا خورشید عالم صاحبؒ، مولانا حسیب صدیقی صاحبؒ اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم۔م،ع،ج) اکثر تکرار کے لیے اکٹھے ہوتے تھے اور زیادہ تر مولانا خورشید عالم صاحبؒ کے مکان کی بیٹھک میں مغرب بعد یا عشاء بعد تکرار کرتے تھے۔

اس زمانے میں گھروں میں بجلی نہیں تھی۔ لالٹین کی روشنی ہوتی تھی اور گرمی کے زمانے میں باہر چبوترے پر بیٹھ جاتے تھے۔

برابر کے کمرے میں مولانا ظہور احمد صاحبؒ زیادہ تر مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ اگر ہمارے تکرار کی آواز تھوڑی دیر کے لیے بند ہو جاتی، تو فوراً برابر کے کمرے سے آواز آتی:

''خورشید!...... کیا ہو رہا ہے؟''

استعمال یائے معروف کے بجائے یائے مجہول کا ہوتا تھا۔ یعنی خورشید کے بجائے خورشَید اور ایک ہی آواز ایسی ہوتی تھی کہ ہوش و حواس گم ہو جاتے تھے''۔

زمانۂ طالب علمی کے بالکل ابتدا میں آپ کے والدِ ماجدؒ نے آپ کو کتابت کی مشق و تمرین خود ہی شروع کرادی تھی۔ والد ماجدؒ اچھے خوش نویس تھے۔ پھر جب مفتی صاحب مدظلہم کچھ آگے بڑھے، تو آپ کو باضابطہ منشی محبوب کریم صاحبؒ کی شاگردی میں دے دیا گیا، جو دارالعلوم کے شعبۂ خوش خطی کے کامیاب اساتذہ میں

سے ایک تھے؛ چناں چہ ایک مدت تک آپ منشی صاحب سے اصلاح لیتے رہے اور چند ہی سال بعد آپ نے کتابت کا کام شروع فرما دیا تھا۔ رسالہ ''الہادی'' میں شائع ہونے والے اشتہارات کی کتابت کا کام زیادہ تر آپ ہی کے حوالے کر دیا جاتا تھا؛ اس لیے اس کام کے تئیں آپ کی دل چسپی میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

رسالہ ''الہادی'' سید محبوب رضویؒ مرتب ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' اور جمیل مہدیؒ کی زیرِ ادارت نکلتا تھا۔ ''عید کے کپڑے'' کے عنوان سے معنون آپ کا سب سے پہلا مضمون اسی رسالے میں چھپا تھا۔ اس مضمون کی کتابت آپ نے خود کی تھی۔ آپ نے اس دور میں اپنی کچھ کتابوں کی کتابت خود ہی کی اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا ابتدائی کچھ حصہ بھی آپ ہی کا کتابت کردہ ہے۔

سچ ہے انسان کے فولادی عزم وارادے کے آگے بڑے سے بڑے پہاڑ گرد ہو جاتے ہیں۔ آپ کی یہ ترقی خالصتاً آپ کی جہدِ مسلسل اور کامل دل چسپی ہی کی دین ہے؛ ورنہ ابتدا میں ایسے مراحل سے آپ کو سابقہ پڑا، جو تقریباً ہر کامیاب انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں، بلکہ جن کا پیش آنا ایک طرح سے یقینی ہوتا ہے۔

آپ کی دلچسپی کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ بالکل نوعمری ہی میں بورڈ پر اور مکان کی خالی دیواروں پر چاک سے اور وہ اگر میسر نہ ہو تو کوئلے سے لکھتے رہتے تھے۔ مدینہ منورہ کے زمانۂ قیام میں ایک بڑا پرلطف واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ آپ جس راستے سے مسجد نبوی تشریف لے جایا کرتے تھے، اسی راستے پر ایک گلی میں مکان کی دیوار پر ایک بلیک بورڈ لگا ہوا تھا، جس پر ایک عربی پابندیٔ وقت کے ساتھ ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتے تھے اور بورڈ کے نمایاں مقام پر آویزاں ہونے کی وجہ سے ہر گزرنے والے کی اس پر نظر پڑ جاتی تھی۔ آپ نے ان عربی صاحب کو بارہا لکھتے ہوئے دیکھا اور کتابت سے قدیم رشتہ ہونے کے

باعث خود بھی کچھ لکھنے کا جذبہ انگڑائی لیتا رہا۔ یہ صاحب زیادہ تر آیت، حدیث یا کسی اہم حکمت و نصیحت پر مبنی عربی کے جملے لکھا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی ایک آدھ سطر فارسی رسم الخط میں بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ایک روز حسبِ معمول جب وہ صاحب لکھنے کے لیے وہاں حاضر تھے اور عین اسی وقت آپ بھی وہاں سے گزر رہے تھے، تو آپ نے ہمت کر کے اپنے دل کی بات ان سے کہہ ہی دی کہ اگر اجازت ہو، تو وہ بھی کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ان عربی صاحب نے کہا: **ھل انت تعلم الکتابۃ** اور جب آپ نے جواب میں نعم کہا، تو ان صاحب نے بلا توقف چاک آپ کے ہاتھ میں تھما دی۔ مفتی صاحب مدظلہم نے ایک ہی منٹ میں شاندار وعمدہ کتابت کے ساتھ عربی کا کوئی نصیحت آمیز جملہ تحریر فرما دیا۔ ایک عجمی عالم کی یہ کتابت اور مزید براں ہاتھ کی حد درجہ صفائی وتیزی، ان کے لیے بہت ہی بڑا خوش کن تجربہ تھا، بے حد خوش ہوئے اور پچاس ریال بہ طورِ انعام آپ کی خدمت میں پیش کیے۔

مالیر کوٹلہ آمد کے بعد بھی ایک زمانے تک آپ کا یہ معمول کسی نہ کسی حد تک جاری رہا۔

زمانۂ طالب علمی میں آپ نے جلد سازی کا کام بھی سیکھا اور کچھ عرصے تک اسے کیا بھی۔ چمڑے کی جلد بنانے کا کام کافی نازک اور مشکل سمجھا جاتا ہے، آپ نے اسے بھی سیکھا، فارغ اوقات کا کچھ حصہ آپ نے اس کام کے لیے مختص کر رکھا تھا اور مناسب قیمت پر شاندار جلد سازی کا' کام کافی مشہور بھی ہو گیا تھا، مگر آپ نے جلد ہی اس کام کو چھوڑ دیا تھا۔

جلد سازی کے دور میں ایک بڑا عجیب واقعہ یہ ہوا کہ چمڑے کی جلد کا کام سیکھنے کے بعد آپ نے سب سے پہلے اپنے رفیقِ درس مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند کی آٹھ دس کتابوں کی چمڑے کی جلدیں بنائیں۔ گو بہت

محنت سے آپ نے اپنے رفیق کا کام کیا تھا اور کتابوں کی بہت مضبوط جلد سازی کی تھی، مگر ایک بھول یہ ہوئی کہ بیان القرآن کے شروع میں غلطی سے بجائے پہلے پارے کے تیسواں پارہ لگ گیا اور تیسویں کی جگہ پہلا پارہ اور جلد سازی کے عمل سے فراغت کے بعد ذہن اس نقص کی طرف ملتفت ہوا۔

مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے، اس واقعے پر کوئی بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے، بلکہ الٹا اپنے رفیق کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہا کہ آپ کی جلد سازی نہایت عمدہ اور جاذب ہے، ایک آدھ پارے کی ترتیب اگر معکوس ہوگئی، تو کیا حرج ہے اور پوری قیمت ادا کی۔

عصر کے بعد آپ کا کھیلنے کا معمول تھا۔ آپ کو بچپن سے ہاکی کے کھیل کا شوق تھا۔ مدرسہ اصغریہ کے پیچھے ایک بڑا تالاب تھا اور اس کے سامنے ''دوبہ'' کے نام سے ایک بہت بڑا میدان تھا، اسی میدان میں آپ اپنے رفقا کے ساتھ ہاکی کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ آپ کی باضابطہ ایک ٹیم تھی، جس میں کل بارہ تیرہ ساتھی تھے۔ آپ کی اس ٹیم کے بعض رفقاء کے نام یہ ہیں:

مولانا احمد خضر شاہ کشمیری مدظلہم کے سسر مرحوم جناب محمد سلیم صاحبؒ

جناب محمد فردوس صاحبؒ

جناب ارشاد عثمانی صاحب

جناب محمد اکبر صاحب

والد ماجدؒ بھی کھیل کے معاملے میں آپ کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کھیلنا چاہیے، اس سے صحت بنتی ہے۔ سیال کوٹ پاکستان کی ہاکی کا اس دور میں بہت شہرہ تھا، والد ماجدؒ نے وہاں سے آپ کے لیے ہاکیاں منگوائیں اور ہرطرح ورزش و کھیل کی جانب آپ کی خاطر خواہ توجہ دہی کا ذریعہ بنے رہے۔ مفتی

کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی صاحبؒ کو کوئی دوسرا کھیل پسند تھا، وہ ہاکی کے بجائے ہر روز اپنا وہی کھیل کھیلا کرتے تھے۔

اس دور میں بجلی نہیں تھی، گھروں میں روشنی کا کام لالٹین سے لیا جاتا تھا۔ والد ماجدؒ کے حکم پر گھر کی لالٹین صاف کرنا، ان میں مٹی کا تیل ڈالنا، بتی اگر بڑھی ہوئی ہو، تو اسے کاٹنا اور مغرب کا وقت ہوتے ہی لالٹین کو اپنی جگہ پر رکھنا، یہ آپ اور آپ کے برادرِ صغیر مفتی نشاط عثمانیؒ کے ذمے تھا۔ اس ذمہ داری کی انجام دہی کے سلسلے میں بہ قول مفتی صاحب مدظلہم کبھی کبھار ہم دونوں بھائیوں کے بیچ تفریح آمیز واقعات بھی پیش آجایا کرتے تھے۔ آپ کو عمر کے اس آخری حصے میں اپنے مرحوم بھائی کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے اور جب کبھی ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے، تو محبت بھری یادوں کا ذکر آپ کی آنکھیں اشک بار کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔

مغرب کے بعد دونوں بھائیوں کو اپنا سبق یاد کرنا ہوتا تھا اور اس کے بعد ہی کھانا ملتا تھا۔

عشاء کے بعد سونے سے پہلے ایک اہم معمول یہ تھا کہ آپ سب بھائی اپنی نانی مرحومہ زینب معصوم کے ساتھ تعلیمی تاش کھیلا کرتے تھے۔ یہ کھیل کیا تھا ایک طرح کی تعلیم گاہ تھی۔ بہت سے اردو الفاظ معنی سمیت یاد کرنا اور ان کی املا لکھنا، اس کھیل کا لازمی حصہ تھے۔ آپ کی نانی مرحومہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی بھانجی تھی اور اپنے ماموں سے سنے ہوئے متعدد واقعات انھیں خوب یاد تھے اور دیگر بزرگوں کے بھی اچھے خاصے واقعات ان کے خانۂ ذہن میں محفوظ تھے۔ اس تعلیمی تاش کے دوران اردو کے الفاظ و معانی سننے سنانے اور ان کی املا کے ساتھ یہ واقعات بھی وہ اپنے نواسوں کو سناتی رہتی تھیں۔ اس دور کے کئی واقعات آپ نے اپنے خطبات میں نانی مرحومہ کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔

زمانۂ تدریس کے معمولات ومشاغل اور

دارالعلوم دیوبند میں آپ کی مدرسی کا یادگاری واقعہ

اوائلِ عمر ہی میں آپ کا تدریسی سفر شروع ہو گیا تھا اور اس کا آغاز بھی بڑا اہم اور یادگاری واقعہ ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے نواسے اور مفتی صاحب مدظلہم کے بچپن کے رفیق جناب حامد اللہ غازی صاحب زیدمجدہ سابق لیکچرار جامعہ ملیہ دہلی وحال مقیم امریکہ کو اپنے رفیق کی دارالعلوم سے فراغت کا علم ہوا، تو وہ آپ کو بہ اصرار دہلی لے گئے اور جامعہ ملیہ دہلی میں گیارہویں کلاس میں آپ کا داخلہ کرا دیا۔ ایک دو مہینے کے بعد مفتی صاحب مدظلہم ضروری سامان اور دستاویزات وغیرہ لانے کی غرض سے دیوبند تشریف لائے۔

مفتی صاحب مدظلہم چند سال وہاں رہ کر انگریزی تعلیم میں مہارت حاصل کرنے کے خواہاں تھے اور آپ کا یہ فیصلہ اس لحاظ سے قابلِ قدر تھا کہ عہدِ حاضر میں وسیع پیمانے پر علمی ودینی خدمات کی انجام دہی کے لیے ایسا ہی کرنا ناگزیر ہے اور وہی لوگ عالمِ انسانیت کے حق میں زیادہ نفع بخش ثابت ہوئے ہیں اور ہورہے ہیں، جن کی تحریراً وتقریراً زبانِ انگریزی پر مضبوط گرفت ہے اور پھر وسیع وعمیق اور مسلسل مطالعے کے بعد وہ اس کے بھرپور استعمال پر عمل پیرا ہیں۔

مفتی صاحب مدظلہم جامعہ ملیہ دہلی واپسی کی تیاری کر ہی چکے تھے اور کچھ ضروری امور سے فراغت کے بعد سفرِ دہلی پر روانہ ہونے کا تہیہ کیے ہوئے تھے کہ خلافِ توقع دارالعلوم دیوبند کی تدریس کی دعوت آپ کو دی گئی۔

تدریس کی دعوت دینے والے خود مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تھے۔قاری صاحبؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر چند ماہ بعد اپنے استاذِ محترم فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے صاحبزادگان کے گھر تشریف لے جایا کرتے تھے۔حسبِ معمول آپؒ مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے یہاں تشریف لے گئے اور حسنِ اتفاق سے مفتی صاحب مدظلہم ایک دو ماہ کے بعد دہلی سے انھیں دنوں گھر آئے ہوئے تھے۔ بہ وقت ملاقات آپؒ مفتی صاحب مدظلہم سے فرمانے لگے کہ میاں ہلال آج کل آپ کی کیا مصروفیت ہے؟ مفتی صاحب مدظلہم نے جامعہ ملیہ میں داخلے کا واقعہ سنایا۔قاری صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ کل سے دارالعلوم میں پڑھانا شروع کردیجیے۔

مفتی صاحب مدظلہم نے چند عذر بھی پیش کیے،ایک یہ کہ میں ابھی کچھ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔قاری صاحبؒ نے فرمایا کہ ہاں انگریزی کی تعلیم وتحصیل بھی بے حد ضروری ہے،مگر یہ کام تو فارغ اوقات میں بھی ہوسکتا ہے اور آدمی ہمیشہ طالب علم ہی رہتا ہے، ابھی تو ہم خود بھی اپنے کو طالب علم ہی سمجھتے ہیں۔ یہ انگریزی تعلیم کا کام ان شاء اللہ فارغ وقت میں ہوتا رہے گا۔جب یہ عذر نہ چل سکا،تو آپ نے دوسرا یہ عذر رکھا کہ ابھی تو مسیں ہی بھیگی ہیں،ٹھیک سے داڑھی بھی نہیں آئی ہے۔قاری صاحبؒ نے فرمایا بھئی وقت پر یہ بھی آجائے گی۔آپ بہ نامِ خدا کل سے دارالعلوم کے شعبۂ فارسی میں تدریس کی خدمت انجام دیں۔

مفتی صاحب مدظلہم نے تعمیلِ حکم میں دارالعلوم میں پڑھانا شروع کردیا۔مولانا رحم الٰہی صاحبؒ،مولانا ظہیر صاحبؒ،مولانا اعزاز علی صاحبؒ،مولانا ابراہیم بلیاوی صاحبؒ وغیرہ آپ کے فارسی وعربی کے جملہ اساتذہ، زمانۂ طالب علمی میں بھی اور اب زمانۂ تدریس میں بھی آپ پر بے حد مشفق ومہربان رہے اور آپ نے بھی اپنے

اساتذہ کے ادب واحترام اور تعظیم وتکریم کے حوالے سے کوئی کوتاہی نہیں برتی۔زمانۂ تدریس میں اپنے اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کرنا اوران کی بدنی وجسمانی خدمت کرنا آپ کا ہمیشہ کا معمول رہا، جو اساتذہ کے تئیں آپ کے دلی احترام کا اور تواضع وکسرِ نفسی کا بین ثبوت ہے۔اساتذہ کہتے بھی کہ مولانا میاں ھلال صاحب! اب آپ دارالعلوم کے استاذ ہیں،اب یہ سب نہ کیا کیجیے؟ آپ معصومانہ انداز میں جواب دیتے کہ استاذ ہونے کے باوجود آپ کا تو شاگرد ہی ہوں اور اس رشتے کے تقدس کا احساس وخیال رکھنا بھی بہرحال میرا اخلاقی فریضہ ہے۔

دورۂ حدیث کے سال حضرت شیخ الاسلامؒ کی جوتیاں سیدھی کرنے پر جو واقعہ پیش آیا وہ علمی برادری کے لیے بڑا سبق آموز ہے۔آپ لکھتے ہیں:

> ''درس کے دوران ایک واقعے نے تو میرے اوپر حیرت کے پہاڑ توڑ ڈالے۔اصل میں معاملہ یہ تھا کہ حضرت مدنیؒ کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ ان کے جوتے اٹھائے اور سامنے رکھ دے،اگر کوئی طالب علم ایسا کرتا،تو حضرت کافی ناراض ہوتے تھے۔
>
> اب ہماری شوخی کہیے کہ ہم نے حضرت کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایک روز فرطِ عقیدت میں حضرت کے جوتے اٹھائے اور حضرت کے سامنے رکھ دیے۔خلافِ معمول حضرت نے ہمیں کچھ نہیں کہا،خاموشی کے ساتھ جوتے پہن لیے اور تشریف لے گئے۔اس بات کو کئی دن گزر گئے،ایک دن جیسے ہی سبق ختم ہوا حضرت بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکے اور معلوم نہیں کیسے ان کو ہمارے جوتے رکھنے کی جگہ کا پتہ لگ گیا،ہمارے جوتے اٹھائے اور ہمارے سامنے رکھ دیے اور فرمایا'' آپ نے ہمارے جوتے اٹھائے تھے،ہم آپ کے جوتے اٹھائیں گے''۔اب آئندہ کس کی ہمت

تھی کہ حضرت کے جوتے اٹھا سکے۔اس طرح انہوں نے گویا عملاً یہ سبق سکھایا کہ تواضع کیا ہے،عقیدت کیا ہے اور ان رسمی چیزوں سے دلی جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہے''۔

شیخ الاسلامؒ کی اپنے تلامذہ کے ساتھ بے تکلفی اوران کی شگفتہ مزاجی کے دوایک واقعات بھی مفتی صاحب ہی کی زبانِ قلم سے سنیے۔

''حضرت کا درس خشک نہیں ہوتا تھا بعض اوقات بڑی پرلطف باتیں بھی ہوجاتی تھیں۔میرے دورۂ حدیث کے سال حضرت کے یہاں جب کہ غالباً عمر بھی اسّی سے اوپر ہی ہوگی ،اللہ نے لڑکا عطا کیا،اسجد میاں سلمہ پیدا ہوئے۔ہم نے پرچہ لکھ کر بھیجا کہ اللہ نے آپ کوحضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اسّی سال کی عمر میں بیٹا دیا ہے،مٹھائی کھلایئے؟ کئی روز تک اس پرتقریر ہوتی رہی کہ میں غریب آدمی ہوں،اہل وعیال کے اخراجات زیادہ ہیں،آپ لوگ میرے اوپر اتنا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں،مٹھائی کے پیسے کہاں سے لاؤں۔

غرض اسی طرح کی پرلطف باتیں کئی روز تک ہوتی رہیں اور پھر شاندار قسم کی مٹھائی غالباً دس دس بارہ بارہ بالوشاہیاں ہر طالب علم کوحضرت کی طرف سے عنایت ہوئیں۔

شگفتہ مزاجی اور ہلکا پھلکا مزاح ہمارے بزرگوں کے مزاج کا حصہ رہا ہے۔ایک مرتبہ ہم نے پرچہ لکھ کر بھیجا کہ آپ اپنے سامنے جو جگہ چھوڑتے ہیں،ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہاں جنات آکر بیٹھتے ہیں اور یہ جگہ ان کے لیے چھوڑی جاتی ہے،جب انسان اشرف المخلوقات ہے،تو جنات کوہم پرمقدم کیوں رکھا جاتا ہے۔اس پربھی حضرت نے جن وانس

کے تعلق سے ایک بڑا شگفتہ خطاب فرمایا، جس میں دل چسپی بھی تھی اور معلومات بھی''۔

حضرت مدنی ہوں یا حضرت امروہویؒ، آپ کے جملہ اساتذہ اپنے عہد کے خدارسیدہ بزرگ تھے۔ حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ تعلیمی سال کے افتتاح کے موقع پر اساتذۂ ندوہ سے یہ بات بڑے اہتمام کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ہم اساتذہ اگر بہت کچھ ہوں گے، تب جا کر ہمارے طلبہ دولتِ علم وعمل سے کچھ حصّہ پاسکیں گے اور خدانا خواستہ عملی واخلاقی لحاظ سے ہم میں ضعف رہا، تو پھر طلبہ کی علمی، عملی اور اخلاقی زندگی کے سلسلے میں حسبِ توقع وخواہش کسی قابلِ ذکر انقلاب کا پیدا ہونا بڑا مشکل ہے۔

یہ مفتی صاحب کی خوش نصیبی اور سعادت کی بات ہے کہ آپ کو وہ اساتذہ نصیب ہوے، جو خود بافیض اساتذہ کے تربیت یافتہ تھے اور اپنے اساتذہ کے پاس وادب کا ان کے یہاں اس درجہ اہتمام وخیال تھا کہ اب جس کی مثال ملنی مشکل ہے، اس سب کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے اساتذہ کے منظورِ نظر رہے اور پھر اپنے عہد میں مرجعِ خلائق بنے اور دینِ متین کی خدمت کے مختلف میدانوں میں ان سے وہ عظیم خدماتِ جلیلہ ظہور پذیر ہوئیں، جن کا ذکر آج بھی زبان زدِ عوام وخواص ہے اور دنیا سے ان کی رحلت کے بعد بھی دلوں پر ان کی عظمت وعقیدت کا نقش مرتسم ہے۔

''ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ''

شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ کے بارے میں میں نے خود آپ سے سنا کہ وہ اپنے استاذِ محترم حضرت علاّمہ انور شاہ کشمیریؒ کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کیے ہوئے تھے اور اپنے استاذِ گرامی کی صحت وآرام کا اس درجہ خیال فرماتے تھے کہ جب بھی کسی علمی کام کے حل کے لیے آپ اپنے استاذ کے گھر تشریف

لے جاتے تھے تو فقط اس اندیشے سے کہ کہیں حضرت الاستاذ آرام فرما رہے ہوں اور ان کی نیند میں کوئی خلل واقع ہو جائے، گھر کے دروازے پر دستک دینے کے بجائے وہیں گھر کے باہر بیٹھ جاتے تھے اور جب حضرت علامہ خود ہی کسی ضرورت سے باہر تشریف لاتے، تو آپ بڑے ادب کے ساتھ عرض کرتے کہ حضرت فلاں مسئلہ سمجھ میں نہیں آسکا، اس کے حل کے لیے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ جب تک علامہ کشمیریؒ بہ قیدِ حیات رہے، شیخ الادبؒ کا ان کے ساتھ ادب و احترام کا یہی معاملہ برقرار رہا، دورِ تدریس بھی اس ادا کو ان سے نہ چھین سکا۔

اولٰئك آبائي فجئني بمثلهم
اذا جمعتنا يا جرير المجامع

ایسے عظیم اساتذہ کے شاگرد سے بھی ایسی ہی ادائیں متوقع تھیں، چناں چہ آپ بھی اپنے اساتذہ کے قدر شناس رہے اور ان کی خدمت گزاری کو اپنا فرضِ منصبی سمجھا۔

خاندانی وموروثی اثرات وخصائص کا فیضان کہہ لیجیے یا پھر اپنے والدِ ماجد کی تاکیدی نصیحت کا اثر سمجھ لیجیے کہ بالکل ابتداء ہی سے اپنے اساتذہ کی خدمت وصحبت اور ان سے علمی و باطنی فوائد حاصل کرنا، آپ کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی اور اساتذہ بھی آپ کے ساتھ دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کی نسبت سے خاص شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ بعض زبانوں پر بھی یہ بات آئی، چناں چہ بہ قول مفتی صاحب مدظلہم جب ہم نے حضرت شیخ الادب صاحبؒ سے پڑھنا شروع کیا، تو ہماری عمر بہت کم تھی۔ نوعمری کی وجہ سے غیر مناسب باتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ پتنگ لوٹنے کے چکر میں حضرت کے کمرے کے سامنے سے گزرے، جس کی کھڑکیاں مہمان خانے کے سامنے سڑک پر کھلتی تھیں، حضرت نے ہمیں دیکھ لیا۔ اگلے دن دو تین ہلکے ہلکے چپت لگائے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے میں

کہ ''مولوی صاحب: مولوی صاحب'' یہ حضرت کا خاص تکیۂ کلام تھا'' آپ پتنگ لوٹتے ہیں؟ ہم آپ کے دادا کو کیا جواب دیں گے''۔ یہ جملے کئی بار دہرائے، جس سے ہمیں پتہ لگا کہ یہ ساری عنایتیں دادا صاحبؒ کی نسبت سے ہیں۔ ہمارے بزرگوں میں نسبتوں کا پاس ولحاظ اور اس کی رعایت ہمیشہ ایک روایت کے طور پر رہی ہے۔استاذوں کی عزت یہاں تک کہ استاذ زادوں کی قدر اوران کی منزلت کا خیال ہمارے اکابر کا ایک خاص مزاج ہے۔

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ کے علاوہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے اکثر ہندی اساتذہ کو راہیٔ آخرت ہوئے تین چار دہائیاں گزر چکی ہیں، اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود آپ کے دل ودماغ میں اپنے اساتذہ کے واقعات اوران کے ساتھ رہے اپنے تعلقات کی جزوی تفصیلات سب محفوظ ہیں اور جب کبھی اس دور کی یادوں کا ذکر نکل آتا ہے، تو پھر تادیر انھیں یادوں وباتوں کے ذکر میں اس طرح منہمک رہتے ہیں کہ نہ سامعین اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں اور ناہی خود مفتی صاحب مدظلہم ضعف ونقاہت کے باوجود تعب وتھکاوٹ کا کوئی حرف زبان پر لاتے ہیں۔

ایک روز بات بات میں مولانا رحم الٰہی راجو پوریؒ کا ذکر چل نکلا، تو دیر تک ان کے احسان وشفقت کے واقعات سناتے رہے اور یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب ''بشاراتِ نبوی'' میرے سپرد کردی تھی اور فرمایا تھا کہ اس کتاب کو بس آپ ہی حفاظت کے ساتھ رکھ سکتے ہو اور لوگوں کے لیے اسے قابلِ استفادہ بنا سکتے ہو؛ اس لیے آپ ہی کو اس کتاب کا مالک بنا کر دنیا سے رخصت ہونے کا ارادہ ہے۔اس واقعے کے کچھ عرصے بعد وہ انتقال فرما گئے۔ یہ کتاب بڑی ہی قیمتی ہے، جس میں نبیٔ اکرم ﷺ کی آمد وبعثت کے بارے میں دیگر کتبِ سماویہ میں وارد بشارات کو جمع کیا گیا ہے۔ مفتی صاحب مدظلہم کا خیال تھا کہ کسی ایسے ماہرِ انگریزی

عالمِ دین سے اس کتاب کی تحقیق وتخریج کا کام لیا جائے، جس کی کتبِ سماویہ کے علوم ومضامین پر گہری نظر ہو، مگر آپ کو اس میں کامیابی نہیں مل سکی، جس کا آپ کو بے حد افسوس ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ آب دیدہ ہو جاتے ہیں کہ جتنے تصنیفی وتالیفی منصوبے تھے، بہ فضلِ باری پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں، صرف یہ ایک کام رہ گیا اور باوجود کوشش کے اس کی تکمیل کی کوئی سبیل پیدا نہ ہو سکی۔

علامہ ابراہیم بلیاویؒ کی خدمت بڑی مشکل سمجھی جاتی تھی، وہ بڑے نازک مزاج انسان تھے، مزاج سے ناواقف شخص کے لیے ان کی خدمت کے حوالے سے کامیاب ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اول اول جب کوئی طالب علم ان کی خدمت کے لیے جاتا تھا، تو بار بار خدمت سے منع کر دیا کرتے تھے، یہ دیکھنے کے لیے کہ آنے والے میں خدمت اور استاذ کی قدر و منزلت اور اس سے تحصیلِ علم کی واقعی کوئی طلبِ صادق ہے یا نہیں؟ جب بار بار کے منع کے باوجود اس کی آمد و رفت دیکھتے اور محسوس فرما لیتے، کہ ہاں واقعی یہ طلبِ صادق اور حصولِ علم کے سچے جذبے کے ساتھ، خدمت کا شائق وطالب ہے، تب جا کر خدمت کا موقع دیتے تھے۔

مفتی صاحب مدظلہم کو بھی جب حضرت علامہ ابراہیم صاحبؒ کی خدمت کا شوق پیدا ہوا اور آپ ان کی قیام گاہ پر حاضری دینے لگے، تو آپ کو بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑا۔ ابتدا میں جب آپ گئے، تو فرمایا: ''ہاں مولوی صاحب کیوں آئے ہو'' جواب دیا خدمت کی نیت وارادے سے۔ پہلی حاضری کے موقع پر حسبِ عادت خدمت لینے سے سختی کے ساتھ انکار فرما دیا۔ دوسری مرتبہ آپ نے سلام ودعا کے معاً بعد پیر دبانے شروع کر دیے، تو ایک دو منٹ بھی نہ گزرنے پائے ہوں گے کہ فرمایا: ''ہاں بس اب زیادہ نہیں مولوی صاحب چلے جاؤ'' مولوی صاحب حضرت علامہ کا تکیۂ کلام تھا۔ ایک دفعہ آپ نے مسوی اور مصفی کے نسخوں سے متعلق سوال کیا کہ ان میں سب

سے زیادہ معتبر نسخہ کون سا ہے؟ فرمانے لگے ''اس کے جواب کے لیے کل فلاں جگہ فلاں وقت آئیو''

جب دیکھا کہ لگ ہی گیا ہے، اب کسی صورت جانے کا نہیں، تب جا کر آپ کی خصوصی توجہات وعنایات مفتی صاحب مدظلہم کا نصیبہ بنیں اور جن کا سلسلہ تا دمِ آخر باقی رہا؛ بلکہ مفتی صاحب مدظلہم کے دارالعلوم میں مدرس ہونے کے بعد سے تو ان عنایات وتوجہات میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ مفتی صاحب مدظلہم نے دارالعلوم کے عہدِ تدریس میں مسوّی اور مصفّٰی پر تحقیق وتعلیق کا کام شروع کیا، تو اکثر علمی مشکلات حضرت علامہ ہی کے ذریعے حل پائیں۔

علامہ ابراہیم صاحبؒ کا ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا۔ آپ پر حضرت الاستاذ کی رحلت کا سخت صدمہ سوار تھا۔ حضرت مولانا سید میاں اختر حسین صاحبؒ سابق نائب ناظمِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے آپ کی یہ کیفیت دیکھی، تو از راہِ تسلی فرمایا کہ: حضرت علامہ آپ سے بے حد خوش تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ علم دوست انسان ہے، اس کو آگے کے درجاتِ عربیہ میں تدریس کا موقع دینا ہے اور اس کی تدریسی مہارت سے فائدہ اٹھانا ہے۔

کتب خانہ محمودیہ دیوبند

کتب خانہ محمودیہ کے نام سے مفتی صاحب مدظلہم کا اپنا کتب خانہ تھا۔ یہ کتب خانہ پہلے کسی اور جگہ پر تھا، بعد میں اسے مسجدِ قاضی کے قریب منتقل کر دیا گیا تھا۔ آج کل یہ کتب خانہ آپ کے برادرِ صغیر اسامہ عزیز صاحب کے زیرِ انتظام ہے۔

مفتی صاحب مدظلہم دارالعلوم کے تدریسی اوقات کے علاوہ باقی وقت کتب خانے ہی میں گزارتے تھے۔ درسی یا غیر درسی کتابوں کا مطالعہ ہو یا کسی کتاب کی

تصنیف وتالیف ہو(کتابوں کی خرید وفروخت کے ساتھ ساتھ) یہ کام آپ کتب خانے پر کیا کرتے تھے۔

رات کو کھانے کے بعد آپ کا معمول تھا کہ مولانا عامر عثمانیؒ مدیر ماہنامہ ''تجلّی'' دیوبند کے ساتھ تفریح کے لیے جایا کرتے تھے۔مظفرنگر روڈ پر دارالعلوم زکریا سے پہلے لبِ سڑک ایک مسجد ہے، وہاں تک یہ حضرات تفریح کے لیے جایا کرتے تھے۔

مولانا عامر عثمانیؒ اور آپ کے بیچ علمی بحثیں ہوتی تھیں۔تجلی میں بہ غرضِ تبصرہ آنے والی کتابوں کا بھی ذکر ہوتا اوران کی لائق مدح یا قابل تنبیہ چیزوں پر بھرپور تاثر وتبصرہ بھی۔غرض یہ تفریح، تفریح بھی تھی اور چلتی پھرتی ایک تحقیقی بزم وانجمن بھی تھی، جس سے طرفین کو بہت سے علمی فوائد حاصل ہوتے تھے۔

مولانا عامر عثمانیؒ بڑے ذہین اور محنتی انسان تھے۔جب تجلی کی ترتیب یا کسی اور کتاب کی تالیف وتصنیف کا کام شروع کرتے تھے،تو حضرت مفتی صاحب کی روایت کے مطابق بہت ہی مختصر سا کھانا کھا کر بیٹھ جاتے تھے اور ساری ساری رات مطالعے میں گزار دیتے تھے۔

مولانا عامر عثمانیؒ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے معتقد اور ان کے بڑے حامی تھے۔تجلی مولانا مودودیؒ اور ان کی جماعتِ اسلامی کا ایک زمانے تک ترجمان رہا تھا۔دورانِ تفریح جب جماعت اسلامی اور اس کے بانی کے نظریات وخیالات کی بات ہوتی، تو مفتی صاحب مدظلہم اتفاق کے ساتھ ساتھ بعض مواقع پر شدت کے ساتھ اختلاف بھی فرماتے۔

مفتی صاحب مدظلہم کا خیال ہے، جس کا آپ نے مولانا عامر عثمانیؒ سے برملا اظہار بھی کیا تھا کہ مولانا مودودیؒ کو کوئی حضرت تھانویؒ جیسا مرشد ومربی نہیں مل سکا، جو ان کو قابو میں کر لیتا۔اگر ایسا ہو جاتا تو مولانا مودودی کا یہ کھردراپن دور ہو جاتا

اور تراش خراش کے بعد یہ ہیرا بہت اچھا ہو جاتا۔ مولانا مودودی چوں کہ ذہین آدمی تھے؛ اس لیے ان کی اصلاح وتربیت کے لیے ان سے زیادہ ذہین مربی و مصلح درکار تھا، جس تک بدقسمتی سے ان کی رسائی نہ ہو سکی، جس کی بنا پر ان کی فکر میں کہیں کہیں کچھ ایسی باتیں رہ گئی ہیں، جو نہیں ہونی چاہیے تھیں، مثلاً صحابۂ کرامؓ کے بارے میں ان کا لب ولہجہ بڑا تیز ہو جاتا ہے، وہ ان پر تنقید کر ڈالتے ہیں اور یہ تنقید بعض اوقات تنقیص کی راہ پر نکل جاتی ہے۔

بعض نظریات وخیالات میں عدم اتفاق کے باوجود مولانا عامر عثمانیؒ کا آپ اور اپنے خانوادے کے تمام ہی اہل علم وقلم کے ساتھ ہمیشہ ہی مشفقانہ وخیر خواہانہ رویہ رہا۔ وہ اپنے خردوں کو کسی نہ کسی اہم کام پر لگائے رکھتے تھے۔ انہوں نے ہی شمس نوید عثمانی صاحب کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی حکایاتِ صحابہؓ کو بنیاد بنا کر انھیں واقعات کو افسانوی انداز میں ڈھالنے کا تحریری کام شروع کریں، چناں چہ شمس نوید عثمانی نے ''کیا ہم مسلمان ہیں؟'' کے نام سے دو جلدوں پر مشتمل ایک اس طرز کی کتاب لکھی، جسے خوب قبولِ عام حاصل ہوا۔ اسی طرح مولانا عامر صاحب ہی نے مفتی صاحب مدظلہم سے مسلم شریف پر کام شروع کرنے کی بات کہی، جس کی تعمیل میں آپ کے قلم سے تفہیم المسلم نکلی۔ تفہیم المسلم ابتدا میں مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحبؒ اور مولانا عامر عثمانیؒ کی خصوصی توجہ وعنایت کی بہ دولت ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اور ماہنامہ تجلی دیوبند میں بالاقساط شائع ہوتی رہی اور پھر باضابطہ اسے کتابی شکل میں منظرِ عام پر لایا گیا۔

طلبہ کی فکری تربیت کا انوکھا انداز ولائقِ تقلید طریقِ تدریس

دس بارہ سالہ آپ کے دورِ تدریس میں طلبائے دارالعلوم دیوبند کو آپ کی ذات

سے بے حد فائدہ ہوا تھا۔آپ کے شاگردوں نے ہر میدانِ علم میں خوب خوب دادِ تحقیق دی ہے۔بعضے آپ کے شاگرد ایسے بھی ہیں، جو فراغت کے بعد سے ملکی وسیاسی امور ومشاغل سے وابستہ ہیں؛ مگر ان کی بھی علمی پختگی حیرت انگیز حد تک برقرار ہے اور آپ کے شاگرد اسے اپنے استاذِ محترم کے انوکھے اور بالکل منفرد اندازِ تعلیم وتربیت کا فیضان اور اسی کا اثر ونتیجہ سمجھتے ہیں۔

آپ نے تدریس کا جو طریقہ اپنایا تھا یا طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت کا جو ڈھنگ اختیار کیا تھا، احقر کے ناقص خیال کے مطابق یہ اس دور کے لحاظ سے بالکل ایک نیا کام تھا۔وہ یہ تھا کہ آپ نے دو بلیک بورڈ لے کر ایک درس گاہ کے اندر لگا دیا تھا اور دوسرے کو درس گاہ کے باہر آویزاں کر دیا تھا۔

باہر کے بورڈ پر آپ ہر روز کوئی قرآنی آیت، حدیث شریف کا کوئی حصّہ، کسی حکیم ودانشور کا کوئی قول یا کوئی شعر لکھ دیا کرتے تھے۔باذوق طلبہ بورڈ پر مکتوب بات ہر روز پابندی سے پڑھتے۔دن میں بار بار بورڈ پر نظر پڑنے سے وہ بات ذہن میں جم جاتی تھی۔کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شعر مفہوم کے لحاظ سے ذرا دقیق ومشکل ہوتا، تو آپ اپنی درس گاہ کے طلبہ کے سامنے اس کی توضیح وتشریح فرما دیتے اور درس گاہ سے باہر کے طلبہ بھی بلاواسطہ آپ سے یا آپ کے شاگردوں سے اس کا مفہوم سمجھ لیتے۔اس طرح آپ طلبہ کے فکر کو ڈھالنے کا کام کرتے رہے اور اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب رہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے، دیوبند میں ایک شادی کے موقع سے آپ کے کئی شاگرد یکجا ہوگئے۔دیر تک مجلس جمی، جس میں تمام شاگردوں نے اپنی اپنی مصروفیات سے اپنے استاذ کو آگاہ کیا اور یہ تاثر سب نے ظاہر کیا کہ درس گاہ کے باہر کے بورڈ پر آپ ہر روز جو آیات واحادیث اور اقوالِ حکما واشعار لکھا کرتے تھے، میدانِ عمل میں

آنے کے بعد ہمیں ان سے بڑی مدد ملی۔ دورانِ تحریر وتقریر موقع کی مناسبت سے ان میں سے کوئی نہ کوئی چیز ہمیں یاد آجاتی ہے اور برموقع اس کے استعمال سے تحریر وتقریر کی افادیت دوچند ہوجاتی ہے۔

درس گاہ کے اندر کا بورڈ درس گاہ کے طلبہ کے لیے مخصوص تھا، جسے آپ کتاب کا سبق سمجھانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ گلستاں یا فارسی کی جو بھی کتاب پڑھاتے، اس کا ایک جملہ پہلے اس بورڈ پر لکھتے اور جملے کے الفاظ کے نیچے ان کے معانی بھی لکھ دیتے۔ پھر اس جملے کے الفاظ کے معانی زبانی بھی بتادیتے اور ہر جملے کے الگ الگ الفاظ اور ان کے معانی لکھنے اور زبانی بتانے کے بعد اس مکمل جملے کا ترجمہ بھی طلبہ کے سامنے زبانی طور پر واضح فرمادیتے۔ اس کے بعد باری باری ہر طالب علم کو اس کا پابند بناتے تھے کہ وہ کھڑے ہوکر اس جملہ کو ادا کرے، اس کے تمام الفاظ کے معانی بھی بورڈ پر دیکھ کر بیان کرے اور مکمل جملے کا ترجمہ بھی سنائے اور باقی طالب علم مکمل توجہ کے ساتھ سنیں۔ ایک جملے سے فراغت کے بعد پھر دوسری سطر یا جملہ بورڈ پر لکھا جاتا اور بعینہ سابقہ طرز وانداز پر اس کی بھی تفہیم وتشریح کی جاتی۔ اس طرح ہر طالب علم کو اسی گھنٹے میں وہ سبق یاد ہوجاتا تھا اور غبی سے غبی طالب علم بھی سبق یاد کرکے ہی درس گاہ سے رخصت ہوتا تھا۔

آپ کا دائمی معمول یہ بھی تھا کہ تمام طلبہ کا گزشتہ روز کا سبق سن کر پھر آگے کا سبق پڑھاتے تھے۔ دارالعلوم کی طرف سے طے شدہ چھ گھنٹوں کے علاوہ آپ دو تین گھنٹے مزید طلبہ کو سبق پڑھانے و سمجھانے کے لیے صرف کرتے تھے۔ یہ طریقِ تدریس و تربیت معلمین و متعلمین بہر دو کے حق میں کچھ وقت طلب تو ضرور ہے؛ لیکن استقلال و مداومت کے ساتھ اس طریق پر عمل کیا جائے، تو اس کے عظیم فوائد و دیرپا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

قیامِ جامعہ اسلامیہ مدینۃ الرسول ﷺ کے معمولات ومشاغل اوراس دور سے منسوب کچھ حسین یادیں

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ابتدائی طلبہ میں آپ کا اسمِ گرامی شامل ہے۔ مؤرخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے مرحوم صاحبزادے مولانا خالد کمال صاحب ،مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب اعظمی عمری، ڈاکٹر اشتیاق احمد خاں اور مولانا رشید الوحیدی صاحب بھی جامعہ اسلامیہ کے اولین شاگرد ہیں۔

۱۹۶۵ء میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے بہ غرضِ حج حجاز کا سفر کیا۔ ہندوستان واپسی پر حسبِ معمول انہوں نے حرمین شریفین کا سفرنامہ لکھا، جو اسی دور میں البلاغ اور انقلاب وغیرہ میں شائع ہوا۔

جامعہ اسلامیہ میں حسبِ عادت قاضی صاحبؒ نے وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ اساتذۂ جامعہ نے جو آپ کی درج ذیل عربی کتب:

(۱) رجال السند و الهند

(۲) الحکومات العربیة فی الهند

(۳) الهند فی عهدالعباسیین

(۴) العرب و الهند فی عهدالرسالة

(۵) العقد الثمین فی فتوح الهند و من ورد فیها من الصحابة و التابعین

(۶) شرح و تعلیق جواهر الاصول فی علم حدیث الرسول کی وساطت سے آپ سے عقیدت کی حد تک غائبانہ تعلق وتعارف رکھتے تھے اور ان میں سے اکثر مدتِ

دراز سے ملاقات کے خواہش مند تھے،آپ کا پرزور استقبال کیا۔مختلف اوقات میں دینی،سیاسی،سماجی اور دیگر متعدد موضوعات پر باہم تبادلۂ خیال ہوااور مدینہ منورہ کے چند روزہ قیام میں آپ زیادہ تر صبح وشام اساتذۂ جامعہ کے یہاں کھانے پر مدعور ہے۔

جامعہ اسلامیہ کے طرزِ تعلیم کی بابت قاضی صاحبؒ نے اپنا تاثر بایں الفاظ ظاہر فرمایاہے:

''یہاں کے اساتذہ کا طرزِ تعلیم ہمارے یہاں سے بالکل مختلف ہے،ہمارے یہاں عموماً کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور یہاں پر فنون کی تعلیم دی جاتی ہے اور کتاب سامنے رکھ کر فن سمجھایا جاتا ہے،اس لیے باشعور طلبہ کے لیے یہ تعلیم بہت ہی مفید ہے،وہ کسی ایک فن کی ایک کتاب پڑھ کر اس فن کو سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی حقیقت ان پر منکشف ہو جاتی ہے؛اس لیے یہاں کے تعلیمی معیار میں بعض لوگوں کے کلام کرنے کے باوجود بڑی افادیت ہے،اس کا صحیح اندازہ درس میں بیٹھنے اورطرزِ تعلیم پر غور کرنے سے ہوا''۔

جامعہ اسلامیہ کے قیام و افتتاح کے زمانے میں مفتی ہلال صاحب مدظلہم دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھےاور جامعہ اسلامیہ میں بہ طور طالب علم آپ کی منظوری کا واقعہ یک بہ یک پیش آیا،جس کا آپ کو پہلے سے کوئی وہم وگمان بھی نہ تھا۔جامعہ اسلامیہ میں داخلے سے متعلق اپنی آپ بیتی خود ہی سناتے ہیں:

''یہ۱۹۶۲ء کی ایک صبح تھی،میں دارالعلوم دیوبند میں اپنی درس گاہ میں بیٹھا ہوا درس دے رہا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تعلیمات کا ایک چپراسی ناظمِ تعلیمات حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاویؒ کی جانب سے ایک حکم لے کر آیا کہ ساتھ میں دی گئی عربی تحریر کا اردو ترجمہ کر کے دے دیا جائے۔

میں نے دیکھا تو وہ سعودی سفارت خانے کی طرف سے ایک خط تھا، جس میں لکھا گیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، دارالعلوم دیوبند سے کسی کا انتخاب کرکے بھیجیں۔ ترجمہ کرکے تعلیمات میں بھیج دیا گیا۔

دوپہر کے کھانے پر میں نے والد صاحب حضرت مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ سے اس کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''تم بھی اپنی درخواست بھیج دو''۔

اس واقعے سے تھوڑے دن پہلے کی بات ہے...... والد صاحب کسی کام سے کتب خانہ محمودیہ میں آئے...... دورانِ گفتگو اچانک ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا ''کیا تم حج کو جانا چاہتے ہو''۔

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، گفتگو کے موضوع سے اس جملے کا کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے ''بس یوں ہی خیال سا آ گیا تھا''۔

مجھے اپنے انتخاب کی امید نہ تھی، بس تعمیلِ حکم میں درخواست بھیج دی...... تعلیم کے آخری سال ''دورۂ حدیث'' کے نمبروں کے حساب سے انتخاب میرا ہوگیا...... اور یوں اس مردِ فقیر (والد مرحوم) کا خیال، خیال سے آگے بڑھ کر واقعہ بن گیا''۔

جامعہ اسلامیہ میں صبح سے ظہر تک اسباق کا سلسلہ رہتا تھا۔ ظہر کے بعد کا کچھ وقت طعام وقیلولہ کے لیے مختص تھا۔ عصر سے کچھ پہلے یا عصر کے فوراً بعد طلبائے جامعہ کو مسجدِ نبوی لے جانے اور عشاء کے وقت واپس لانے کا انتظام جامعہ ہی کی جانب سے تھا۔ ویسے منتظمین جامعہ کی جانب سے ہر طالب علم کو یہ فارغ وقت حسبِ مرضی

گزارنے کا اختیار حاصل تھا۔ اکثر طلبہ اس وقفۂ رخصت کو مسجد نبوی اور روضۂ پاک کی روزمرہ کی حاضری کے طور پر استعمال کرتے تھے، ظاہر ہے قیام مدینہ کے زمانے میں اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی ہے۔ مفتی صاحب مدظلہم بھی انھیں خوش نصیب طلبہ میں سے ایک تھے۔ آپ کا ہر روز کا معمول تھا کہ عصر سے مغرب تک حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی مہاجرِ مدنیؒ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ مولانا بدرِ عالم صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کی بہ دولت آپ کو بیش بہا تعلیمی وتربیتی فوائد حاصل ہوئے۔ مولانا میرٹھیؒ آپ سے برابر کوئی نہ کوئی علمی کام لیتے رہتے تھے۔ جواہر الحکم کی ترتیب میں مفتی صاحب مدظلہم کا بنیادی کردار رہا ہے۔ مولانا میرٹھیؒ بہ وجہ کبرسنی اور ضعف وعلالت کے لکھنے سے معذور ہو گئے تھے؛ اس لیے جواہر الحکم کا بڑا حصہ اس طرح تیار ہوا کہ آپؒ موضوع ومضمون کی مناسبت سے خود ہی کتبِ حدیث سے کسی حدیث کا انتخاب فرما کر مفتی صاحب سے اسے لکھوا لیتے، پھر ترجمہ وتشریح آپ بولتے جاتے اور مفتی صاحب مدظلہم اسے لکھتے رہتے تھے۔

حدیث وفقہ اور دیگر مختلف علوم سے متعلق سوالات کے ذریعے وہ آپ کی فکری وذہنی پرواز کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرتے اور بعد میں مفتی صاحب کی علمی وعملی زندگی سے ظاہر بھی ہوا کہ مولانا میرٹھیؒ کی کوشش سوفی صد بارآور اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

مولانا میرٹھیؒ کے یہاں بعد عصر مشاہیر ہندوپاک میں سے کسی نہ کسی عالم وبزرگ کی آمد بھی ہوتی رہتی تھی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ بانی دارالعلوم کراچی سے پہلی باضابطہ ملاقات کا شرف آپ کو اسی مجلس میں حاصل ہوا۔ ان واردوصادر اکابر علما سے بھی استفادہ کرنے میں مفتی صاحب نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ بالکل اوائلِ عمر میں اساتذہ وبزرگانِ دین سے ملاقات واستفادے اور ان کا ادب واحترام بجالانے کی جو ادا، والد ماجد کی توجہ کے طفیل آپ کی عادت وخصلت بن گئی تھی، اس

نے یہاں اپنا رنگ دکھایا اور مفتی صاحب مدینہ منورہ کی پاکیزہ فضا میں اکابر علما کے علمی فیوض سے خوب خوب متمتع ہوئے۔ دنیائے اسلام کے نامی گرامی علما و فضلا میں سے بہتوں سے اسی شہرِ رسول میں ملاقات کا موقع ملا۔

مغرب کے بعد مسجد نبوی میں اقدامِ عالیہ کے قریب ایک جگہ بیٹھ کر تحریری کام کرتے تھے۔ مقدمہ تفہیم المسلم کا کام آپ نے اسی جگہ مکمل کیا تھا۔

دارالافتاء مالیر کوٹلہ اور آپ کے اوقاتِ کار

مالیر کوٹلہ میں آپ نے ایک حد درجہ مشغول زندگی گزاری ہے۔ صبح و شام تقریری پروگرام ہوتے، جن میں آپ کی شرکت ناگزیر سمجھی جاتی تھی۔

بڑے شہروں کے دارالافتاء میں سائل و مستفتی حضرات عموماً دس بجے آیا کرتے ہیں، آپ کا ہمیشہ یہی معمول رہا کہ دیگر کاموں سے فارغ ہو کر دس بجے کے قریب دفتر دارالافتاء میں بیٹھ جاتے تھے اور پھر دوپہر تک واردین وصادرین کے استفتائات اور ان کے سوالوں کے زبانی یا تحریری جوابات دینے میں مصروف رہتے تھے۔ ایک ڈیڑھ بجے نمازِ ظہر، ظہرانے اور آرام سے فراغت کے بعد تین بجے کے قریب آپ دوبارہ دارالافتاء میں بیٹھتے اور شام تک پھر یہی استفتاء و جوابِ استفتاء کا سلسلہ رہتا، جو بسا اوقات عشاء کے وقت تک بھی ممتد ہو جاتا تھا۔

غرض صبح سے شام تک تقاریر، تصانیف اور لوگوں کی فقہی رہنمائی آپ کا تقریباً بتیس سال تک ایک دائمی معمول رہا اور عمر کے اس آخری دور میں بھی آپ کا یہ معمول کچھ حد تک ہی سہی برقرار ہے۔

دارالافتاء کے پلیٹ فارم سے آپ نے اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ بندگانِ خدا کی فقہی رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیا۔ بتیس سالہ دورِ دارالافتاء میں ایسے موڑ بھی آئے

کہ موٹی موٹی رقوم کا لالچ دے کر آپ سے غلط معاملات کی تائید وتوثیق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، مگر آپ نے ہر ایسے موقع پر وہ کام کیا، جو شریعت میں مطلوب ومقصود تھا اور جس سے اس عظیم منصب کی وقعت واہمیت کا احساس اور زیادہ پختگی کے ساتھ عوام الناس کے قلوب میں پیوست وراسخ ہوا۔ فللّٰہ الحمد

ایک عالِم ربانی اور مخلص فقیہ ومفتی کی شانِ استغناء کیا اور کیسی ہونی چاہیے؟ اس کا اندازہ لگانے کے لیے آپ کی حیاتِ طیبہ کے یوں تو کئی واقعات ہیں، یہاں پر صرف مفتی صاحب مدظلہم کے ساتھ پیش آمدہ ایک واقعہ خود آپ ہی کی تحریر سے نقل کیا جاتا ہے:

''ایک روز شام کو دفتر دارالافتاء میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لمبی سی گاڑی دفتر کے سامنے رکی اور اس میں سے ایک صاحب بڑا شاندار سوٹ پہنے ہوئے برآمد ہوئے اور میرے کمرے کی طرف آئے، سامنے آکر بیٹھ گئے اور ایک بہت خوش خط لکھا ہوا کاغذ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اس پر آپ کی تصدیق کی ضرورت ہے۔ میں نے پڑھا، تو وہ ایک طلاق نامہ تھا۔

میں نے پوچھا طلاق دینے والے صاحب کون ہیں......؟

معلوم ہوا پٹیالہ میں ہیں، صاحبِ فراش ہیں۔

واقعے کی تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ ان صاحب کی دو بیویاں ہیں، ایک بیوی ان کے پاس رہتی ہیں، دوسری بیوی ممبئی میں فلموں میں کام کرتی ہیں؛ چوں کہ ان صاحب کو اپنی بیوی کا فلموں میں کام کرنا پسند نہیں ہے اور اب یہ بیمار ہیں؛ اس لیے اپنی بیوی کو طلاق دے رہے ہیں؛ تاکہ ان کی زمین جائداد سے اس بیوی کو کوئی حصّہ نہ ملے۔

طلاق نامے پر میری تصدیق کی ''کہ شرعاً یہ طلاق واقع ہوگئی ہے'' ضرورت تھی اور اسی لیے وہ میرے پاس آئے تھے۔

میں نے کہا کہ جب تک طلاق دینے والے اور گواہوں کے دستخط میرے سامنے نہ ہوں، میں اس پر تصدیق نہیں کرسکتا۔

انہوں نے کہا کہ وہ بیمار ہیں، یہاں نہیں آسکتے، آپ میرے ساتھ چل کر اپنے سامنے دستخط کرالیں۔

میں نے کہا کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ گھروں پر جاکر دستخط کراؤں۔ جب وہ آنے کے قابل ہو جائیں گے، آکر میرے سامنے دستخط کردیں، میں تصدیق کردوں گا۔

انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈّی جس میں غالبًا پانچ ہزار روپے تھے، نکال کر میرے سامنے رکھ دیے کہ اس کو قبول کرلیں۔

میں نے پیسے لینے سے انکار کیا۔

انہوں نے پانچ ہزار روپے اور نکال کر رکھ دیے کہ یہ لے لیں۔

میں نے پھر بھی انکار کیا۔

تو انہوں نے پندرہ اور پھر بیس ہزار تک سامنے رکھ دئے۔

میرا انکار باقی رہا، آخر مجبور ہوکر وہ چلے گئے"۔

تصنیفی معمول اور تصنیفی میدان میں کامیابی کا راز

دارالعلوم دیوبند کے عہدِ تدریس میں آپ کے لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ تر کتب خانہ محمودیہ پر ہوتا تھا اور دوپہر یا شام میں حسبِ موقع آپ تصنیف وتالیف کا کام انجام دیتے تھے۔ اس دور میں آپ کے قلم سے زیادہ تر درسی وتدریسی نوعیت کی کتابیں نکلیں۔ مالیرکوٹلہ آمد کے بعد ایک عرصے تک چند در چند مصروفیات کی وجہ سے لکھنے کے کام سے آپ کا رشتہ منقطع سا ہو گیا تھا۔ ایک زمانے کے بعد جامعہ ہمدرد یونیورسٹی

دہلی میں منعقدہ ''بین الاقوامی قرآن کانفرس'' میں شرکت کرنے اور تحریری مقالہ پیش کرنے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔

آپ نے اس کانفرس میں شرکت کے لیے ''قرآن کریم اور نظامِ اقدار'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور پھر اس میں شریک بھی ہوئے۔ حسنِ اتفاق سے آپ کی وہاں مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ سے ملاقات ہوگئی۔ مولانا اکبرآبادیؒ سے آپ نے اپنی اس کشمکش کا اظہار کیا کہ تحریری کام کے طویل انقطاع کے بعد مقالہ لکھا ہے، جسے لے کر میں کوئی زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔ مولانا اکبرآبادی نے مقالہ دیکھا اور یہ تاثر ظاہر کیا کہ آپ کی تحریر ماشاء اللہ بہت عمدہ ہے، اور مجھے یہ محسوس کر کے بے حد خوشی ہے کہ آپ نے میرے مشورے پر عمل کیا ہے اور اب ماشاء اللہ تمہاری تحریر میں علم کی گہرائی اور الفاظ کی گیرائی صاف جھلک رہی ہے۔

دراصل بات یہ تھی کہ مفتی صاحب مدظلہم کی سب سے پہلی کتاب ''زندگی اور بندگی'' جدید نام ''انسانیت کے تقاضے'' شائع ہوئی تھی، تو آپ نے اس کا ایک نسخہ مولانا اکبرآبادیؒ کی خدمت میں برہان میں تبصرے کے لیے بھیجا تھا، جس کے جواب میں مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے آپ کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں ایک بات بہ طور مشورہ یہ کہی تھی کہ تبصرہ تو بہر حال آ ہی جائے گا، لیکن تم ابھی ڈٹ کر خوب مطالعہ کرو، اتنا پڑھو اتنا پڑھو کہ علم چھلکنے لگے اور پھر قلم اٹھاؤ، تو یہ ہوگا کہ تمہارے مطالعے کی فراوانی الفاظ کی محتاج نہیں رہے گی، بلکہ الفاظ اور جملے تمہارے خادم بن جائیں گے اور خود بہ خود تمہارے علم اور مطالعے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوں گے۔

بہ ہر کیف: ایک طویل وقفے کے بعد آپ نے مستقل طور پر تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا جو الحمدللہ تادمِ تحریر جاری ہے۔ تصنیف و تالیف کی بابت ابتدا میں آپ کا معمول یہ تھا کہ نمازِ فجر اور اوراد و وظائف کے معاً بعد آپ لکھنا شروع کر دیتے اور

ناشتے سے پہلے پہلے ڈیڑھ دو گھنٹے تک لکھتے رہتے تھے۔ناشتے کے بعد سے لے کر نمازِ مغرب اور بعض اوقات عشاء تک دارالافتاء سے متعلق امور کی انجام دہی میں مصروف رہتے یا مالیر کوٹلہ یا پنجاب کے کسی اور شہر یا دیہات میں تقریر و بیان کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔نمازِ عشاء کے بعد چوں کہ کوئی باہر کا کام باقی نہیں رہ جاتا تھا؛اس لیے آپ بعد عشاء تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔عام طور پر دس گیارہ یا بارہ بجے رات تک لکھنے کا کام جاری رہتا تھا اور گاہ بہ گاہ ساری ساری رات بھی آپ لکھا کرتے تھے۔مالیر کوٹلہ میں سب سے پہلے ''معمارِ انسانیت'' نامی کتاب آپ کے قلم سے نکلی اور خوب مقبول ہوئی۔اس کتاب کی تالیف و ترتیب کے دوران کئی کئی راتیں آپ نے بہ حالتِ بیداری گزاری ہیں۔اس دور کی اور بھی کئی کتابیں ہیں،جن کی تصنیف و تالیف کے دوران آپ نے اپنی راتوں کی نیند کو قربان کیا ہے۔دراصل فجر کے بعد کا وقت اور عشاء کے بعد کا وقت:یہ دو ہی آپ کے پاس فارغ وقت تھے،جن میں آپ اپنا کوئی بھی ذاتی علمی یا خانگی کام کر پاتے تھے؛ورنہ باقی اوقات تو عوامی امور و مطالبات کے حل و تکمیل میں اس طرح گھرے رہتے تھے کہ کسی ذاتی کام کو کرنا تو کجا و اس کا تصور تک بھی ناممکن سا تھا۔متعدد جماعتوں،تنظیموں اور عصری و دینی جامعات کی رکنیت و سرپرستی کے ادائے حقوق اور لاتعداد عوامی مسائل میں ہمہ وقت گھرے رہنے کے باوجود آپ نے جو تصنیفی کارنامہ انجام دیا ہے،وہ بہت سوں کے لیے درسِ عبرت اور دعوتِ فکر و عمل ہے۔

کسی بھی موضوع پر مقالے یا تصنیف سے پہلے آپ اس موضوع سے متعلق کتابوں کا خوب اچھی طرح مطالعہ کرتے اور پھر ذہن میں ایک مرتب خاکہ بنا کر لکھنا شروع کرتے تھے۔ایک ایک کتاب کی تصنیف و تالیف کی خاطر کئی کئی سو کتابوں کا مطالعہ آپ کے معمول میں داخل رہا۔سچ ہے،بہت زیادہ پڑھنے ہی سے لکھنا آتا ہے۔

آج سے کوئی سترہ اٹھارہ سال پہلے آپ کے ہاتھ میں کمزوری پیدا ہوگئی اور وہ دن بہ دن اس درجہ بڑھی کہ قلم پر آپ کی گرفت نہیں رہی اور ذرا سا لکھنے پر ہاتھ پھسلنے لگتا تھا۔اس صورتِ حال کے بعد آپ کو مجبوراً املا کا طریق اختیار کرنا پڑا اور مولانا سلیم صاحب دیوبندی کو مستقل اسی خدمت پر مقرر کیا گیا۔

مولانا سلیم صاحب دیوبندی اوران کی وطن واپسی کے بعد جو بھی صاحب اس خدمت پر مقرر کیے گئے ان کے پاس فارغ وقت مغرب تا عشاء ہوتا تھا،اس لیے زمانۂ املا میں آپ کا معمول بھی تبدیل ہوا۔آپ مغرب کے بعد اپنے خدام سے املا کرانے لگے اور بعض دفعہ یہ کام عشاء کے بعد تک لیا جاتا تھا۔

تفسیر نور القرآن آپ کا ایک شاہکار تالیفی کارنامہ ہے،اس کا ابتدائی حصہ اپنے ہاتھ سے لکھا اور زیادہ تر مولانا سلیم صاحب دیوبندی سے املا کرایا۔

ارشادات وملفوظات

زندگی کی اہم یادوں اور دین متین کے مختلف شعبوں سے متعلق آپ کی زبان سے نکلنے والی بیش قیمت باتوں کو احقر کی خواہش وفرمائش پر آپ کے معاون وخادم ماسٹر عبدالوحید صاحب نے مختلف مجالس میں قلم بند کیا ہے۔ موصوف کے شکریے کے ساتھ یہ ملفوظات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

مفتی صاحب مدظلہم کا ابتدا ہی سے ایک مخصوص مزاج ہے کہ آپ عام فہم اور مختصر جملوں میں اپنی بات کہتے و لکھتے ہیں اور اسی لیے آپ کی تقاریر وتصانیف عوام وخواص میں یکساں افادیت ومرجعیت کا حامل رہی ہیں۔ امید ہے کہ مختصر مختصر جملوں پر مشتمل آپ کے ان ملفوظات سے قارئین کو بیش بہا دینی و دنیوی فوائد حاصل ہوں گے اور معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی لانے اور صالح انقلاب برپا کرنے میں یہ ملفوظات اہم کردار ادا کریں گے۔ ان شاء اللہ

....

﴿﴾ تعلق بنانا آسان ہے، اسے نبھانا مشکل ہے۔

﴿﴾ مجھے جو کچھ ملا، اپنے استاذوں کی جوتیوں کے طفیل ملا۔

﴿﴾ اساتذہ کا ادب واحترام انسان کی سعادت ہے۔

﴿﴾ ماں اپنے بچّے کو مرنے کے بعد بھی نہیں بھولتی۔ یہ بات مجھے مولانا اعجاز احمد قاسمی نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے حوالے سے اس وقت بتائی، جب میری والدہ کا جنازہ احاطۂ مولسری دارالعلوم دیوبند میں رکھا ہوا تھا۔

﴿﴾ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایک نگاہ نے میری زندگی بدل دی۔

﴿﴾ فکر میں اعتدال انسان کی شخصیت کا حسن ہے۔

﴿﴾ اختلافِ رائے کی کچھ حدود ہیں، ان سے آگے اختلاف نہیں، مخالفت ہے۔

﴿﴾ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی مجلسوں سے میں نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ اپنے مخالف کے ساتھ بھی برا برتاؤ نہ کرو۔

﴿﴾ لڑکیوں کو میں اللہ کی نعمت سمجھتا ہوں۔

﴿﴾ دارالعلوم دیوبند عام اداروں کی طرح نہیں ہے، وہ بزرگوں کی دعاؤں کا اثر ہے اور اس کا ایک خاص مقام ہے۔

﴿﴾ میری تحنیک میرے دادا کے چھوٹے بھائی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے کی تھی، شاید اسی کا اثر ہے کہ میں بغیر کسی مشق کے بڑے بڑے مجمعوں میں تقریر کرنے لگا اور مجھے کبھی جھجک نہیں ہوئی۔

﴿﴾ عصبیت حق قبول کرنے سے روک دیتی ہے۔

﴿﴾ چھوٹے بچّوں کو پڑھانا بڑی عمر کے لوگوں سے زیادہ مشکل ہے۔

﴿﴾ میرے والد صاحبؒ کو بزرگوں سے ملاقات کا بڑا شوق تھا اور وہ جہاں جاتے تھے، مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس کے بیش بہا فائدے بعد میں نظر آئے۔

﴿﴾ میری نانی مرحومہ سن ۱۹۷۴ عیسوی تک حیات رہیں اور وہ ہمارے ساتھ بچّوں کی طرح کھیلتی تھیں۔ ہمیں کہانیاں سناتی تھیں، جس سے ہمیں بڑا فائدہ ہوا اور ہم بری صحبت سے بچے رہے۔

﴿﴾ میرے اکثر دوست مجھ سے زیادہ قابل تھے، اس کا مجھے فائدہ پہنچا۔

﴿﴾ میرے والد صاحب مختلف کھیلوں میں میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

﴿﴾ نادان دوست سے عقل مند دشمن بہتر ہے۔

﴿﴾ جو وقت کو ضائع کرتا ہے، وقت اس کو ضائع کر دیتا ہے۔

﴿﴾ ضعیفی کی عمر میں احساس ہو رہا ہے کہ زندگی اعتدال سے گزارنی چاہیے تھی۔

۞ ذہنی اور جسمانی تمام صلاحیتیں اللہ کا عطیہ ہیں۔
۞ والدین سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔
۞ شریکِ حیات اچھی ہو، تو زندگی اچھی گزر جاتی ہے۔
۞ اولاد کی تربیت کا شروع سے خیال رکھنا چاہیے۔
۞ ہر موقع کی مسنون دعائیں پورا تصوف ہے، ان کو معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے پڑھا جائے، تو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔
۞ پوری زندگی کا نچوڑ یہ ہے کہ نظر انداز کرو۔
۞ نیک لوگوں کے پاس بیٹھنے سے دل کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

یعنی: بزرگانِ دین کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنا، ان کی محبت اختیار کرنا سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔

۞ توبہ میں دیر نہیں کرنی چاہیے، اللہ سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ معافی ضرور قبول کرے گا۔
۞ دل کی نرمی ایمان کی علامت ہے۔
۞ دین دار دوست بھی اللہ کی نعمت ہے۔
۞ جوانی اور صحت اللہ کی دو اہم نعمتیں ہیں، ان کی قدر کرنی چاہیے۔

علم

۞ علم کی فضیلت مسلّم ہے، مگر اس کے ساتھ ہدایت بھی ضروری ہے، اسی لیے

قرآن مجید میں اقرأ کے ساتھ باسم ربک بھی فرمایا ہے، یعنی تمہارا علم اللہ کی ہدایت سے باہر نہ ہو۔

۞ حضرت آدم علیہ السلام علم کے امتحان میں کامیاب ہوے۔ جنت میں بھی ایک بڑی دولت ونعمت علم ہوگا کہ علم کے دروازے کھلتے جائیں گے اور انسان عجیب لذت محسوس کرے گا۔

۞ جنت میں علم کی کوئی حد نہیں ہوگی؛ کیوں کہ علم اللہ کی صفت ہے اور بے حد ہے۔

۞ علم بغیر عقل کے نہیں آتا۔ مثل مشہور ہے ''یک من علم را دہ من عقل باید'' یعنی ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے۔

۞ علم صرف معلومات کا نام نہیں ہے، علم ایک نور ہے، جو دل کو روشن کرتا ہے اور اس سے صحیح فکر پیدا ہوتی ہے۔

۞ عالم وہ ہے جو باعمل ہو۔

۞ عالم دراصل وہ ہے جو ہر حال میں حق بات کہے اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرے۔ یہ علمائے حق ہیں جن کا درجہ بہت بلند ہے۔

۞ علماء سو وہ ہیں جو ہمیشہ مصلحت کو دیکھتے ہیں اور حق کو گھما کر اپنے حق میں کر لیتے ہیں، ظاہری لباس وغیرہ کے اعتبار سے ان کی شان وشوکت چاہے کتنی بھی کیوں نہ ہو؛ مگر اللہ کے نزدیک ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ لوگ ہر دور میں اسلام اور ملت کے لیے نقصان دہ رہے ہیں۔

۞ قرآن مجید کا دوسرا نام فارق بھی ہے۔ یہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دیتا ہے، یعنی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا جدا کر دیتا ہے۔

۞ قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے ''عملِ صالح''، جس کی جمع اعمالِ صالحہ آتی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح ارشاد فرمایا گیا ہے۔ عمل صالح کا

مطلب ہے عادات، معاملات، اخلاق، معاشرت اور سیاست؛ ان سب کے مجموعے کا نام اعمالِ صالحہ ہے، کسی ایک جزو کو مکمل اعمالِ صالحہ نہیں کہا جاسکتا۔

❁ قرآن مجید کے برابر دنیا کی کوئی کتاب نہیں ہوسکتی، اگر دنیا کی تمام کتابوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں صرف قرآن رکھا جائے، تو قرآن سب پر بھاری ہوگا۔

❁ قرآن اللہ کی صفت ہے، اس کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔

❁ قرآن کی خصوصیت ہے کہ وہ قوموں کو اٹھاتا بھی ہے اور گراتا بھی ہے۔ جو قوم اس پر عمل کرتی ہے وہ سربلند ہوتی ہے۔

❁ حدیث دراصل قرآن کی تشریح ہے، بغیر حدیث کے قرآن نہیں سمجھا جاسکتا۔

❁ امت مسلمہ کے پاس دین کی دو مضبوط بنیادیں ہیں، قرآن اور حدیث۔ یہ عظیم سرمایہ آج کسی اور قوم کے پاس نہیں ہے۔

ادب

❁ ادب انسان کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" اللہ نے مجھے ادب سکھایا اور سب سے عمدہ مجھے ادب کی تعلیم دی۔

❁ میرے استاذِ محترم مولانا رحم الٰہی راجو پوریؒ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد
بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

یعنی بے ادب صرف اپنے آپ ہی کو نقصان نہیں پہنچاتا؛ بلکہ اپنی بے ادبی کی وجہ سے پوری دنیا میں آگ لگادیتا ہے۔

❁ میرے محترم استاذ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب فرمایا کرتے

تھے کہ میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے گھر کے دروازے پر بیٹھا رہتا تھا کہ جب وہ باہر نکلیں گے، تو ان سے یہ بات پوچھوں گا۔ ادب کی وجہ سے ان کے گھر کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا تھا، نہ ان کو اطلاع دیتا تھا؛ بلکہ ان کے انتظار میں باہر بیٹھا رہتا تھا، چناں چہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے نہ صرف علم میں برکت تھی؛ بلکہ اتنے بلند اخلاق تھے کہ ہر چھوٹے بڑے کو سلام میں پہل کرتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تھا، تو اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے کمرے پر چلے جاتے تھے اور اگر محسوس کرتے کہ ضرورت مند ہے غریب ہے، تو چپکے سے اس کے تکیے کے نیچے روپے رکھ کر چلے آتے تھے۔

۞ میرے والد صاحبؒ اس بات پر بڑی تنبیہ کرتے تھے کہ استاذ کے ادب و احترام میں ذرا کمی نہ آئے۔ اللہ نے مجھے دنیا میں بھی اس کا فائدہ دکھایا اور امید ہے کہ ان شاء اللہ آخرت میں بھی اجر ملے گا۔

۞ ادب کے بغیر نہ علم آتا ہے، نہ علم میں برکت ہوتی ہے۔

لطافتِ طبع

۞ میں نے اپنے بزرگوں میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ جن کو ہم ابا جان کہتے تھے، ان حضرات کو کبھی آگے یا پیچھے شرمگاہ کو کھجاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

۞ لوگ لباس اور بدن کی صفائی کا لحاظ رکھتے ہیں، مگر منہ کی صفائی ان سب سے زیادہ اہم ہے۔ مسواک کی فضیلت حدیث شریف سے ثابت ہے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت اللہ کے رسول ﷺ نے مسواک فرمائی، جس سے منہ کی صفائی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

سیاست

﴿ ملک کے موجودہ سیاسی حالات کے پیشِ نظر مسلمانوں کو الیکشن کی سیاست میں اپنی ساری طاقت اور دل چسپی نہیں لگانی چاہیے؛ کیوں کہ الیکشنی سیاست میں جب مسلمان مقابلے پر آجاتے ہیں، تو اس کا پورا فائدہ ہندو بھائیوں کو پہنچتا ہے۔ اٹل بہاری واجپئی مذاق کے انداز میں ایک حقیقت بیان کیا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں ایسے لوگ ہیں کہ اگر مسلمان نہ رہیں، تو وہ فرضی مسلمان بنا کر کھڑا کرلیں گے۔

﴿ میری ناچیز رائے میں ہماری توجہ تعلیمی محاذ اور خدمتِ خلق پر ہونی چاہیے۔

﴿ اس ملک میں ہماری ذمہ داری ہے کہ اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں دور کرکے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے جدوجہد کریں۔

﴿ یہ ہمارا بنیادی کام ہے اور حقیقت میں دونوں جہان کی سرخروئی اسی میں ہے کہ ہم اللہ کے دین کو ان تک پہنچائیں، جو ابھی تک اس سے ناآشنا ہیں۔

﴿ ہم نے اپنی جدوجہد کو اپنے ہی دائرے میں محدود کرکے سمجھ لیا ہے کہ ہمارا فریضہ ادا ہوگیا ہے۔

صفائیِ معاملات

﴿ اسلام نے جن چیزوں کی تعلیم بڑی اہمیت کے ساتھ دی ہے، ان میں معاملات کی صفائی بھی ہے کہ جس کا جو دینا ہو، وقت پر ادا کیا جائے اور کسی طرح کی اونچ نیچ اور ہیرا پھیری نہ ہو، بروقت بغیر تقاضے کے ادائیگی کردی جائے۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم ﷺ کے متعدد واقعات مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے دوسروں کے ساتھ مل کر کاروبار کیے ہیں، جب کاروبار سے واپس آتے تھے، تو آتے

ہی سب کا حساب دے دیتے تھے اور جب اپنا پیسہ دوسروں کے ساتھ لگاتے تھے اور وہ آ کر حساب دیتا تھا، تو آپ ﷺ فرماتے تھے کہ جاؤ، اپنے گھر جاؤ، بال بچوں سے ملو، آرام سے حساب کرلیں گے۔ گویا دینے میں چست تھے، مگر لینے میں جلدی نہیں فرماتے تھے۔

﴿ معاملات کی صفائی دراصل انسانی اخلاق کا معیار ہے۔ حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ آدمی کیسا ہے؟ جس سے پوچھا تھا، اس نے جواب دیا کہ اچھا آدمی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ آدمی اچھا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے اس کو اکثر مسجد میں دیکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ کاروبار کیا ہے؟ کچھ لین دین ہوا ہے؟ کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی سفر کیا ہے؟ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پھر تم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اچھا ہے یا نہیں ہے۔

﴿ ہمارے بزرگوں میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ خاص طور پر صفائی معاملات کی تربیت میں معروف ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرے متعلقین میں اگر کبھی کبھار نماز میں سستی ہو جائے، تو میں نظر انداز کر دیتا ہوں؛ مگر معاملات میں پوری احتیاط کا تقاضا کرتا ہوں؛ کیوں کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور حقوق العباد بغیر بندوں کے معاف کیے معاف نہیں ہوں گے۔

معیشت

﴿ حدیث شریف میں آتا ہے، حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة'' خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا

آدھی معیشت ہے،یعنی جس کو خرچ کرنا آ گیا، اس کی آدھی معیشت ٹھیک ہو گئی۔آمدنی کے مطابق سلیقے سے خرچ کرنا زندگی کی بڑی کامیابی ہے۔مثل مشہور ہے کہ چادر کے مطابق پیر پھیلانے چاہئیں۔

﴿ حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص حضورصلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے بال بچے بھوکے ہیں اور میرے پاس کچھ نہیں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟اس نے کہا کہ گھر میں صرف دو چیزیں ہیں،ایک لکڑی کا پیالہ ہے اور دوسرا ٹاٹ کا ٹکڑا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکڑی کا پیالہ لے کر آؤ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ نیلام کیا،چار درہم میں بکا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو درہم میں کھانا لے کر جاؤ،بچوں کو کھلاؤ اور دو درہم کی کلہاڑی لے کر آؤ۔اس نے ایسا ہی کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا روزانہ جنگل جایا کرو،لکڑی کاٹ کر لایا کرو،جتنے میں بکے اس میں کچھ کھانے کا سامان لایا کرو اور کچھ پیسے بچا لیا کرو اور اتنے دن بعد آنا اور مجھے بتانا۔کچھ دن کے بعد وہ آیا اور بتایا کہ اب میری حالت بہتر ہے۔بچوں کو کھانا بھی مل رہا ہے۔فرمایا کچھ بچت کیا کرو،تا کہ وقتِ ضرورت کام آئے۔یہ ہے معیشت کا سنہرا اصول۔

﴿ میرے والد صاحب مرحوم کثیر العیال تھے،وہ بھی اسی سلیقے سے زندگی گزارتے تھے کہ کم خرچ میں اچھی طرح وقت گزرتا تھا۔

﴿ قرض لے کر زندگی گزارنا افراد کے لیے مفید ہے اور نہ ہی ملکوں کے لیے سود مند ہے۔

○❖○

اولاد واحفاد اور برادران و متعلقین

مفتی صاحب مدظلہم کے جدامجد مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ (یکے از بانیانِ دارالعلوم دیوبند) کے خاندان میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت عطا فرمائی تھی۔خاندان کا تفصیلی ذکر ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے۔خانوادے کے بعض علما چوں کہ اس پر کام کر رہے ہیں؛اس لیے یہاں مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی،مولانا انجم عثمانی،صہیب صدیقی مالک فیصل انٹرنیشنل دیوبند، طارق عمیر عثمانی،آپ کے معاون خصوصی مفتی عبدالملک صاحب قاسمی اور دیگر برادران و متعلقین کا مختصر ذکر کرنے کے علاوہ آپ کے والدِ ماجدؒ کے باقی افرادِ خاندان کا صرف نام ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانی (اہلیہ مرحومہ کا نام:رضیہ سلطانہ)

(۱)مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی
(۲)مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی
(۳)حافظ حفیظ الرحمٰن
(۴)صبیحہ سلطانہ
(۵)مولانا دلیل الرحمٰن انجم عثمانی
(۶)حافظ قمر الاسلام نجمی عثمانی
(۷)مولانا سہیل الرحمٰن عزیز
(۸)درخشاں خاتون
(۹)مولانا اسامہ عثمانی

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی (اہلیہ مرحومہ کا نام:نسیمہ خاتون)

(۱)لبنیٰ خاتون

(۲) آرزو فاطمہ

(۳) عائشہ خاتون

(۴) طارق عمیر عثمانی

(۵) رومی خاتون

(۶) عظمیٰ خاتون

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ (اہلیہ کا نام: رفیعہ خاتون)

(۱) معاذ عزیز

(۲) عمار عزیز

(۳) سعد عزیز

(۴) شگفتہ جبیں

(۵) صفوان عزیز

(۶) طاہر عزیز

حافظ حفیظ الرحمٰن مسرت عثمانی (اہلیہ کا نام: سیدہ خاتون)

(۱) مبشرہ

(۲) شمسیہ

(۳) ضیاء الرحمٰن

(۴) زکیہ

(۵) کوثر عزیزہ

صبیحہ سلطانہ زوجہ محمد فاروق صدیقیؒ

(۱) حنا عفت خاتون

(۲) محمد صہیب صدیقی

(۳) صبا صدیقی

(۴) نوید صدیقی

(۵) کمال صدیقی

مولانا دلیل الرحمٰن انجم عثمانی (اہلیہ کا نام: فرزانہ خاتون)

(۱) سمیر عثمانی

(۲) ہما عثمانی

حافظ قمر الاسلام نجمی عثمانی

(۱) حبیب عثمانی

(۲) عالیہ عثمانی

(۳) آسیہ عثمانی

مولانا سہیل عزیز (اہلیہ کا نام: عمرانہ خاتون)

(۱) زینت

(۲) مزینہ

(۳) عمر عزیز

(۴) بریرہ

(۵) ایمن

درخشاں زوجہ محمد عاصم

(۱) عصمت

(۲) عفیفہ

مولانا اسامہ عزیز (اہلیہ کا نام: عاصمہ خاتون)

(۱) مولانا انور عزیز عثمانی

(۲) مدیحہ عثمانی

(ماخوذ از حیاتِ عزیز: تالیف مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی)

مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ

مفتی صاحب مدظلہم کے والد ماجدؒ ایک بڑے پاکباز اور نیک طینت انسان تھے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنی تحریروں میں ان کا ذکر بڑے بلند الفاظ میں فرمایا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی پچانوے سالہ زندگی کو خدمتِ خلق اور مابعد الموت کی زندگی کی تیاری کے طور پر گزارا تھا۔

وفات کے قریبی زمانے میں ان کی زبان سے متعدد دفعہ اس قسم کے جملے صادر ہوئے کہ "گھبراتے کیوں ہو......؟ موت ایک پردہ ہی تو ہے، بس ایک آڑ ہو جاتی ہے۔ آدمی مر کر فنا تھوڑا ہی ہو جاتا ہے۔ ایک دار سے دوسرے دار میں منتقل ہو جائے گا۔" مولاناؒ اپنے والد ماجد مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کی طرح بڑے بے نفس مردِ مومن تھے۔ بہت سے اوصاف و عادات کے لحاظ سے وہ اپنے والد ماجد کی یادگار تھے۔ وقتِ ضرورت گھر کے چھوٹے بڑے کام خود ہی انجام دے دیتے تھے اور مفلسوں وغریبوں کی دست گیری کے حوالے سے ان کی بھی وہی شان تھی، جس کے بہت سے قصے ان کے والدِ والا قدرؒ کے بارے میں زبان زدِ عوام وخواص ہیں۔ گھڑی سازی اور چشمہ بنانے کا کام سیکھا ہوا تھا، چناں چہ ایک زمانے تک ذریعۂ معاش کے طور پر فرصت کے اوقات میں یہ کام بھی کیا۔

اللہ تعالیٰ نے کفایت شعاری سے انھیں حصۂ وافر عنایت فرمایا تھا، ان کی پوری زندگی حدیثِ نبوی ﷺ "الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة" پر عمل سے

عبارت تھی؛ اسی لیے اچھے خاصے عیال دار ہو کر بھی وہ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں کامیاب رہے۔

جب تک حیات رہے، اپنے والدِ ماجد کے نام سے موسوم مسجد ''مسجد عزیز'' میں امام رہے۔ یاد رہے کہ اس مسجد میں مفتی اعظمؒ کے دور سے لے کر اب تک امامت کا شرف اسی خاندان کو حاصل ہے۔ یہ مسجد مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کے مکان کے سامنے ہے اور خاندانِ عزیز میں چھوٹی مسجد کے نام سے متعارف ہے۔ بعد فجر ختم خواجگان کا سلسلہ مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحبؒ کی حیات تک انھیں کے دم قدم سے زندہ تھا۔

مولاناؒ کا سب سے بڑا دینی کارنامہ جو ان شاء اللہ ان کے حق میں اجر و ثواب اور رفعِ درجات کا بڑا اہم ذریعہ ثابت ہوگا، یہ ہے کہ انہوں نے تقریباً ساٹھ پینسٹھ سال تک دار العلوم دیوبند میں تجوید و قرأت کا درس دیا۔ ان کے بالواسطہ و بلاواسطہ شاگردوں کا حلقہ بلا مبالغہ دنیا بھر میں موجود ہے، جو اپنے استاذ و محسن کے فیضِ علمی کو دوسروں تک پہنچانے میں مصروف ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک

مفتی صاحب مدظلہم نے اپنے والدِ ماجد کی حیات و خدمات پر ''وہ بندہ مولا صفات'' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا جو اسی زمانے میں شائع ہوا اور بعد میں اسے آپ کی کتاب ''حیاتِ عزیز'' میں شامل کر دیا گیا۔

والدہ مرحومہ رضیہ سلطانہ

مفتی صاحب کی نانی مرحومہ زینب معصوم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی حقیقی بھانجی تھیں۔ حضرت علامہ سے سنی ہوئی باتوں اور ان کے واقعات کا ذکر و تذکرہ ہی ان کی حیات کا اہم مشغلہ تھا، چناں چہ بالکل اوائلِ عمر ہی میں مفتی صاحب سمیت آپ کے جملہ برادران کے کان حضرت علامہ کے نام اور کسی حد تک کام سے آشنا ہو گئے تھے۔

مفتی صاحب کے نانا مرحوم جناب جمیل الرحمٰن صاحبؒ جو دیوبند کے نامور تاجر تھے، جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ اسی طرح مفتی صاحب کے اکلوتے ماموں مولانا رضی الرحمٰن صاحبؒ بھی نوجوانی میں انتقال کر گئے تھے۔ مولانا رضی الرحمٰن صاحبؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے لائق و فائق شاگرد تھے اور شاہ صاحبؒ کے حادثۂ وفات کے بعد انہوں نے اپنے محبوب استاذ کی مدح و شان میں چند اشعار کہے تھے، جو مفتی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔

نانا اور ماموں کے انتقال کے بعد گھر میں صرف آپ کی نانی اور آپ کی والدہ ہی باقی رہ گئی تھیں۔ ان حالات میں آپ کی والدہ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحبؒ کے ساتھ کیا اور اپنے ہی گھر میں داماد کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ مفتی صاحب کے والد صاحب کا قدیم مکان دراصل آپ کا ننہالی مکان ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ ایک عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، جنھوں نے اپنی اولاد کی حسنِ تربیت کی طرف ابتدا ہی سے توجہ دی۔ کسی بھی مرد کی کامیابی میں عورت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کے والدِ ماجد کے ذریعے جو دینی خدمات ظہور پذیر ہوئیں، ان میں مرحومہ کا بھی بڑا حصّہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ درجے کی ذہانت وفراست سے نوازا تھا، غیر معمولی صورتِ حال مرحومہ کی سوجھ بوجھ سے اس طرح معدوم ہو جاتی تھی، جیسے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

آپ کے والد اور والدہ دونوں نے اللہ کے فضل سے طویل عمر پائی اور پینسٹھ افراد پر مشتمل ایک بھرا پرا خاندان چھوڑ کر راہیِ آخرت ہوئے، جن میں حفاظ بھی ہیں اور قراء، علما اور مفتیان بھی۔ دونوں مزارِ قاسمی میں مدفون ہیں۔ رحمهما الله رحمةً واسعةً۔

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ

سابق نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ ہند کے ایک جلیل القدر عالمِ دین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نثر ونظم بہر دو پر کامل قدرت عطا فرمائی تھی، جسے انہوں نے خدمتِ دین کے لیے مدت العمر استعمال کیا۔

دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں بہ حیثیت نائب مفتی زمانۂ دراز تک رہے۔ اس پلیٹ فارم سے بھی آپ کا فیض دور دور تک پھیلا و عام ہوا۔ آپ کے فیض یافتہ تکمیل افتاء کے طلبہ اپنے استاذِ مرحوم ومغفور کے حق میں ایصالِ ثواب وصدقہ جاریہ کی بہترین سبیل ہیں۔ ان شاء اللہ ایصالِ ثواب کا یہ علمی وروحانی سلسلہ تا قیامِ قیامت جاری رہے گا۔ مفتی سلمان صاحب منصور پوری محدث ومفتی جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد ایسے سینکڑوں شاگردان رشیدان ہیں، جن کی علمی، دینی اور ملی خدمات پر پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کو بجاطور پر فخر وناز ہے۔

مفتی کفیل الرحمٰن صاحبؒ عمر میں مفتی صاحب مدظلہم سے کوئی ڈیڑھ دو سال ہی چھوٹے تھے اور تعلیمی سفر میں بھی آگے پیچھے ہی رہے اور پھر میدانِ عمل میں دونوں ایک دوسرے کے علمی معاون رہے؛ اس لیے گزشتہ صفحات میں کسی نا کسی مناسبت سے کئی بار مفتی نشاط عثمانیؒ کا ذکرِ خیر ہوا۔ مفتی صاحب مرحوم ہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اپنے برادرِ کبیر کی حیات وخدمات پر قلم اٹھایا اور پچیس تیس صفحات پر مشتمل ایک وقیع رسالہ تحریر کیا، جس سے اس کتاب کی ترتیب میں بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ رسالہ کم وبیش تیس پینتیس سال پہلے آپؒ کے قلم سے نکلا۔ اس میں مفتی صاحب مدظلہم کے حوالے سے جن علمی کارناموں کی انجام دہی کی مصنفؒ نے توقع ظاہر کی تھی اور جو

خواب انہوں نے دیکھا تھا، الحمدللہ وہ توقع حرف بہ حرف پوری ہوئی اور آپ کی خدمات اس خواب کی حسین تعبیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شعر وغزل اور نعت وحمد اور مرثیہ وغیرہ اصنافِ سخن پر مشتمل مفتی نشاط عثمانیؒ کا مجموعۂ کلام ان کی وفات سے دو تین ماہ پہلے منظرِ عام پر آیا، جو ان کی شاعرانہ مہارت کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی و لکھی جاتی ہے کہ چند قادر الکلام شعراء کو چھوڑ کر باقی شعراء دیوبند کو آپ ہی کی ذات سے متاثر ہو کر اس میدان میں قسمت آزمائی کا حوصلہ ملا۔ ایسے قادر الکلام شاعر کا اپنے کو چھپائے رکھنے کا عالم یہ تھا کہ اپنا مجموعۂ کلام شائع کرنے پر کسی صورت تیار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے احقر راقم الحروف کے مشفق ومحسن استاذ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب مدظلہم کو، جن کے شدید اور پیہم اصرار پر آپ بہ مشکلِ تمام اس کے لیے آمادہ ہوئے اور ''شناسا'' کے نام سے ان کا کلام منظرِ عام پر آسکا۔

ان کا ایک قابلِ ذکر وصف یہ بھی تھا کہ دارالافتاء کی متعدد ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اور بھی ہر طرح کی دینی وملی خدمات کے لیے اپنے کو وقف کیے رکھا اور ہر کام وہ بروقت اور بہ عجلت کرنے کے عادی تھے۔ کسی بھی کام کو آئندہ وقت پر محمول ومعلق کرنے کا کوئی مطلب نہ تھا۔ خاندانِ عزیز چوں کہ مفتی عزیز الرحمٰن کی بے نفسی اور ان کی منکسر المزاج شخصیت کی وجہ سے ہر دور میں مرجعِ عوام وخواص رہا ہے اور ہر وارد وصادر کی ضروریات یہاں سے پوری کی جاتی رہی ہیں؛ اس لیے والدِ ماجدؒ کے انتقال کے بعد وہ تمام ذمہ داریاں مفتی نشاط عثمانیؒ کی طرف منتقل ہوئیں، جن کو انہوں نے بہ احسن وجوہ انجام دیا اور عدیم الفرصتی کا شکوہ اس بندۂ خدا کی زبان پر کبھی بھی نہیں آسکا۔

مفتی نشاط عثمانیؒ کے یومیہ مشاغل پر حضرت الاستاذ مولانا نسیم اختر شاہ صاحب نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''ان کے دروازے پر کوئی رخصتی کے لیے کھڑا ہے، اس کو رخصتی لکھ کر دی جا رہی ہے، کسی کا سہرے کے لیے تقاضہ ہے اور وہ بامراد لوٹ رہا ہے، کوئی غزل کی فرمائش لیے آ رہا ہے، مایوسی اس کے حصہ میں نہیں آئے گی، کسی نے مرثیہ کے لیے درخواست دے دی، تو محروم وہ بھی نہیں لوٹا، کوئی تعویذ کا طالب ہے اور کوئی پانی پر دم کرانے کے لیے جا دھمکا، کوئی اپنے بچے کا ہاتھ پکڑے دعا کے لیے آ رہا ہے، کسی نے اپنی بچی کا نکاح پڑھانے کی درخواست کی، مفتی صاحب نے نکاح پڑھایا اور یہ جا وہ جا۔ کوئی اپنے مرحوم عزیز کی نمازِ جنازہ پڑھانے کی غرض لے کر پہنچا، مفتی صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر اپنے معمولات میں مشغول، سب کی ضرورتوں کی تکمیل، سب کے ساتھ حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کا معاملہ، نہ ناگواری، نہ وحشت، نہ گھبراہٹ، نہ عدیم الفرصت ہونے کی داستان اور نہ تصنع و بناوٹ، سادگی انتہائی سادگی، مسجد کی امامت، ہر نماز میں بہ حیثیت امام موجود، تمام مصروفیتوں کے ساتھ ان کے لکھنے پڑھنے اور شعر گوئی کا قابلِ رشک سلسلہ بھی جاری، تمام تر امور اور فرائض کی انجام دہی کے باوجود ان کی فکری صلاحیتیں تازہ اور جوان، نہ اضمحلال، نہ تھکاوٹ، رخصتی، سہرے، نظم، غزل، مرثیہ ہر جگہ شعریت موجود''۔

(بہ حوالہ جانے پہچانے لوگ صفحہ ۱۱۷-۱۱۸)

مولانا ندیم الواجدی صاحب مد ظلہم کی فرمائش پر انہوں نے ترجمانِ دیوبند کے لیے اپنے دادا مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کی حیات و خدمات پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ان کی زندگی کی غالباً آخری تحریر تھی۔ یہ مضمون مفتی صاحب مد ظلہم کی کتاب ''حیاتِ عزیز'' میں شامل ہے۔

ان کے قلم سے نکلنے والے فتاوی ہزاروں کی تعداد میں ہیں، ان کے انتقال کے بعد ایک دفعہ کسی جلسے میں شرکت کے موقع سے مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ مرتب فتاوی دار العلوم دیو بند نے مفتی فضیل الرحمٰن صاحب مد ظلہم سے یہ بات کہی تھی کہ مفتی کفیل الرحمٰن صاحبؒ کا فقہ وفتاوی کی بابت تجربہ اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ ہم لوگ اہم اور دقیق مسائل میں ان سے مشورے حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ وقیع علمی خزینہ دار الافتاء کے نقولِ فتاوی کے رجسٹروں میں محفوظ ہے۔ احقر نے ان فتاوی کو چھاپنے کے سلسلے میں ایک دفعہ گفتگو کی، تو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب مد ظلہم تو خود بھی ایک زمانے سے یہ تمنا دل میں لیے ہوئے ہیں۔ مفتی صاحبؒ کے باتوفیق اخلاف سے امید ہے کہ وہ جلد ہی یہ کام بھی کریں گے۔ ان شاء اللہ

۳۱ ر جولائی ۲۰۰۶ء پیر کا دن اس حیاتِ فانی کا ان کا آخری دن ثابت ہوا، جس میں صبح دس بجے کے قریب وہ معمولی سی علالت کے بعد اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔

حافظ حفیظ الرحمٰن مسرت عثمانی

حافظ صاحب نے ابتدا میں والدِ ماجد مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ اور دیو بند کے دیگر اساتذہ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ بعدہ جین کالج سہارنپور سے ایم اے کیا۔ بڑے ذہین و ذکی اور ملنسار و متواضع انسان ہیں۔ فراغت کے بعد سے ہی کتابوں کی خرید وفروخت کے پیشے سے وابستہ ہیں اور الحمد للہ ایک دین دارانہ وخوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔

مولانا دلیل الرحمٰن انجم عثمانی

دار العلوم دیو بند سے فارغ التحصیل عالم ہیں اور ان کا حلقۂ تعارف ہندوستان بھر

میں پھیلا ہوا ہے، مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ''شب آشنا''، ''سفر در سفر''، ''ٹھہرے ہوئے لوگ'' اور '' کچھ کھو گیا ہے'' یہ وہ افسانوی مجموعے ہیں، جنھوں نے ان کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ بہ طور ملازمت ایک طویل عرصے تک دوردرشن سے وابستہ رہے، جس سے ابھی چند سال پہلے ریٹائرڈ ہوئے۔ اپنے پیشے سے متعلق دو ایسی لا جواب کتابیں لکھیں، جو جی این یو اور دیگر یونیورسٹیوں کے ماس کمیونیکشن کے نصاب میں شامل ہیں۔

مولانا انجم صاحب کو دراصل لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا، وہ جب دارالعلوم میں طالب علم تھے، اسی دور میں ماہنامہ مشرب دیوبند، ماہنامہ تجلی دیوبند اور دیوبند ٹائمز میں ان کی بیش قیمت تحریریں شائع ہونے لگی تھیں۔

مولانا کا تعلیمی سفر دارالعلوم سے شروع ہوکر دہلی یونیورسٹی پر منتہی ہوا تھا، جہاں انہوں نے تایا مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی ترغیب وتحریک پر ایم اے کیا اور امتیازی پوزیشن کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

حافظ قمر الاسلام نجمی عثمانی

حافظ صاحب مد ظلہم پچھلے پچیس تیس سالوں سے دارالعلوم دیوبند میں دفتری خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہیں اور اپنے کام کو پورے اخلاص اور انہماک کے ساتھ انجام دیتے آئے ہیں۔ اللہ انھیں اپنے والدِ ماجد مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ کی طرح تا دمِ واپسیں دارالعلوم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا سہیل الرحمٰن عزیز عثمانی صاحب

مولانا سہیل الرحمٰن صاحب مد ظلہم دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ دینیات کے استاذ ہیں۔ دارالعلوم میں ان کی یہ خدمتِ تدریس ایک محتاط اندازے کے مطابق پچیس

سالہ عرصے پر مشتمل ہے۔ ماشاء اللہ بڑے خلیق وملنسار انسان ہیں اور خاموشی کے ساتھ مفوضہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مولانا اسامہ عزیز عثمانی صاحب

دارالعلوم وقف دیوبند کے کامیاب سابق اساتذہ میں آپ کا شمار ہے، تدریس کے ساتھ ساتھ مسجدِ عزیز میں امامت کا فریضہ بھی آپ ہی انجام دے رہے ہیں۔ مولانا مدظلہم کے صاحبزادے برادرِ عزیز مولانا انور عثمانی جو ابھی چند سال پہلے فارغ التحصیل ہوئے، حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور ایک آدھ کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ امید ہے مولانا اسامہ عزیز کے صاحبزادۂ گرامی مستقبل میں خاندانِ عزیز کے نام وکام اور اس کی اعلیٰ روایات کو باقی رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ ان شاء اللہ

صبیحہ سلطانہ عرف مہ جبیں زوجہ جناب محمد فاروق صدیقیؒ

مفتی صاحب مدظلہم کی دو بہنوں میں یہ بڑی بہن تھیں اور بھائیوں میں حافظ حفیظ الرحمٰن مسرت عثمانی سے چھوٹی اور باقی چار بھائیوں سے بڑی تھیں۔ دینی تعلیم اپنے والدین اور نانی کے توسط سے گھر پر ہی حاصل کی۔ بڑی ہونے کے ناتے امورِ خانہ داری میں والدہ کو ان کا تعاون حاصل رہا۔ ان کا نکاح جناب فاروق صدیقی صاحب کے ساتھ ہوا تھا، جو ادارہ فیصل انٹرنیشنل دیوبند کے بانی ہیں۔ لائقِ رشک دینی زندگی گزار کر میاں بیوی دونوں ہی وفات پا گئے ہیں۔ ان کی اولاد بھی الحمدُ للہ بافراغت زندگی گزار رہی ہے اور ان کا باہمی اتحاد واتفاق جو یقیناً والدین مرحومین کی مستجاب دعاؤں کا نتیجہ ہے، عام انسانوں کے لیے لائقِ تقلید چیز ہے۔

درخشاں زوجہ جناب محمد عاصم صاحب

موصوفہ مولانا اسامہ عزیز سے بڑی اور باقی سب بہن بھائیوں سے چھوٹی ہیں۔حد درجہ ملنسار وسلیقہ مند خاتون ہیں۔اپنے تمام بھائیوں سے دلی محبت رکھتی ہیں اور تمام کے احوال ومساعی سے بھی باخبر رہتی ہیں۔بھائیوں کا معاملہ بھی ابتداء ہی سے بڑا مشفقانہ وخیر خواہانہ رہا۔موصوفہ جناب محمد عاصم صاحب سے منسوب ہیں، جو شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے حقیقی ماموں زاد بھائی ہیں اور عرصۂ دراز سے دفترِ محاسبی دارالعلوم دیوبند میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔

صہیب صدیقی

یہ مفتی صاحب مدظلہم کی مرحومہ بہن صبیحہ سلطانہ کے بڑے صاحبزادے ہیں اور آپ کے داماد بھی ہیں۔مفتی صاحب کی صاحبزادی عظمیٰ خاتون انھیں سے منسوب ہیں۔

صہیب صدیقی شہر دیوبند کے ان خوش نصیب افراد میں سے ایک ہیں، جنھوں نے کتابوں کے معیارِ طباعت کو اونچا اٹھایا۔پہلے کتابوں کی سادہ سی جلد بندی ہوتی تھی۔صہیب صدیقی صاحب نے سب سے پہلے کتابوں کے خوبصورت ٹائٹل اور سرِ ورق پر بہت عمدہ انداز میں اس کا نام درج کرنے کا نمونہ پیش کیا، جو خوب مقبول و عام ہوا اور اب تو یہی معیارِ طباعت ملک گیر سطح پر ہر مکتبے کا جزوِ لازم سمجھا جانے لگا ہے اور سادہ جلد بندی کا دور قریب قریب رخصت ہو گیا ہے۔

شہرِ دیوبند کے معیارِ طباعت کو ملک گیر سطح پر مقبول ومتعارف کرانے میں صہیب صدیقی صاحب کی خدمات ومساعی آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔شہرِ دیوبند میں شائع شدہ کتب کے معیارِ طباعت کا ذکر جب بھی اور جہاں کہیں ہوگا، تو صہیب صاحب اس ذکر وتاریخ کا اہم اور اٹوٹ حصّہ گردانے جائیں گے۔ان شاءاللہ

صہیب صدیقی صاحب کی زندگی نشیب وفراز سے عبارت رہی ہے۔ بڑے بھائی صاحب سڑک حادثے میں شہید ہو گئے تھے، والدین کے ضعف اور اس حادثے کے بعد سے گھریلو ذمہ داریاں تنِ تنہا آپ نے انجام دیں۔ حالات بڑے ہی ناگفتہ بہ تھے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ صہیب صاحب نے بڑی حکمت ودانائی کے ساتھ ان ناموافق مالی حالات کا مقابلہ کیا۔ تمام بھائی بہنوں (حناعفت اور صبا صدیقی) نے آپ میں شفقتِ پدری کا سایہ محسوس کیا۔ یہ بات کہنا ولکھنا بہت سہل ہے، لیکن صبر آزما اور نازک ترین ایسے مواقع پر کامل جدوجہد کا مظاہرہ کرنا اور چھوٹے بہن بھائیوں کو حالات کا احساس تک نہ ہونے دینا ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں، اس کے لیے اعلیٰ درجے کی فہم وفراست اور انتہائی درجے کے لیاقت وتدبر کی ضرورت ہے، جو والدین اور دیگر خاندانی بزرگانِ دین کی دعاؤں کی برکت سے صہیب صاحب کا حصّہ بنے اور آج اللہ کے فضل سے ملک بھر میں عزت ووقار کے ساتھ ان کی شخصیت متعارف ہے۔

امانت ودیانت اور اپنوں وبیگانوں کے کام آنے ایسے اوصاف کی بہ دولت ان کا معمولی سا کاروبار ترقی کی نت نئی منزلیں طے کرتا رہا اور آج ان کے والد ماجد جناب محمد فاروق صدیقی صاحبؒ کا قائم فرمودہ مکتبہ فیصل انٹرنیشنل، دیوبند کے علاوہ دریا گنج نزد جامع مسجد دہلی اور لکھنؤ میں بھی قائم ہو چکا ہے اور آپ کی اور آپ کے برادران گرامی نوید صدیقی اور کمال صدیقی کی مخلصانہ کاوشوں کی بہ دولت مختلف و متنوع علمی ودینی موضوعات پر مشتمل اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی نادر ونایاب کتابیں قارئین کے ہاتھ لگ رہی ہیں۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء**

مفتی صاحب مدظلہم کی تقریباً تمام کتابیں صہیب صدیقی صاحب ہی کے زیرِ اہتمام مکتبہ فیصل انٹرنیشنل سے چھپتی رہی ہیں اور آپ کی تقریباً تمام تالیفات وتصنیفات اس مکتبے پر دستیاب ہیں۔

طارق عمیر عثمانی

طارق صاحب کم سنی ہی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ مالیر کوٹلہ منتقل ہو گئے تھے۔ دینی وعصری تعلیم مالیر کوٹلہ میں ہی حاصل کی۔ کچھ وقت تک رامپور کالج میں بھی زیر تعلیم رہے تھے، پچھلے کئی سالوں سے دارالسلام سینٹر کے نگراں ونتظم ہیں۔ اردو وہندی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی موصوف کو اچھی خاصی دسترس حاصل ہے، مفتی ہلال صاحب مدظلہم کو بعض کتابوں کی تالیف کے دوران انگریزی مآخذ سے مراجعت کی ضرورت درپیش ہوئی، تو ایسے مواقع پر طارق عمیر عثمانی صاحب نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

الحاج شمشاد علی صاحب

موصوف شہر مالیر کوٹلہ کے باشندے ہیں، علماء سے دلی محبت رکھنے والے احبابِ شہر میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کے ساتھ شمشاد صاحب کا تعلق ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم نے زمانۂ صحت میں راقم سے دورانِ گفتگو چند ایک بار الحاج شمشاد صاحب کا ذکر کیا تھا۔ جنوری ۲۰۱۹ عیسوی میں جب مفتی ہلال صاحب مدظلہم سخت ترین علالت کے دور سے گزر رہے تھے اور بہ غرضِ علاج ایک ہفتے کے قریب حلیمہ اسپتال مالیر کوٹلہ میں داخل رہے تھے، اس زمانے میں میری شمشاد صاحب سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ماشاء اللہ بڑے ملنسار انسان ہیں اور مفتی صاحب کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، ملکی وغیر ملکی اسفار میں بھی آپ کو مفتی صاحب مدظلہم کی رفاقت وخدمت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

الحاج مستری جمیل صاحب مالیر کوٹلہ

شہر مالیر کوٹلہ کے محسن علما افراد میں ایک اہم نام مستری جمیل احمد صاحب کا بھی ہے۔ نانا مرحوم مولانا قاری محمد ہاشم صاحب اور دیگر اکابر علما سے آپ کے دیرینہ مخلصانہ تعلقات رہے ہیں، مفتی ہلال صاحب کے حوالے سے ان سے سنی ہوئی چند باتوں سے اس کتاب کی ترتیب وتالیف کے دوران فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس احسان کے عوض راقم الحروف تہہِ دل سے ان کا شکر گزار ہے۔

اللہ تعالیٰ انھیں اس کی بہتر سے بہتر جزا دارین میں عطا فرمائے اور ان کے کاروبار میں خیر وبرکت کے فیصلے مقدر فرمائے۔

مفتی عبدالملک قاسمی مظفرنگری (امام وخطیب بن والی مسجد)

صوبۂ یوپی کے جن علما وخدام دین نے مالیر کوٹلہ کو اپنا مسکن بنایا اور جن کے ذریعے عوام الناس کو دین کی درست رہنمائی کے مواقع فراہم ہوئے، ایسے باتوفیق احباب میں ایک اہم نام برادر عزیز مفتی عبدالملک قاسمی کے والد ماجد جناب قاری محمد یامین صاحب کا بھی ہے۔ قاری صاحب مدظلہم ۱۹۸۳ عیسوی میں مالیر کوٹلہ تشریف لائے اور چونتیس پینتیس سالہ اس قیام میں خلوص وللّٰہیت اور خاموشی کے ساتھ یہاں کے مکینوں کی دینی خدمت کے لیے وقف رہے اور جس کا سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔

قاری صاحب ایک منکسر المزاج، کریم النفس اور فیاض وفراخ دل انسان ہیں۔ راقم الحروف کو ان سے بارہا ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ احقر نے ہر مرتبہ ان کی ذات میں شفقتِ پدری کا سایہ محسوس کیا۔

قاری صاحب کی اولاد میں برادر عزیز مفتی عبدالملک قاسمی سب سے بڑے

ہیں۔۱۹۹۰عیسوی موصوف کا سنِ ولادت ہے۔تعلیمی مراحل جامعہ تعلیم الاسلام کاٹکہ ضلع مظفر نگر، جامعہ اختر العلوم جلال آباد ضلع بجنور، دارالعلوم زکریا دیوبند اور از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں طے کیے۔

۲۰۱۳عیسوی میں دارالعلوم سے فراغت پائی اور فراغت کے بعد سے ہی مسجد بن والی مالیر کوٹلہ میں امامت وخطابت کے منصب پر فائز ہیں اور ساتھ ہی مدرسہ نورالعلم میں تدریسی خدمت کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔اس ادارے کا نام مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کا تجویز فرمودہ ہے۔جامعہ ہٰذا کا انتظام وانصرام برادرِعزیز ہی سے متعلق ہے۔

یہ مسجد اس شہر کی سب سے پہلی اور قدیم مسجد بتائی جاتی ہے اور مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہم کی روایت کے مطابق کسی زمانے میں شیخ شرف الدین سعدی شیرازیؒ کا دوران سفر اس مسجد میں قیام ہوا ہے۔

جامعہ ہٰذا میں فی الوقت حفظ وناظرہ، دینیات اور پرائمری تک کی تعلیم کا معقول نظم ہے اور یہ برادرِعزیز کی تدریسی مہارت وصلاحیت ہی کا نتیجہ ہے کہ مدرسہ نورالعلم میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد روز افزوں ہے۔

مفتی عبدالملک قاسمی فکرِ صحیح کے حامل ایک صالح نوجوان ہیں۔مفتی ہلال عثمانی مدظلہم کے قریبی اشخاص وافراد اور ان کے علمی معاونین میں موصوف محترم کا شمار ہے۔منتخب فتاویٰ، منتخب فتاویٰ جدید، بیاناتِ عثمانی، دین سیکھیے، جمعہ کی تقریریں اور خطبات ومقالاتِ عثمانی، یہ مفتی صاحب مدظلہم کی وہ کتابیں ہیں جن کی ترتیب وتزئین کا کام موصوف محترم ہی کا نصیبہ بنا۔

اللہ ان کی دینی خدمات کو شرفِ قبول بخشے اور ان کے علم وعمل اور عمر میں برکت مقدر فرمائے۔

اجازت وخلافت

جامعہ اسلامیہ مدینۃ الرسول ﷺ کے زمانۂ قیام میں آپ کا بعد العصر مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ کے یہاں مستقل حاضری کا معمول تھا۔اسی زمانے میں آپ نے ایک دفعہ مولانا بدرِ عالم صاحبؒ سے خود انھی کے ہاتھ پر بیعت ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔مولانا بدر عالم صاحبؒ نے بیعت کرنے کے بجائے یہ فرمایا کہ تمہارا قلبی میلان جس شخصیت کی طرف زیادہ ہو،اس سے بیعت ہو جایئے ،زیادہ فائدہ ہوگا۔یہ بھی بہ طور خاص دریافت فرمایا کہ تمہارا دلی رجحان کن کی طرف ہے؟مفتی صاحب مدظلہم نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام لیا۔

مفتی صاحب مدظلہم کو اوائل عمر ہی سے خانوادہ قاسمیہ کے ساتھ عقیدت کی حد تک تعلق رہا ہے اور یہ امر کوئی خلافِ توقع نہ تھا کہ خاندانِ طیب وعزیز کا باہمی ربط و تعلق اس وقت سے قائم ہے،جب دار العلوم دیوبند کی تاسیس عمل میں آئی تھی۔آپ کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ بالکل بچپن میں وقت بے وقت حکیم الاسلامؒ کے گھر چلے جایا کرتے تھے اور حکیم الاسلام بھی دادا مرحوم کی نسبت سے، جو ان کے استاذ محترم تھے، ہمارے ساتھ بڑی شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔بارہا ایسا ہوا کہ ہم بعد مغرب حضرت کے حجرے میں پہنچے تو آپ کو اوابین کی نماز میں قدرے بلند آواز کے ساتھ قرآن پڑھتے ہوئے پایا اور چپکے سے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہوگئے۔

حکیم الاسلامؒ نے اپنے ایک خطاب میں ہر روز اوابین میں ایک پارے کی تلاوت کا واقعہ ذکر فرمایا ہے، جو بڑا ہی سبق آموز ہے۔یہ واقعہ خطباتِ حکیم الاسلام میں شائع شدہ ہے۔

حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''میرے والدِ ماجد نے وفات سے تقریباً پندرہ بیس دن قبل مجھے دارالعلوم دیوبند کے دارالمشورہ میں خلوت میں طلب فرمایا، میں حسب الحکم حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی غیر معمولی طور پر آبدیدہ ہوگئے، حتّٰی کہ وفورِ گریہ کی وجہ سے چند منٹ تک بات بھی نہ کرسکے۔ مجھے یہ پریشانی ہوئی کہ کہیں مجھ سے تو کوئی ناگواری پیش نہیں آئی۔

میں نے اس کا ذکر کیا تو فرمایا نہیں؛ بلکہ مجھے یہ کہنا ہے کہ میرا وقت قریب آگیا ہے اور بہت تھوڑا وقفہ باقی رہ گیا ہے، مجھے اس وقت یہ واقعہ سنانا ہے کہ جب میں قرآن کا حافظ ہوچکا، تو حضرت والد ماجدؒ بے حد مسرور تھے۔ ختم قرآن کی خوشی میں شہر کے عمائد اور اعزہ واحباب کے ایک بڑے مجمع کی لمبی چوڑی دعوت کی، تقریب سے فارغ ہوکر مجھے خلوت میں اسی طرح طلب کرکے فرمایا: میاں احمد خدا کا شکر ہے کہ تم حافظ ہوگئے۔ وقت آئے گا تم عالم بھی ہوگے، تمہاری عزت بھی ہوگی، ملک میں تمہاری شہرت بھی ہوگی اور تمہیں دولت بھی میسر آئے گی؛ لیکن یہ سب چیزیں تمہارے لیے ہوں گی۔ ''قرآن میں نے تمہیں اپنے لیے حفظ کرایا ہے، مجھے فراموش نہ کرنا''۔ فرمایا کہ وہ وقت ہے اور آج کا دن ہے، میرا یہ دوامی عمل ہے کہ میں ہمیشہ دو پارے یومیہ حضرت قبلہ والد صاحبؒ کو ایصالِ ثواب کی نیت سے پڑھتا ہوں، جو الحمدُ للہ آج تک ناغہ نہیں ہوئے۔

یہ واقعہ سنا کر مجھ سے فرمایا کہ طیب: الحمدُ للہ تم حافظ و عالم ہوچکے ہو، وقت آئے گا تمہاری عزت بھی ہوگی، شہرت بھی ہوگی اور حق تعالیٰ تمہیں دولت بھی بہت کچھ عطا فرمائے گا؛ لیکن یہ سب کچھ تمہارے لیے ہوگا۔ یہ قرآن میں نے تمہیں اپنے لیے حفظ کرایا ہے، مجھے فراموش مت کرنا،

چناں چہ حضرت قبلہ والد صاحب کی وفات کے بعد آنے والے مہینے کی پہلی ہی تاریخ سے میں نے حضرت کی نصیحت؛ بلکہ وصیت کے مطابق مغرب کے بعد اوابین میں ایک پارہ یومیہ پڑھنے اور حضرت مرحوم کو ایصالِ ثواب کرنے کا معمول بنالیا ہے، جو الحمدللہ آج تک جاری ہے''۔

یہ مبارک عمل الحمدللہ نسل در نسل جاری ہے۔ جانشینِ حکیم الاسلامؒ حضرت خطیب الاسلامؒ بھی بعد نمازِ فجر تلاوتِ قرآن اہتمام سے فرماتے تھے اور آپ کے مسترشدِ خاص ومنظورِ نظر مفتی ہلال صاحب کے یہاں بھی طویل و مسلسل تصنیفی انہماک کے باوصف تلاوتِ قرآن کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔

ذکر چل رہا تھا مدینۃ الرسول ﷺ میں مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ اور مفتی ہلال عثمانی مد ظلہم کی بیعت سے متعلق ہونے والی گفتگو کا۔ مفتی صاحب کی زبانی حکیم الاسلامؒ کا نام سن کر مولانا میرٹھیؒ فرمانے لگے کہ میرا بھی یہی خیال تھا کہ تمہیں شاید حضرت قاری صاحبؒ ہی کی ذات سے زیادہ مناسبت ہے، پھر حکیم الاسلامؒ سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا۔

ہندوستان آمد کے بعد اس مشورے پر عمل کیا گیا۔ مفتی صاحب مد ظلہم کی علمی و تصنیفی مصروفیات کے پیشِ نظر حکیم الاسلامؒ نے بہت مختصر وظائف تلقین فرمائے اور جن چند اوراد و وظائف پر مفتی صاحب پہلے سے عامل تھے، انھیں باقی رکھا گیا۔

پہلے سے آپ کے یہ چند معمولات تھے:

(۱) فجر کے بعد تلاوتِ قرآن

(۲) شجرہ نقشبندیہ۔ جس کی اجازت آپ کو اپنے والد ماجدؒ کی جانب سے حاصل تھی

(۳) الحزب الاعظم۔ یومیہ ایک مرتبہ اسے پڑھنے کا معمول رہا

(۴) یا اللہ یا رحمن یا رحیم کی ایک تسبیح

(۵) اھدنا الصراط المستقیم ایک تسبیح

مؤخر الذکر دونوں تسبیحات اصلاً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے معمولات سے ہیں۔حضرت نانوتویؒ اپنے مریدین کو یہ دو تسبیحات بہ طورِ خاص تلقین فرماتے تھے۔اس سلسلے کا حضرت نانوتویؒ کا ایک بڑا دل چسپ و یادگاری خط مولانا عبدالقدوس رومیؒ نے اپنی حیات میں آئینہ مظاہر علوم میں بہ غرضِ اشاعت سہار نپور ارسال فرمایا اور منتظمین جامعہ مظاہر علوم نے بھی حد درجہ اہتمام کے ساتھ آئینہ مظاہر کی کسی اشاعت میں اسے شائع فرمایا تھا۔اصل خط تو دیکھنے کی سعادت تا دمِ تحریر حاصل نہیں ہو سکی ہے؛ تاہم اس کا مرکزی مضمون جسے مفتی صاحب سے ہی چند ایک دفعہ سنا، یہ تھا کہ آپ کے ہم عمر کسی بے تکلف دوست نے آپ سے بیعت ہونے کی درخواست کر ڈالی تھی۔جس کے جواب میں آپ نے یہ مکتوب لکھا جس میں اول تو فرمایا کہ جس طرح بچے بچپن میں کھیلتے ہیں کہ ایک ان کا پیر بن جاتا ہے اور باقی اس کے مرید بن جاتے ہیں۔آپ نے اچھی خاصی عمر کو پہنچ کر وہی بچوں کا سا کھیل کھیلا ہے، اس طرح کی مزاحیہ گفتگو کے بعد آپ نے ان کی خواہش کی تکمیل و تعمیل فرمائی اور وہ دو تسبیحات پابندی کے ساتھ پڑھنے کی بات لکھی، جن کا اوپر ذکر ہوا۔

۱۹۷۶ء یا ۱۹۷۷ء میں حضرت حکیم الاسلامؒ مفتی صاحب مدظلہم کی دعوت پر مالیر کوٹلہ تشریف لائے اور حضرتؒ کے ہی ہاتھوں جامعہ تعمیرِ سیرت مالیر کوٹلہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔مفتی صاحب کے گھر پر آپ کا چند روز تک قیام رہا۔اسی قیام میں ایک دفعہ آپؒ نے مفتی صاحب سے ان کی جملہ سندیں طلب فرمائیں، پھر فرمانے لگے: ان پر اپنا دستخط کر دوں؟ مفتی صاحب نے عرض کیا: جیسا آپ مناسب سمجھیں۔آپؒ نے سب سندوں پر اپنے دستخط کیے اور پھر یہ بھی پوچھا کہ: مالیر کوٹلہ بھی اپنے ہی ہاتھ سے لکھ دوں؟ مفتی صاحب نے اپنا پہلا جواب دہرایا اور حکیم الاسلامؒ نے یہ بھی لکھ دیا۔

مفتی صاحب مدظلہم کے والد ماجدؒ کا معاملہ بھی یہی رہا کہ وقتاً فوقتاً مفتی صاحب

سے ان کی کوئی سند طلب فرمائی اور اس پر اپنا نام درج فرما دیا۔ یہ اس جانب اشارہ تھا کہ عوام الناس کو بیعت کر لینے اور اوراد و وظائف کی تلقین کرنے کے آپ مجاز ہیں۔ یہاں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ مفتی صاحب کے والدِ ماجد کے یہاں اخفا کا معاملہ بہت زیادہ تھا۔ انھیں قاری اسحاق صاحب میرٹھیؒ سے باقاعدہ خلافت حاصل تھی؛ مگر حینِ حیات کبھی بھی اس کا اظہار نہیں فرمایا، وفات کے بعد یہ عقدہ اس وقت کھلا، جب ان کے کتب خانے میں قاری اسحاق صاحبؒ کا وہ مکتوب ملا، جو مفتی صاحب کے والد ماجد کے نام تھا اور جس کے ذریعے انھیں اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔

بہ ہر کیف: حکیم الاسلامؒ کی وفات کے طویل عرصے بعد ابھی چند سال پہلے مفتی صاحب مدظلہم نے خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ سے تجدیدِ بیعت کی اور خطیب الاسلامؒ کے استفسار پر، مفتی صاحب نے حکیم الاسلامؒ کے ساتھ ان کا جو معاملہ رہا تھا، عرض کر دیا۔ خطیب الاسلامؒ نے فرمایا کہ ویسے تو والد صاحبؒ نے ایک طرح سے آپ کو اپنا مجاز بنا دیا تھا اور پھر خود بھی اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا اور باضابطہ ایک تحریری اجازت نامے کے ذریعے آپ کو اس کی اطلاع دی گئی۔

اجازت نامے کا مضمون یہ ہے:

اخی فی اللہ مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی زید فضلہ دیوبند

اَلسَلَامُ عَلَیْکُم وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہٗ

آپ کے علمی اور دینی ذوق وشوق کے ساتھ احقر کی نگاہ آپ کے عقائدِ صحیحہ، اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ پر بہ طورِ خاص رہی ہے۔

الحمدللہ کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو حسنِ نیت کے ساتھ خصوصیاتِ مذکورہ سے نواز کر مصلحیت کی صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے؛ اس لیے میں اطمینانِ قلبی کے تحت بہ طریقِ

اسلاف صالحین دارین میں صلاح وفلاح کی دعا کے ساتھ آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ طالبینِ بیعت کو آپ توبہ کرا دیا کریں اوران کو عقائدِ صحیحہ پر مضبوطی سے قائم رہنے اور بدعات سے بچنے کی پوری قوت اور اصرار سے ہدایات دے کر اپنے سلسلے کے اورادِ ذیل کی تلقین کردیا کریں۔ اصطلاحاً اس اجازت کو خلافت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اوراد و وظائف معمول بہا یہ ہیں۔

صبح کی تسبیحات:

(۱) تیسرا کلمہ

(۲) استغفار

(۳) درود شریف ذیل

اللهم صل علی سیدنا و مولانا محمد وعلی اله بعدد کل معلوم لك

شام کی تسبیحات:

(۱) سورۂ اخلاص

(۲) **حسبنا الله و نعم الو کیل**

(۳) آیتِ کریمہ

دعاؤں میں یاد رکھیں۔

اللهم وفقنا لما تحب و ترضی واجعل آخرتنا خیرا من الاولی وأسأل الله تعالی ان یجعلنا ناصری طریقه المستقیم وصلی الله علٰی خیر خلقه محمد و اٰله و اصحابه اجمعین۔

محمد سالم قاسمیؒ

مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

۵؍شوال المکرّم ۱۴۳۵ھ مطابق ۲؍اگست ۲۰۱۴ء بعد عصر

ایک یادگار خواب

مفتی صاحب مدظلہم عمر کی آٹھویں دہائی کو چھو رہے ہیں، علالتِ طبع کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہتا ہے، ثقلِ سماعت کا عارضہ تو کئی سال سے لاحق ہے، ادھر کچھ مدت سے بینائی اس درجہ متاثر ہے کہ کتب بینی کا سلسلہ بالکلیہ موقوف ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک روز بعد نمازِ عصر راقم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا طبیعت کافی علیل تھی، بایں ہمہ کافی دیر تک معلومات افزا گفتگو فرمائی اور اسی مجلس میں اپنا یہ خواب سنایا کہ ''میں بہ آوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھ رہا ہوں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ سامنے تشریف رکھتے ہیں، میں کلمۂ شہادت پڑھنے کے ساتھ ساتھ حضرت تھانویؒ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ گواہ رہیے کہ میرا خاتمہ بالخیر ہو رہا ہے''

خدائے کریم مفتی صاحب مدظلہم کی ہمہ جہت دینی و علمی خدمات کو قبول فرمائے اور آپ کے سایۂ عاطفت کو بایں ہمہ فیوض و برکات تا دیر سلامت رکھے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

تَمَّت

بعون الله و فضله

یارب صل و سلم دائما ابدا علی حبیبك خیر الخلقِ کلهم

الله اکبر کبیرا و الحمد لله کثیرا و سبحان الله بکرةً و اصیلا

○❖○

کمپیوٹر کتابت وسیٹنگ: انیس الرحمٰن قاسمی

اردو، عربی، انگلش، ہندی، چاروں زبانوں میں عمدہ کمپیوٹرائز کتابت، ٹائپ شدہ میٹر (مسودے یا فائل) کی کتابی سیٹنگ، **نیز کتاب کے مکمل کام**: کتابت، طباعت، جلد سازی، ٹائٹل، تزئین و آرائش وغیرہ کے لیے رابطہ کریں: ہند کے کسی بھی علاقے میں گھر بیٹھے خدمت لے سکتے ہیں، مزید تفصیلات کے لیے کال کریں

انیس الرحمٰن قاسمی (اے. آر. **کمپیوٹر سینٹر**) 09557252510
arqasmi1@gmail.com

٭مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی دام ظلہ٭

فضیل احمد ناصری

خادمِ حدیث و نائب ناظمِ تعلیمات جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند

وہ بندہ، جو ہو کوششِ مشکور میں دن رات
اوقات ہیں در اصل، اسی مرد کے اوقات

وہ بندۂ آزاد ہے آئینۂ قدرت
جس شخص کا جینا ہو اکابر کی حکایات

وہ خاکِ کمالات، جسے کہتے ہیں دیوبند
یہ ہند کی دھرتی پہ ہے اللہ کی سوغات

اک پیرِ حرم پھر سے اسی خاک سے اٹھا
ہے جس کا قلم وسعتِ افکار کی برسات

ہو عالمِ فتویٰ کہ تحاریر کی دنیا
ہیں عام بہت طائرِ لاہوت کی خدمات

تنہا ہیں، مگر کام کیا انجمنوں کا
انفاسِ فضیلی ہیں سراسر ہی کرامات

کیا عرض کروں تم سے مقاماتِ ہلالی
الفاظ ہیں کوتاہ، فزوں تر مرے جذبات

اس پیکرِ اقدس کو سمجھنا ہے تو پڑھ لے
رکھے ہیں ترے سامنے عارف کے مقالات

تحقیق کے معیار سے لاریب ہم آہنگ
ناپا ہوا ہر لفظ ہے، تولی ہوئی ہر بات

اللہ کرے اس کے مقدر میں بقا ہو
تابندہ رہیں حشر تلک اس کی عبارات

9 787860 009800 00300>
FAISAL INTERNATIONAL
2649, Kucha Chelan, Near Keekarwali Masjid
Daryaganj, New Delhi. 110002
Ph.: +91-9625523987,7017416912
e-mail: faisalexim@gmail.com, website: www.idarafaisal.com